UNIVERSAL LIBRARY
OU_188969
UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

بنام نوجوانان ہندوستان

صاحب مصنف نے اپنی بیش قیمت کتاب بنام نوجوانان انگلستان نامزد کی ہے۔ مگر میں اِس بیش بہا کتاب کے اُردو ترجمہ کو جو ہندوستان کی سب سے بڑی زبان میں کیا گیا ہے بنام نوجوانان ہندوستان نامزد کرتا ہوں۔ تاکہ وہ لائق اور روشنضمیر مصنف کی زندگی سے سبق حاصل کریں۔ اور اُسکے اولوالعزم اور عالیشان کارناموں کو مثال بنا کر اُنکی تقلید کریں۔ انگلستان کے نوجوانوں سے یہ کتاب زیادہ موزوں نسبت سے ہندوستان کے نوجوانوں کے نام سے اِس وجہ سے بھی نامزد کیجاتی ہے کہ اِس غریب ملک کے اکثر مفلس نوجوان مصنف کتاب کی ابتدائی عمر کی مفلسی اور محتاجی کو اپنی حالت کے مطابق بلکہ اُس سے بھی بدتر پائیں گے۔ اور دیکھیں گے کہ ایسی مشکلات بھی ہمت اور حوصلہ سے فتح ہو جاتی ہیں +

خاکسار

مُترجم

مترجم کا دیباچہ

پروفیسر آرمینس ویمبری کے وسط ایشیا کے سفر نامہ اور انکی ابتدائی عمر کی سرگذشت ایسی بیش قیمت کتاب کے اُردو زبان میں ترجمہ کرنے کے وجوہات کا ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ کتاب کے مطالب اور نامور مصنف کا نام کافی وجوہات اِسکے اُردو ترجمہ کی سفارش کے ہیں۔ مینے اپنے کثرت اشغال کے درمیان ترجمہ کو سلیس اور عام فہم بنانے میں کوشش کی ہے۔ اور اگر میں اِسمیں کسی حد تک کامیاب ہو جاؤں کہ یہ ترجمہ اہل ملک کی پسندیدگی حاصل کر سکے تو میری اِس محنت کی محنت کا صلہ مجھے ملگیا۔

محبوب عالم

لاہور۔ جنوری ۱۹۰۶ء

آرمینس ویمبری کا سفرنامہ

اور

سرگذشت

فصل اوّل

عہدِ طفلی

میرے والد بزرگوار نے خدا اُنہیں غریق رحمت کرے ۱۸۳۲ء میں انتقال کیا۔ اس وقت میں چند ماہ کا تھا۔ میری والدہ ماجدہ بہت غریب اور بہت ہی مفلس تھیں۔ اُنہوں نے اس خیال سے کہ شائد دوبارہ شادی کرنے سے یتیم بچوں کی پرورش ہو جائے۔ پھر شادی کر لی۔ لیکن افسوس ہے اُنکی اُمید پوری نہ ہوئی۔ ہمارا سوتیلا باپ بہت اچھا آدمی تھا۔ لیکن اُس نے بھی ہمارے لیئے

کچھ نہ کیا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد میری اور بھائی بھتیجیں آگئیں اور خرچ اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ تھا۔ اس لیئے ہمارے والدین نے سوائے اسکے اور کوئی چارہ نہ دیکھا کہ ہم میں جو بڑے تھے وہ اپنی بدولت آپ کمائیں اور چھوٹوں کی پرورش کریں۔

جب میں بارہ سال کا ہوا تو مجھے بھی یہ کہا گیا کہ میاں اب تم جوان ہوئے اب کچھ فکر معاش کرو میں ہر طرح سے تندرست اور طاقت ور لڑکا تھا۔ لیکن لنگڑا کر چلا کرتا تھا۔ اور لاٹھی کی امداد کے بغیر چل ہی نہیں سکتا تھا۔ جس وقت اماں جان نے کہا کہ اب تم جوان ہوئے کچھ کماؤ۔ اس وقت بھی میں لاٹھی کے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔ لیکن چونکہ ابتدا سے مجھے بھوک اور جاڑا برداشت کرنے کی عادت تھی۔ اس لیئے جفاکش ہو گیا تھا اور ہر طرح کی زحمت برداشت کر سکتا تھا۔

ان ایام میں ہمارا کنبہ ہنگری[1] میں رہتا تھا اور نو سال کی عمر میں میں نے مدرسہ جانا شروع کیا تھا۔ اس وقت میری عمر بارہ سال کی تھی۔ اس تین سال کے عرصہ میں میرے معلم اور اتالیق میرا حافظہ دیکھکر حیران ہو گئے۔ اور اکثر میری صفت وثنا کیا کرتے تھے۔ میری یادداشت کا یہ عالم تھا کہ لاطینی زبان کے ادق فقرے جن کو میں سمجھ بھی نہ سکتا تھا طوطے کی طرح مجھے یاد ہو جاتے تھے۔ میرا خیال یہ تھا کہ میں یا تو طبیب بنونگا۔ یا وکیل کیونکہ اس علاقہ میں ان دونوں پیشوں سے بڑھکر اور کوئی پیشہ معزز اور مقتدر نہ تھا۔

میری والدہ ماجدہ کو بھی امید تھی کہ میں ہونہار نکلوں گا۔ مگر افسوس افلاس نے انکی تمام امیدوں پر بجلی گرا دی۔ کہاں کی طبابت۔ اور کیسی وکالت۔ مجھے ایک درزی کا شاگرد بنا یا گیا۔ جس وقت مجھے اس قدر خیالی آگئی کہ

[1] علاقہ ہنگری آجکل سلطنت آسٹریا کا حصہ ہے۔ (مترجم)

میں نے دو ٹکڑے عمل کے جوڑ لیئے تو ایک دن میرے دل میں خیال آیا کہ یہ پیشہ میرے لایق نہیں۔ کسی اور جگہ قسمت آزمائی کرنی چاہیئے۔ چنانچہ میں گاؤں کے بھٹیارے کے اکلوتے بیٹے کا معلم مقرر ہوا۔ میں اپنے شاگرد کو انگریزی اور علم ہندسہ پڑھایا کرتا تھا۔ سچ پوچھو تو الف ب ت ہی میں نے شروع کرائی مگر اس پڑھانے کے علاوہ میرا کام اور بھی کچھ تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ شنبہ کی رات کو میں تمام کنبہ کی جوتیاں صاف کیا کرتا تھا۔ اور اُن پر سیاہی لگاتا تھا۔ اور کبھی کبھی پیاسے مسافروں کی خدمت میں حاضر رہکر انکو شراب پلایا کرتا تھا۔

واقعی میری عمر اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ قطع نظر اسکے مجھ پر یہ مثل صادق آتی تھی۔ ع

"کو خویشتن گم است کرا رہبری کند"

اس وقت مجھے خود تعلیم و تربیت کی بہت ضرورت تھی۔ بھلا میں معلمی کیا کر سکتا تھا۔ اس لیئے میرے شاگرد کا والد بھی مجھ سے ایسا ہی سلوک کرتا تھا کہ جو شاید ہی کسی معلم کو آجتک نصیب ہوا ہو۔

لیکن بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ نکلے۔ میرے شاگرد صاحب اپنے باپ سے بھی بڑھکر تھے۔ وہ مجھ سے دو سال بڑے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اپنے معلمی کے جوش میں مینے اسکو کسی قصور پر سرزنش کی۔ مگر اسکو یہ بات برداشت کرنے کی ہمت کہاں تھی۔ وہ بھی جوش میں آگیا۔ پہلے کو اس کا والد آگیا ورنہ اس نے مجھے تو تم کر دھر دیا ہوتا۔

میری معلمی کا زمانہ میرے لیئے سخت تکلیف کا زمانہ تھا۔ مگر قہر درویش برجان درویش میں کیا کر سکتا تھا۔ مفلسی میرے لیئے سد سکندری تھی۔ ناچار مجھے یہاں ٹھہرنا پڑا۔ اور جب میرے پاس اٹھارہ فلارن[1] جمع

[1] اٹلی کے شہر فلارنس کے نام پر یہ سکہ مشہور ہوا قیمت اسکی دو شلنگ یا تخمیناً ڈیڑھ روپیہ کے قریب ہے۔ (مترجم)

ہو گئے۔ تو میں سینٹ جارج کے ورزشی مدرسہ میں جو پرس برگ کے قریب جوار میں تھا تعلیم پانے چلا گیا۔

اس جگہ اس رقم سے جو میرے پاس تھی میں نے بمشکل پڑھائی کی کتابیں خریدیں مگر یہاں کے رحمدل لوگوں نے میری مدد کی اور میں مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ رات کا کھانا مجھے سات مختلف کنبے ہفتہ میں دیا کرتے تھے۔ یعنی ہر روز میں ایک کنبے کے ہاں رات کا کھانا کھاتا تھا۔ اور جب کھانا کھا چکتا تھا تو وہ مجھے ایک روٹی صبح کے ناشتہ کے لیئے بھی دے دیتے تھے۔ اس مدرسہ میں جو امیر طالبعلم تھے انکے اتارے ہوئے کپڑے بھی مجھے ملجاتے تھے۔ اس طرح میرا گذارہ چل جاتا۔ میں دن رات محنت میں مشغول رہتا تھا۔ کچھ تو میں محنتی اور پھر ذہین بھی تھا۔ اس لیئے جب امتحان ہوا تو میں تمام جماعت میں دوم رہا۔ میں بہت جلد لاطینی زبان فصاحت کے ساتھ بولنے لگا۔ میرے پروفیسروں نے جب یہ نمایاں قابلیت دیکھی تو مجھ پر مہربانی کرنے لگے۔ اور انکی مہربانی میرے حق میں تریاق ثابت ہوئی +

اس مدرسہ میں میں نے لاطینی جماعت کا دوسرا امتحان بھی کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔ لیکن میری طبیعت میں قرار نہ تھا مجھ سے ایک جگہ بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ اس لیئے میرے دل نے یہ چاہا کہ پرس برگ کے اعلیٰ مدرسہ میں چل کر تعلیم پانی چاہیئے۔ سینٹ جارج میں مجھے ضروریات روزمرہ کی کچھ پروا نہ تھی۔ مگر میں نے ان سب کو چھوڑا اور چودہ سال کی عمر میں پرس برگ کے شہر میں داخل ہوا۔

یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ از سر نو مجھے تلاش معاش کرنی پڑیگی اور یہ بھی مجھے معلوم ہوا کہ بڑے بڑے اونچے محلوں والوں کی ملاقات آسان بات

نہیں ہے۔ غرض جسقدر مجھے یہاں اُمید تھی اُسیقدر مایوسی ہوئی ہیں تین سال یہاں رہا۔ لیکن اِس تین سال کے عرصہ میں جو تکلیفیں میں نے اُٹھائیں وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ اِس تین سال کے عرصہ میں میرا یہ کام تھا کہ میں باورچیوں کو۔ نوکروں کے خدمتگاروں اور دوسرے لوگوں کو جو پڑھنا چاہتے تھے پڑھا کر اپنا گذارہ کرتا تھا۔ یہ شہر دریائے ڈینیوب پر واقع ہے۔ اُسکی گلیوں میں پتھر کا فرش ہے۔ لیکن اگر ہر ایک پتھر کے مُنہ میں زبان ہو تو وہ بتا سکتا ہے کہ میں نے کس قدر مصیبتیں جھیلیں۔ اور کس قدر آنسو اُنپر بہائے۔ سچ ہے میں نے بہت تکلیف اُٹھائی۔ لیکن اسے جوانی تو ہر ایک تکلیف اُٹھا سکتی ہے تو تمام مصیبتیں آسانی برداشت کرسکتی ہے۔

ہمت کے آگے فتح نزدیک ہے۔ افلاس اور زحمت فاقہ کشی سے میرے ارادوں میں فرق نہ آیا۔ میں نے دامن استقلال ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنی پڑھائی میں لگا رہا۔ اور جب پہلا امتحان ہوا تو میں اُس سکول کے بڑے لایق طالب علموں میں شمار ہونے لگا۔ جب کبھی مجھے یہ زمانہ یاد آتا ہے تو مجھے تعجب ہوتا ہے۔ کیونکہ باوجودیکہ مجھے ہر طرح کی تکلیف تھی مگر میں ہروقت خوش رہتا تھا۔ اور اِس مصیبت کا مقابلہ بخندہ پیشانی کرتا تھا۔ میری صحت بھی معمول سے بڑھکر اچھی تھی۔ اِس لیئے مجھے اِس لڑائی میں جو ناداری کے ساتھ مجھے لڑانی پڑتی تھی اکثر فتح نصیب ہوتی تھی۔

مجھے پانی اور روٹی کے سوا اور کوئی غذا نصیب نہ ہوتی تھی۔ مگر اس غذا پر میرا رنگ کندن کی طرح دمکتا تھا۔ اور اپنے مدرسہ میں میں تمسخر اور شرارت کی روح رواں تھا۔ میری جیب میں تو کوڑی نہ ہوتی تھی لیکن جب مدرسہ بند

ہوتا تھا تو میں پا پیادہ لکڑی لیکر نکل کھڑا ہوتا تھا۔ اور جدہر دل گواہی دیتا تھا لنگڑاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ اِس طرح پر میں نے وائینا۔ پریگ اور آسٹریا کے دوسرے شہروں کی سیر کی۔ میرا قاعدہ تھا کہ جب کبھی میں چلتا چلتا تھک جاتا تھا تو راہ میں گاڑیبانوں کے ساتھہ جو اتفاقیہ مل جاتے تھے جان بوجھکر اِس قسم کی گفتگو چھیڑ دیتا تھا کہ وہ خوش ہو جاتے تھے اور اکثر مجھے اپنے پاس گاڑی پر بٹھا لیتے تھے۔

سفر میں رات کے وقت میں پادریوں اور راہبوں کے ہاں شب باش ہوا کرتا تھا۔ جو لاطینی زبان میں میری گفتگو سُن کر اِس قدر خوش ہوتے تھے کہ اکثر چلنے کے وقت مجھے کچھ نقدی بھی دیا کرتے تھے اور اُن کے خدمتگاروں کے ساتھہ میں دوسرے دن کے لیئے روٹی رکھدیا کرتے تھے۔ میری شیریں کلامی خواہ مخواہ مجھے زادِ راہ مہیا کر دیتی تھی۔ سچ ہے شائستگی اور شیریں زبانی ایسا سکہ ہے۔ جو ہر ایک مُلک میں رائج ہے سچ ہے اسکو بوڑھے جوان اور بچے سب ہی پسند کرتے ہیں۔ جس کے پاس شیریں کلامی ہے۔ اُسکی تھیلی خواہ وہ کتنا ہی مفلس ہو ہر وقت بھری رہتی ہے۔ ہاں سچ ہے۔ زبان شیریں مُلک گیری۔ زبان بُری ٹُک بانکا۔

یہ سیر اُس دشت نوردی کی تیاری کے لیئے ایک مدرسہ تھا جو میری قسمت میں بعد ازاں لکھی ہوئی تھی۔ میں سیر کا اِس قدر شایق تھا کہ جب تعطیلوں کے بعد میں واپس آتا تھا تو ہمیشہ ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتا تھا اِس کے علاوہ مجھے بچپن سے شہر کی رہایش سے سخت نفرت تھی اور گانوں میں رہنا پسند کرتا تھا۔ اِسکی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ شہر میں مجھے اپنی لی

کمانے میں بہت دقت ہوتی تھی۔ جب میں تعطیلوں کے اختتام پر شہر میں واپس آتا تھا تو اونچے اونچے مکانات دیکھکر میرا دم گھبراتا تھا۔ اور صرف یہ خیال کہ پھر جب تعطیلیں آئینگی تو سیر کے لئے باہر جاؤں گا۔ مجھے اس قابل کرتا تھا کہ میں چند دن یہاں گذار لیتا تھا۔

۱۸۴۶ء میں علاوہ سکول کی پڑھائی کے میں اپنے طور پر بھی مطالعہ کیا کرتا تھا۔ میں ہمیشہ سفرنامے نہایت شوق اور ذوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اور میں نے فرانسیسی زبان بھی سیکھنی شروع کر دی تھی۔ ہنگری کی زبان میری مادری زبان تھی۔ اور جرمن زبان میں نے بچپن میں ہی سیکھ لی تھی۔ انہیں ایام میں میں سکیلونین پر بھی حاوی ہوگیا۔ سکول میں لاطینی اور یونانی زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اس لیئے میں نے یوروپ کی بڑی بڑی زبانیں بہت جلد سیکھ لیں۔ اور کئی زبانوں کے سیکھنے سے مجھے محاورات مجھے بہ آسانی آگئے۔

مجھے کسی چیز کو حفظ کرنے میں بہت خوشی حاصل ہوتی تھی۔ بچوں کی بھی عجیب عادتیں ہوتی ہیں۔ جب میں نے اس مشق کو دس لفظوں سے لیکر سو لفظوں تک پہنچا دیا تو مجھے کمال خوشی ہوئی۔ پہلے میں ہر روز دس لفظ یاد کیا کرتا تھا۔ پھر ساٹھ تک نوبت پہنچگئی۔ اور رفتہ رفتہ سو نئے الفاظ ہر روز یاد کرنے لگا۔ اللہ کی شان مجھے اُس وقت مطلق خبر نہ تھی کہ یہ بات جس پر مجھے ناز ہے آئندہ میرے بڑے کام آئے گی

جب میں فرنچ سیکھ چکا تو میں نے اپنے طور پر لاطینی زبان کی دوسری شاخیں سیکھنی شروع کیں۔ اسیطرح میں نے جرمنی کی مروجہ زبانیں سیکھیں۔ پھر میں نے انگریزی شروع کی۔ اور جب میں انگریزی

سیکھ گیا تو مینے ڈنمارک اور سویڈن کی زبانوں کو بھی نہ چھوڑا۔ میرا دستور تھا کہ میں کتاب بلند آواز سے پڑھا کرتا تھا۔ اور جو زبان سیکھا کرتا تھا اُسمیں اپنے ساتھ بلند آواز سے خود بخود گفتگو کیا کرتا تھا۔ غرض تھوڑے سے عرصہ میں مجھے ان مختلف زبانوں میں اسقدر ملکہ حاصل ہو گیا کہ مجھے اپنی قابلیت پر خود تعجب ہوا۔ بلکہ جوش جوانی میں اپنے آپ کو ایک محقق عظیم سمجھنے لگا۔

شیخی بسا اوقات ترقی کے لیئے سد راہ ہو جاتی ہے لیکن بعض اوقات نہایت فائدہ مند ہوتی ہے۔ مجھے اپنی قابلیت پر اس قدر ناز ہوا کہ مینے مدرسہ کی مروجہ طرز تعلیم کو چھوڑ کر اپنے طور پر مطالع شروع کیا۔ شاید میرے پیارے ناظرین پوچھیں کہ اس تعلیم کا مدعا کیا تھا؟ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے خود معلوم نہ تھا۔ میرا اصول یہ تھا کہ کوئی دن خالی نہ جائے۔ میں آٹھ یا دس گھنٹہ روز پڑھانے میں صرف کرتا تھا۔ اور باقی وقت مطالع میں خرچ کیا کرتا تھا۔

جب مینے مختلف زبانیں خاطر خواہ سیکھ لیں تو مجھے علم زبان کی طرف رغبت ہوئی۔ اور میں نے یوروپ کے تمام زمانہ حال و گذشتہ کے مشہور فاضل مصنفوں اور شعرا کی کتابیں پڑھیں۔ فرصت کا وقت میں اُنہیں کتابوں میں صرف کیا کرتا تھا۔ میں ہمیشہ بلند آواز سے پڑھا کرتا تھا۔ اور جب کوئی فقرہ مجھے اچھا معلوم ہوتا تھا تو حاشیہ پر اُسکی نسبت اپنے خیالات لکھ لیا کرتا تھا۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ میں کتاب بلند آواز سے پڑھا کرتا تھا

اِس کیلئے علاوہ میری ایک اَور عادت بھی تھی۔ وہ یہ تھی کہ میں ہاتھ سے مناسب حرکات بھی کرتا تھا۔ اَور حسب خیالات خود مُنہ بناتا تھا۔ اَور لفظوں پر زور دیا کرتا تھا۔ میری اِن حرکات کو دیکھکر لوگ سمجھتے تھے کہ میرے دماغ میں خلل ہے۔ ایک موقعہ پر تو اُنکو میری دیوانگی کا اِس قدر یقین ہوگیا کہ اُنہوں نے مدرسہ سے مجھے موقوف کردیا۔ مگر مجھے اِس موقوفی کی کیا پرواہ تھی جبکہ میرے دِل میں اور دماغ میں عمدہ عمدہ کتابوں کے خیالات بھرے ہوئے تھے۔ ٹیسو کی ٹکلیفیر جو اسکو یوروشلم میں پیش آئیں۔ کڈ کی جوانمردیاں اور بائرن کے بہادر مرد اور بہادر عورتیں میری آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ اِن سب سے بڑھکر مجھے ایشیائی ملکوں میں رہنے اور وہاں کے فوق البھڑک اور مکلل بہ جواہر لباس پہننے کا بڑا شوق تھا۔ گو اِسبات کا مجھے شانِ و گمان تک نہ تھا کہ میں نے ایشیا میں جانا ہے۔ اِس شوق کی ایک وجہ بھی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ میں بچپن میں الف لیلہ کی کہانیاں پڑھا کرتا تھا اور پیدائش اور تعلیم کے خیال سے نیم ایشیائی میں پہلے سے ہی تھا۔

میرا یہ خیال تھا کہ براعظم ایشیا میں انسان بہت کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ اَور فوق العادت نظارے دیکھ سکتا ہے اور چونکہ بچپن سے مجھے مصیبت جھیلنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ایشیا میں خوش قسمتی میری بلائیں لے گی۔ اور پیار سے مجھے گود میں اُٹھا لے گی۔

ایشیائی ملکوں کی سیر و سیاحت کے ارادے کو پورا کرنے کیلئے پہلے میں ایشیائی زبانیں سیکھنی چاہیں اور سب سے پہلے ترکی زبان شروع کی۔ ترکی زبان چونکہ یوروپ کی بعض زبانوں سے ملتی جلتی ہے۔ اِسلئے اُسکے سیکھنے میں مجھے

چنداں وقت نہ ہوئی۔ لیکن اُسکے لکھنے میں مجھے پہلے مشکلیں پیش آئیں۔ تمام دن میں چھڑی لیکر ریت پر حرف لکھتا رہتا تھا۔ آخرکار بڑی دقت کے بعد مجھے یہ حروف لکھنے آگئے۔ حروف کا لکھنا ہی بہت مشکل تھا جب یہ آگئے تو مینے بہت جلد ترقی کرنی شروع کی۔ مجھے ترکی زبان کی لغات کی بہت ضرورت تھی۔ لیکن لغات کی قیمت چالیس فلارن تھی۔ اور اس قیمت پر کوئی کتاب خریدنے کی مجھ میں استطاعت نہ تھی۔ ناچار مینے پہلی کتاب کا لفظی ترجمہ خریدا۔ لیکن بعد مدّت مجھے معلوم ہوا کہ یہ غلط چال ہے۔ اس لیئے پھر مینے از سرِنو کتاب شروع کی۔ اس طرح پر کئی بار مجھے ناکامیاں ہوئیں۔ مگر جب استقلال کے ساتھ عالم شباب بھی ہو تو کوئی چیز سد راہ نہیں ہو سکتی۔

بیس سال کی عمر میں میری محنت ٹھکانے لگی۔ ہو نے مینے اس قدر استعداد بہم پہنچالی کہ لغات کی مدد کے بغیر مینے ایک چھوٹی سی ترکی نظم پڑھی اور سمجھ لی۔ اُس نظم کے مضمون سے مجھے چنداں خوشی حاصل نہ ہوئی۔ لیکن اس کامیابی نے میرا حوصلہ اسقدر بڑھایا کہ مجھے مشرقی علوم سیکھنے کا آگے سے وہ چند زیادہ شوق ہو گیا۔ میری روح مشرق میں ہر روز سیر کیا کرتی تھی۔ اس لیئے ایک نہ ایک دن میرے جسم کو بھی وہاں ضرور جانا تھا۔ میری حالت کی طرف دیکھیئے ابھی تک یورپ میں مجھے روٹی کمانے کیلیئے از حد کوشش کرنی پڑتی تھی۔ میرے پاس تین کانے بھی نہ تھے۔ اور اس حالت میں مجھے مشرقی ملکوں کی سیر کا شوق چرایا تھا۔ اسمیں کلام نہیں کہ ناداری بہت سے منصوبوں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ اور باوجودیکہ مشرقی ممالک کی شان و شوکت یورپ میں میری آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔ لیکن ناداری کی وجہ سے بہت عرصہ تک مجھے اس سفر کا بیڑا اٹھانیکی جسارت نہ ہوئی۔ مگر میرا ارادہ بعینہ برف کا بڑا بھاری ٹکڑہ تھا

جس طرح کوہ ایلپس کی چوٹی سے یہ برف کے ٹکڑے جب گرنے لگتے ہیں تو پھر کسی طرح نہیں تھمتے۔ اُسیطرح میرا ارادہ بھی جب ایک دفعہ قائم ہو جاتا تھا تو پھر کسی طرح بدل نہ سکتا تھا۔ آخر کار مینے ارادہ کر ہی لیا۔ اور خوش قسمتی سے مجھے ایک مربی بھی ملگیا۔ جس کا نام بیرن جازف ایٹوواس تھا۔ یہ شخص یورپ کا ایک مشہور مصنف تھا۔ اِس نے مجھے کچھ نقدی بھی دی۔ اور پرانے کپڑے بھی دیئے۔ یہ شخص بڑا فیاض تھا گو دولتمند نہ تھا۔ اِس کے رسوخ سے میں کرایہ سے بچگیا۔ غرض میں تھیلا اُٹھاکر جو کتابوں سے پھٹا پڑتا تھا جہاز پر سوار ہوا۔ اور گیلکز کی طرف روانہ ہوا۔ گیلکز سے میرا ارادہ قسطنطنیہ یعنے استنبول جانیکا تھا۔

فصل دوم

پہلا سفر

کون بتا سکتا ہے کہ اس وقت میرے دلمیں کیا خیالات تھے۔ بائیس سال کے قریب اس وقت میری عمر تھی۔ میری جیب میں پندرہ فلارن تھے۔ اور میں ایک دور دراز ملک میں عجیب وغریب لوگوں کے درمیان جو جاہل اور وحشی تھے اور حال میں مغربی قوموں کے ساتھ میل جول کرنے لگے تھے۔ اپنی قسمت آزمائی کرنے جا رہا تھا۔ میرے دلمیں واقعی عجیب خیالات تھے۔ اور ان خیالات میں خوف۔ امید۔ تعجب۔ اور فکر ملا ہوا تھا۔ جب میں جہاز پر سوار ہونے لگا تو تن تنہا تھا۔ کوئی دوست میرے ساتھ نہ تھا۔ جو وقت رخصت گرمجوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کرتا۔ میری والدہ تک اُس وقت موجود نہ تھی کہ میرا منہ چوم کر کہتی کہ بیٹا جاؤ تمکو خدا کو سونپا۔

اس بیکسی اور تنہائی کے باعث میری طبیعت بیشک بیقرار تھی۔ لیکن یہ بیقراری جہاز کے دروازہ تک رہی۔ اور جب میں نے جہاز میں سوار ہو کر مختلف زبانوں میں جو مینے سیکھی ہوئی تھیں مگر ابھی تک استعمال نہیں کی تھیں لوگوں سے گفتگو شروع کی تو تمام اضطراب اور قلق رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا۔ میری طبیعت بہت جلد آراستہ ہو گئی۔

اہل جہاز میری ہفت زبانی کو دیکھکر بہت متعجب ہوئے اور میری تعریفیں کرنے لگے۔ بلکہ ہر وقت مجھے گھیرے رہتے تھے۔ اور جب میں نے اُن کو کہا کہ آجتک میں نے کبھی سفر نہیں کیا تو انکو بڑی مشکل سے اعتبار آیا۔

اِن لوگوں کی صحبت میں مجھے بہت لطف آیا۔ اور اُن کی مہربانی اور نیک رائے سے جو انکی میری نسبت تھی میں نے فایدہ اُٹھایا۔ یعنے جب کھانے کا وقت آیا۔ اور گھنٹہ بجا تو میں دانستہ تختہ جہاز پر رہا اور جان بوجھ کر بُرا سا مُنہ بنا لیا۔ اِس پر چند پُرجوش مسافر مجھے کھانے کے کمرہ میں نہ دیکھ کر میرے پاس آئے مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے اور مجھ بیچارے نامجربہ روزگار کو اپنے خرچ سے کھانا کھلایا۔

جب کبھی اِن نیک دل میزبانوں کو میں یاد نہیں رہتا تھا تو میں باورچی خانہ میں چلا جاتا تھا۔ اور باورچی کو چند فقرے پیٹرارکہ کے سنا دیتا۔ جس سے وہ اِس قدر خوش ہوتا تھا کہ مجھے پیٹ بھر کر کھانا ملجاتا تھا۔ باورچی کے ہاتھ سے رکابی لے کر میں کہا کرتا تھا۔ "جناب عالی! میں آپ کا بہت ممنون احسان ہوں"۔ اِسکے معنے یہ ہوا کرتے تھے کہ شام کو پھر حاضر خدمت عالی ہونگا۔ یہ فقرہ سُن کر باورچی جو اٹلی (اطالیہ) کا باشندہ تھا۔ مُسکرایا کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا۔ "جس وقت چاہو آؤ"۔ یہ جواب سُن کر میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جاتی تھی۔ اور میں کہا کرتا تھا کہ شکر ہے کہ میں نے تخم زباندانی بنجر زمین میں نہیں بویا۔

جہاز پر میری زباندانی۔ زندہ دلی اور شیریں کلامی میرے بہت کام آئی۔ اگر میرے پاس یہ چیزیں نہ ہوتیں تو میرا خدا ہی حافظ تھا۔

ان چیزوں نے مجھے بچا لیا۔ اور میں مع الخیر گیلیکز میں پہنچا۔ گیلگز اب تک ایک غلیظ اور خراب مقام ہے۔ ان ایام میں تو بہت ہی غلیظ اور خراب تھا۔ دوران سفر میں دن رات مجھے ترکوں اور ترکی شہروں کا خیال رہا کرتا تھا۔ جب کبھی میں کسی ترک کو دستار یا مذہبی لمبی ڈاڑھی کے ساتھ دیکھتا تھا۔ تو میرے دل میں عجیب طرح کے خیالات پیدا ہو جاتے تھے۔ اور اس شخص کی صورت مجھے بجائے خود ایک کتاب معلوم ہوتی تھی۔ جس کا مطالعہ میں اپنے لیئے نہایت ضروری سمجھتا تھا۔

جب غروب آفتاب کے وقت مسلمان مسافر نماز پڑھتے تھے تو رکوع وسجود کو میں نہایت متعجب ہو کر دیکھا کرتا تھا۔ ان کی آیات قرآن جس کو وہ نمازی خود مطلق نہ سمجھ سکتے تھے۔ پڑھتے سنا کرتا تھا۔ اور جب تک وہ نماز سے فارغ نہ ہولیں میں دم بخود کھڑا رہتا تھا۔

میرا اس توجہ کے ساتھ رکوع اور سجود کو دیکھنا متعصب مسلمانوں کو اچھا معلوم ہوا۔ ان ایام میں بہت سے لوگ ہنگری سے آکر یہاں پناہ گزین تھے۔ اور افواہ تھی کہ بہت سے لوگ یہاں کے جو عیسائی تھے مسلمان ہو گئے ہیں۔ اور بعض تو یہ کہتے تھے کہ یہاں کے تمام باشندے مذہب اسلام قبول کرلیں گے۔ اس لیئے اگر کوئی مسلمان کسی باشندہ مجارستان سے ملتا تھا تو اس سے اس خیال سے کہ یہ ایمان لانے والا ہے نہایت اخلاص سے پیش آتا تھا۔ سہ

میرے خیال میں اسی لیئے میری بہت خاطر تواضع ہوئی۔ لیکن ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ اور مسلمان مجھ سے تواضع کے ساتھ اس لیئے پیش آتے ہوں کہ ان ایام میں تمام سلطنت عثمانیہ میں ان لوگوں

سہ ہنگری کو مجارستان اور آسٹریا کو نمسہ کہتے ہیں اور اسی لیئے اہل مجارستان مجارلی کہلاتے ہیں۔ ۱۲

سے جن کو روسیوں نے شکست دی تھی کمال درجہ کی ہمدردی کیجاتی تھی۔ بہرحال جملہ حالات اس قسم کے تھے کہ ان سے نہ صرف راہ میں بلکہ بلادِ عثمانیہ میں بھی مجھے بہت فائدہ پہنچا۔

شوق مجھے کشاں کشاں نیم ایشیائی ترکوں کی طرف لے گیا جو میرے ساتھ ہمسفر تھے اور اُنہوں نے مجھے مشرقی دُنیا میں داخل کیا۔ ان لوگوں کی صحبت سے مجھے ترکی زبان ایسی اچھی بولنی آ گئی۔ کہ گیلاکز میں اپنے ایک اہلِ وطن کو میں نے ترجمان بنکر مدد دی۔ جس جہاز میں سوار ہو کر میں گیلاکز سے قسطنطنیہ گیا۔ اُس پر زیادہ مسلمان مسافر تھے۔ اس جہاز پر مجھے تختہ پر جگہ ملی تھی۔ کیا کروں ناچاری تھی۔ میں نے اُس جگہ کا بھی نصف ہی کرایہ ادا کیا تھا۔ میں نے اپنا بدنما تھیلا اُن ترکوں کے اسباب کے قریب رکھدیا جو سب علیحدہ بیٹھے تھے اور جن میں اکثر حج کے لیئے جا رہے تھے۔ میں جہاز پر بیٹھا ہوا بےصبری کے عالم میں اِدہر اُدہر دیکھ رہا تھا کہ گویا مجھے غایت درجہ کا اشتیاق اس سمندر کے دیکھنے کا تھا۔ جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

جس شخص نے بائرن کی کتابوں میں سمندر کے حالات پڑھے ہیں وہ بتا سکتا ہے کہ سمندر کی لہروں کو دیکھ کر جو اکثر آسمان کی خبر لاتی ہیں دلمیں کیسے کیسے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔

اس جہاز میں کئی ایسے مسافر تھے جو دریائی مرض سے بیمار تھے۔ اور اس وقت کراہ رہے تھے۔ مگر میں سمندر کے حیرت انگیز نظارہ میں اس قدر محو تھا کہ مجھے اُنکی بھی کچھ پرواہ نہ تھی۔

جہاز میں میں بالکل تندرست رہا۔ اور کسی طرح کی بیماری مجھے نہ ہوئی بلکہ جہاز میں میری بھوک آگے سے زیادہ ہوگئی۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ اس لیئے جہاز پر مجھے بہت جاڑا لگنے لگا۔ ایک ترک نے رحم کرکے مجھے ایک کمبل دیدیا۔ مگر اس میں بھی مجھے سردی لگتی تھی۔ جب رات ہوئی اور آسمان پر ستارے جھلملانے لگے تو میں بڑی دیر تک وہ فرحت بخش نظارہ دیکھتا رہا۔ آخر کمبل اوڑھ کر سو گیا۔

آدھی رات کے وقت بجلی کی چمک رعد کی گرج اور بارش کے چھینٹوں سے میری آنکھ دفعتاً کھُل گئی۔ تمام دن میں دعائیں مانگتا رہا تھا کہ طوفان آئے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ طوفان میں جہاز کی کیا حالت ہوتی ہے۔ آخرکار طوفان آہی گیا۔

جہاز پر اُس وقت عجیب لطف تھا۔ بڑے بڑے پہاڑوں کے برابر لہروں میں جہاز اس وقت گیند بنا ہوا تھا۔ بڑی بڑی لہریں اُس کو تھپیڑے دیتی ہوئیں اِدھر اُدھر لیئے پھرتی تھیں مستول ہل رہے تھے ہوا سنّاٹے بھر رہی تھی۔ مسافر خدا کو یاد کر رہے تھے۔ اور بعض مایوسی کے عالم میں چیخیں مار رہے تھے۔ میں تختہ جہاز پر بیٹھا ہوا یہ تمام حال دیکھ رہا تھا۔ اور جب میرے کپڑے بالکل تر ہوگئے اور سردی سے میری دانت بجنے لگے تو میں وہاں سے اُٹھا۔

میں نے چاہا کہ اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلوں۔ شائد ٹہلنے سے جسم گرم ہو جائے۔ مگر جہاز پر اسباب۔ گٹھڑیاں۔ تھیلے۔ ہتھیار اور پگڑیاں اِدھر اُدھر اِس کثرت سے بکھری ہوئی تھیں کہ ٹہلنا ناممکن تھا۔ میں نے اپنے راست وچپ نگاہ کی۔ اور مجھے وہ جگہ نظر آئی جو اول درجہ کے مسافروں کی چہل قدمی کے لیئے مخصوص ہوتی ہے۔ میں نے

دیکھا کہ تاریکی میں اِس جگہ ایک آدمی پھر رہا ہے۔ میں نے اس شخص سے گفتگو کرنی چاہی۔ مگر ہمت نہ بندھی۔ اِس لیئے اُسکی توجہ مبذول کرنے کے لیئے میں نے ایک اَور تجویز سوچی۔ اِس طوفان میں میں نے بلند آواز سے ایک رزمیہ نظم جو مجھے زبانی یاد تھی پڑھنی شروع کی۔ مجھے کئی نظمیں یاد تھیں۔ مگر اِس وقت میں نے والٹیئر کی ہنری ریڈ کو پسند کیا۔

ابھی اِس نظم کے میں نے چند ہی بند پڑھے تھے کہ وہ مسافر ٹھیر کر سُننے لگا۔ میری مراد بر آئی۔ اور وہ اوّل درجہ کا مسافر میرے پاس آکر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

اُس مسافر نے مجھے والٹیئر کا حافظ دیکھ کر سمجھ لیا کہ میں کوئی معزز آدمی ہوں۔ اِس لیئے میرے عہدہ اور حسب و نسب کی بابت کچھ نہ پوچھا دوسرے دن صبح مجھے معلوم ہوا کہ یہ ایک معزز جنٹلمین ہے اَور ایک سفارت کے ساتھ بہ حیثیت سکرٹری قسطنطنیہ کو جا رہا ہے اگلے دن جب اُس نے مجھے پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو سخت متعجب ہوا۔ لیکن اس شخص نے میری قابلیت کی نسبت اچھی رائے قائم کرلی تھی۔ اِس لیئے مجھے کہا کہ تم نے مجھے پیرا میں ملنا۔ اور یہ بھی وعدہ کیا کہ حتے المقدور میں تمہاری مدد کروں گا۔

وارنا سے قسطنطنیہ تک ہم نے بخیریت تمام سفر کیا۔ اَور راہ میں کوئی ایسی بات پیش نہیں آئی۔ جو قابل بیان سمجھی جائے

لہ ایک مشہور فرانسیسی مصنف اَور شاعر سترھویں صدی کے اخیر میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۱۷۷۸ء میں مرا۔ ۱۲

باسفورس کا سفر ایسا ہے کہ کاہل سے کاہل انسان کو ایک دفعہ چاق و چوبند کر دیتا ہے۔ میرے دل پر تو اس سفر نے نمایاں اثر کیا۔ جب ہم کنارے پہنچے اور میں نے اپنے اردگرد بے شمار جھنڈیاں گولڈن ہارن[1] (شاخ طلا) کی دیکھیں تو میں نے سمجھا کہ میں اس وقت تمام دنیا کے مرکز میں آگیا۔ مگر جب میرے تمام ہمراہی ایک ایک کرکے چلے گئے۔ اور میں تنہا کھڑا رہ گیا تو یہ تمام خوشی یک قلم کافور ہو گئی مجھے کوئی ٹھکانا نظر نہ آتا تھا۔ جہاں جاتا اور فروکش ہوتا۔ [illegible] جب میں جہاز پر سوار ہوا تھا۔ تو میری جیب میں پندرہ فلارن تھے۔ انہیں سے ابھی تک کچھ باقی تھا۔ جو اس وقت میرے کام آیا اور میں کنارہ پر پہنچا۔ جب میں نے ترکوں کی دارالخلافت میں قدم رکھا تو میری جیب میں ایک پائی نہ تھی۔ مگر میرا دل طرح طرح کی امیدوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس حالت میں میں پیرا[2] کی طرف روانہ ہوا۔

اگر کوئی اور شخص میری جگہ ہوتا تو ضرور اپنے دل سے کہتا کہ میاں بتاؤ تو سہی کہاں رات کو ٹھہرو گے۔ کیا کھاؤ گے اور کیا کرو گے؟ مگر میں جوش سے اس قدر بھرا ہوا تھا کہ میں نے کبھی یہ سوال نہیں کیا۔ جوش نے میری آنکھوں کے آگے پٹی باندھی ہوئی تھی۔ اور جدھر چاہتا تھا لیئے پھرتا

---

[1] گولڈن ہارن یعنے شاخ زریں قسطنطنیہ کا لنگرگاہ ہے جسے آبنائے باسفرس کا بازو سمجھنا چاہیئے۔ یہ قدیم زمانہ سے اس نام سے مشہور چلا آتا ہے کیونکہ اس کا خم کسیقدر بیل کے سینگ سے مشابہت رکھتا ہے زریں اس لحاظ سے نام پایا کہ دنیا کے تمام سمندروں سے انواع و اقسام کے مال و منال اس بندرگاہ میں آیا کرتے تھے جو شایستگی اور تجارت کا مرکز تھا۔ ۱۲

[2] پیرا شہر قسطنطنیہ کا وہ حصہ ہے کہ جہاں زیادہ تر یورپین آبادی ہے۔ اور اہل یوروپ کی بڑی بڑی دکانیں اور تمام سفارت خانے شہر کے اسی حصہ میں واقع ہیں۔ قسطنطنیہ کے دوسرے حصہ کا نام غلاطہ یا غلطہ ہے ۱۲

تھا۔ ایک جگہ ترکی زبان میں کچھ کتبہ سا کندہ تھا۔ میں وہاں ٹھہر گیا۔ اور اسکو پڑھنے لگا۔ کہ اتنے میں ایک اجنبی جو ہنگری کا باشندہ تھا۔ وہاں سے گذرا اور اٹلی کی زبان میں مجھے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ غالباً میری ٹوپی سے جو اہل ہنگری کی وضع کی تھی وہ سمجھ گیا ہوگا کہ میں اِس ملک میں غریب دیار ہوں۔ میں نے اسکو اپنے حسب ونسب سے آگاہ کیا اور جب اُسکو معلوم ہوا کہ میں بھی ہنگری کا رہنے والا ہوں تو اسکو بہت خوشی ہوئی اور مجھے بھی بہت خوشی ہوئی *

اس شخص کا نام مسٹر پیس بوکی تھا۔ اپنے ملک میں تو یہ ایک دستکار تھا۔ مگر ٹرکی میں اُس نے مختلف کام کیئے تھے۔ کچھ عرصہ تک اہلکار رہا تھا پھر کریمیا کی لڑائی میں موودی ہو گیا۔ پھر جہاز پر محرر ہوا۔ اور آج کل طباخ تھا۔ جس وقت میں اسکو ملا یہ ایک کم حیثیت مکان کی پہلی منزل میں سفیر انگلستان کی فرودگاہ کے پاس رہا کرتا تھا۔ اُس مکان کا سامان آرائش صرف ایک لمبی چٹائی تھی۔ یہ چٹائی اُس نے مجھے دکھائی اور کہا کہ یہ حاضر ہے۔ دونوں بھائی ملکر گذارہ کرلیں گے۔

رات کے وقت میں یہاں اسکے پاس رہا۔ وہ تو سو گیا مگر مجھے نیند نہ آئی۔ آدھی رات کے وقت جبکہ ابھی میں خیالات میں غرق تھا تو دفعتاً مجھکو معلوم ہوا کہ میرے بوٹ خودبخود ہل رہے ہیں۔ میں نے اپنے دوست کو جگا دیا۔ اور کہا کہ دوست کوئی میرے بوٹ لیچلا ہے۔ وہ نیند میں تھا۔ نیند ہی میں اُس نے کچھ جواب دیا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ جب دوبارہ اُسکو کہا تو وہ خفا ہو کر بولا کہ ارے میاں خدا کے لیئے سو جاؤ اور سونے دو۔ چوہے کھیل رہے ہیں۔ میں نے دل میں کہا اچھا کھیل ہے۔ کہیں میرا بوٹ ہی نہ چٹ کر جائیں۔ یہ کہکر میں بھی سو گیا

اِس مکروہ جھونپڑے میں میں نے تین دن نہایت تکلیف میں گذاری اِس تین دن کے عرصہ میں میں نے لپنے کئی دوسرے اہلِ وطن سے جو اِس شہر میں رہتے تھے ملاقات پیدا کر لی - اور اُنہوں نے مجھے "مجار کلب" کے ایک کمرہ میں رہنے کی اجازت دے دی - اِس کلب میں بڑے بڑے چوہے تو نہ تھے مگر چھوٹے چھوٹے بکثرت تھے - ایک رات شدت کا جاڑا پڑا - میرے پاس کوئی بھاری کپڑا نہ تھا - اِس لیئے میرے دانت بجنے لگے جب کسی پہلو مجھے قرار نہ آیا تو میں نے اِس کلب کے سکرٹری سے کہا کہ بھائی اب تو سردی سے جان کے لالے پڑ گئے ہیں - اگر کوئی کپڑا ہو تو مجھے اوڑھنے کے لیئے عنائت کرو - اِس معزز شخص نے اپنی طرف سے بڑی مہربانی سے ایک قومی جھنڈے کا تنہ رنگ پھریرا اُتار کر میرے حوالہ کیا - اور نہایت احسان جتا کر کہا کہ بھائی جان اسکو معمولی نہ سمجھو - اِس پھریرے نے کئی جوانوں کے دلوں میں میدان جنگ میں آتشِ جوش مشتعل کر دی تھی - امید ہے کہ یہ تمہاری بھی سردی دور کر دیگا - اور تمام رات تمہیں میدان جنگ کے خواب آتے رہیں گے -

میں نے اُس وقت اِس پھریرے کو غنیمت سمجھا اور اُسکو اپنے اوپر نیچے لپیٹ لیا - اور چند منٹ کے بعد میں سو گیا -

اِس طرح پر کئی دن گذر گئے - ہر روز میری ملاقات کا احاطہ وسیع ہوتا جاتا تھا - لوگ میری ہفت زبانی کی ثنا خوان تھے اور جب کبھی مجھے ترکی زبان میں گفتگو کرتے دیکھتے تھے تو واقعی اُنکو تعجب آ جاتا تھا کہ یہ شخص کبھی اِس ملک میں نہیں آیا - اور پھر اِس فصاحت کے ساتھ اجنبی زبان میں تقریر کر سکتا ہے -

ایک دن بیٹھے بیٹھے میرے دل میں خیال آیا کہ آؤ ایک مدرسہ

کھول دیں۔ اور مختلف زبانوں میں سبق پڑھایا کریں۔ اِس سے خرچ اخراجات کی تنگی بھی دور ہو جائے گی۔ اور شہرت بھی ہو جائے گی۔ اِس خیال کو میرے دل نے بہت پسند کیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ایک اشتہار دیدیا۔ چنانچہ پہلا سبق جو میں نے کسی کو پڑھایا وہ ڈنمارک کی زبان میں تھا۔

اس شخص کا نام مسٹر ہب سیچ تھا۔ یہ شخص پرلے درجہ کا شریف اور نیک باطن انسان تھا۔ اِس شخص کا میں بہت مشکور ہوں اور جب کبھی وہ مجھے یاد آتا ہے میرا دل بہت خوش ہوتا ہے۔ اس کو مدت سے ڈنمارک کی زبان سیکھنے کا شوق تھا۔ مجھے مل کر بہت خوش ہوا۔ اور چھ مہینوں میں اُس نے اِس زبان میں کافی استعداد حاصل کرلی۔

اِس معلمی کے بعد مجھے بہت جلد اور بہت سے شاگرد ملگئے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں ایک کتب فروش کی دوکان پر کھڑا ہوا تھا کہ ایک نوجوان تُرک جس کے جلوس اور تزک و احتشام سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی امیر کبیر ہے۔ وہاں آیا۔ اُس کو ایک ایسے معلم کی ضرورت تھی جو اِس کو فرانسیسی زبان پڑھائے۔

یہ امیر مجھے بعد ازاں معلوم ہوا کہ ایک متمول "میراث خور" تھا حال میں اسکو بہت سی دولت ہاتھ آئی تھی۔ اور اب اس کا ارادہ تھا کہ اپنے آپکو اُن صفتوں سے متصف کرے جو وہاں کے امیروں کے لیئے لازمی سمجھی جاتی تھیں۔ ٹرکی میں وہ صفتیں یہ تھیں:-

(۱) فاخرہ لباس ایک قسم کے خانہ دار کپڑے کا جو وہاں دستیاب ہوتا تھا۔ اس لباس کے لیئے یہ ضروری تھا کہ وہ موجودہ فیشن کے مناسب ہو۔

(۲) چمکدار وارنش کے تنگ بوٹ۔

(۳) ایک خاص قسم کی ترکی ٹوپی اور دستانے۔
(۴) ایک خاص قسم کی رفتار جس سے رعب وداب ظاہر ہو۔
(۵) فرانسیسی زبان میں گفتگو۔

یورپ کے سوداگروں نے پہلی چار چیزیں اُسکو بہم پہنچا دی تھیں۔ اور پانچویں صفت کے لیئے اُس نے مجھے مقرر کیا۔ دس سکّے مروجہ یومیہ میری تنخواہ مقرر ہوئی۔ اور چونکہ میرا خوش پوش شاگرد میرے جائے قیام سے کچھ فاصلہ پر رہتا تھا۔ اِس لیئے گاڑی کا کرایہ بھی اُس نے مجھے ہر روز دینا منظور کیا۔ میرا کام یہ تھا کہ میں ہر روز ایک گھنٹہ اُسکو فرانسیسی زبان سکھایا کروں اس معلمی کی بدولت مجھے ایک صاحب ثروت ترک کے مکان میں آمدورفت کا موقعہ ملا۔ میرا یہ معمول تھا کہ میں وقت کا پابند تھا اور مقررہ وقت پر اُسکے مکان پر پہنچ جاتا تھا۔ لیکن میرا شاگرد تمام رات عیاشی میں بسر کرتا تھا۔ اور اکثر جب میں وہاں جاتا تھا تو اُسکو سویا ہوا پاتا تھا۔ اور بڑی مشکل سے اُسکی آنکھ کھلتی تھی۔ اِس میرے شاگرد کا میلان فرانسیسی زبان کی طرف قدرتاً بہت کم تھا۔ چنانچہ پورے ایک مہینہ میں اُس نے بمشکل فرانسیسی حروف تہجی سیکھے۔

اس امیر کا ہم جلیس ایک متعصب ملا تھا۔ اُسکو فرانسیسی زبان سے جسکو وہ کافروں کی زبان سمجھتا تھا دلی نفرت تھی۔ اسکو یہ درس تدریس ایک آنکھ نہ بھاتی۔ اور جب وہ مجھے سبق پڑھاتے سُن لیتا تھا تو غصہ سے اسکی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ قطع نظر اسکے میرے شاگرد کے والد صاحب مرحوم بھی سکّے مسلمان تھے۔ اِس لیئے ملا کو یہ دیکھکر کہ اِن کمروں میں جہاں ہر وقت قرآن کی تلاوت ہوا کرتی تھی۔ اب ایک اجنبی زبان سکھائی جاتی ہے۔ سخت غصہ آتا تھا۔ کئی بار اُس ملا سے نہ رہا گیا۔

اور اُس نے ترکی زبان میں کہا۔ "اسی طرح کفر ہمارے گھروں میں گھسا کرتا ہے"

اس معلمی میں مجھے بہت فائدہ ہوا۔ جوں جوں میری بے تکلفی بڑھتی گئی۔ میں نے یہ دستور اختیار کیا کہ علاوہ روزمرہ کی مقررہ تعلیم کے میں اس کو مغربی ملکوں کے حالات اور معاشرت اور طرز حکومت وغیرہ بتایا کرتا تھا۔ ان حالات کے سُننے سے اس کو کمال حظ حاصل ہوتا تھا۔ اگر میں ان معاملات میں مبالغہ کرتا تھا تو قابل تعجب نہیں۔ اہل یورپ جب مشرق میں آتے ہیں تو اُن کو مغرب کی اشیاء ہر وقت یاد رہتی ہیں اور مغربی اشیاء کے عیب بھی جوش محبت میں انکو خوبیاں نظر آتی ہیں۔ جو کچھ میں اپنے شاگرد کو بتلایا کرتا تھا وہ اُسکو بہت دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ روس کے مقابل انگلستان اور فرانس روم کے رفیق اور خیر خواہ بنے ہوئے تھے۔ اس لیئے اگر کسی وقت ان حکایات کو جو میں سنایا کرتا سُن کر ان کو حسد اور رشک پیدا ہونے کا بھی احتمال تھا تو اب یہ معاملہ بالکل دگرگون ہو گیا تھا۔ اور میرا شاگرد ہمیشہ میری حکایات کو نہایت خوشی سے سُنا کرتا تھا۔

جب سبق ہو چکتا تھا تو ایک پُر تکلف خاصہ چنا جاتا تھا۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان اُمرا کے کھانوں کو میں اس قدر پسند کرتا ہوں کہ اگر آپ میری زبان سے انکی تعریف سنو تو مجھے ضرور اُن کا طرفدار خیال کرو۔ کھانا کھا کر میں اور میرا شاگرد دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر ادھر اُدھر سیر کے لیئے نکلا کرتے تھے۔ بعض اوقات دوکانوں سے چیزیں بھی خریدا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ تمام دن میں اپنے شاگرد کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اور شام کے وقت کہیں مجھے اپنے اہل وطن لوگوں کی صورت دیکھنی نصیب

ہوئی تھی۔

ہر چند کہ میں اس شاگرد کے ساتھ اکثر نشست و برخاست رکھتا تھا لیکن میں اس تعلق کو عارضی تعلق سمجھے ہوئے تھا۔ اور میرا مستقل تعلق ترکوں سے اس وقت ہوا۔ جب کہ ایک اہل وطن کی سفارش پر مجھے جنرل حسین دایم پاشا نے اپنے بیٹے حسن بے کا اتالیق مقرر کیا۔

اس تقرر کے بعد میں "پیرا" سے اٹھ کر "فندکلے" میں جا رہا۔ یہاں مجھے ایک پر تکلف کمرہ علیحدہ رہنے کے لئے میسر آیا۔ اور مجھے بھی معلوم ہوا کہ قسطنطینیہ کے امرا کے گھروں میں رہنا بھی واقعی ایک نعمت ہے۔ یہ مکان ایک مسجد کے قریب تھا۔ اور برلب سمندر واقع تھا۔ اسکی کھڑکیوں سے سمندر میں بے شمار جہاز کشتیاں اور بجرے مجھے نظر آتے تھے۔ جب میں اس سہ منزلہ مکان کی بلندی اور وسعت کیطرف دیکھتا تھا۔ تو میرے دلمیں ایک قسم کی عظمت پیدا ہوتی تھی۔ اور جب مسجد کے میناروں سے جو ہمارے پڑوس میں تھے۔ مؤذن کی آواز میرے کانوں میں آتی تھی۔ تو ایک عجیب وحشت مجھپر طاری ہوتی تھی۔ مگر بحالت مجموعی یہ تمام چیزیں ایسی تھیں کہ مجھے کبھی نہ بھولیں گی۔

اس گھر میں سب سے زیادہ اثر میرے دل پر اس "سفیر خارجہ" کی شکل نے کیا۔ یہ ایک سفید ریش انسان تھا۔ اور مجھپر خاص مہربانی کیا کرتا تھا۔ جب مجھ سے رسوم اور آداب و قواعد کے مدنظر رکھنے میں غلطی ہوتی تھی تو وہ بڑی تکلیف اٹھا کر مجھے تمیز سکھایا کرتا تھا۔ اس نے مجھے سکھایا کہ اس طرح مؤدب ہو کر بیٹھنا چاہیئے۔ اس طرح بازو رکھنے چاہئیں۔ اس طرح ٹانگیں رکھنی چاہئیں۔ اس طرح کھانسنا چاہیئے۔ اس طرح عطسہ اور خمیازہ لینا چاہیئے۔ اس مہربان بزرگ نے مجھے معمولی سے معمولی باتوں کے بھی آداب

آبنائے باسفورس

سکھلائے اور ایک دن بڑی مہربانی سے مجھے کہا کہ یہ پہلی دفعہ ہے کہ اس بڑے شہر میں تجھے آنے کا اتفاق ہوا۔ اس لیئے تجھے آدمیت سیکھنی چاہیئے۔

اس پیر مرد کا خیال یہ تھا کہ میں کافرستان سے آیا ہوں۔ اور تعلیم و تربیت سے اس طرح بے بہرہ ہوں جیسے خرپوط اور دیاربکر کا کوئی بے علم کسان ہو۔

میرا سردار یعنے پاشا جس کا ذکر میں پیشتر کر چکا ہوں۔ ایک نہایت باسوخ شخص تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو بعد از ان "کویلی" کی سازش کا سرغنہ بنا۔ ان سازشیوں کا یہ خیال تھا کہ اگر سلطان عبدالمجید کو معزول کردیا جائے تو تمام خرابیاں یکلم رفع ہو جائیں گی۔ اور سلطنت عثمانیہ کو پھر وہی وقار حاصل ہو جائے گا۔ جو اسے قدیم زمانے میں حاصل تھا۔

جن ایام میں یہ سازش پک رہی تھی میں اس پاشا کی چھت کے نیچے رہا کرتا تھا۔ وہاں ایک ملا بغداد سے آیا ہوا تھا جو اس سازش کی روح رواں تھا۔ اس ملا کا نام احمد آفندی تھا۔ واقعی بڑا عالم فاضل اور درویش صفت تھا۔ مگر تعصب کا پتلا تھا۔ یہ جنگ[1] کریمیا میں غازی بنکر ننگے پاؤں اور ننگے سر شریک ہوا تھا۔ ہر وقت اسکی شمشیر اسکی کمر میں رہتی تھی۔ اور ہر دم اس کا نیزہ اس کے ہاتھ میں رہا کرتا تھا۔ یہ دونوں

---

[1] کریمیا کی مشہور لڑائی روسیوں اور ترکوں فرانسیسیوں اور انگریزوں کے مابین ۱۸۵۴ء میں ہوئی۔ کریمیا یورپین روس کا ایک جزیرہ نما ہے۔ دراصل یہ جنگ ترکوں اور روسیوں میں تھی۔ لیکن انگریز اور اہل فرانس ترکوں کی امداد کے لیئے روسیوں کے مقابلہ میں لڑے۔ سقامات آلما۔ بالاکلاوا۔ انکرمان وغیرہ میں خوب لڑائیاں ہوئیں اس جنگ کا خاتمہ فریقین کی باہمی شکست پر ہوا۔ صرف انگریزوں کے ایک لاکھ آدمی اور دس کروڑ روپے جنگ کریمیا پر صرف ہوئے تھے۔ دوسری قوموں کے نقصان کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔

چیزیں اُس وقت اُس سے جدا ہوتی تھیں۔ جب وہ نماز پڑھتا تھا۔ برف میں طوفان میں میدان جنگ میں غرض ہر جگہ یہ غازی شمشیر سردار کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اور جس وقت اسکو جوش آجاتا تو اُسکی آنکھیں کے انگاروں کی طرح دہکنے لگ جاتی تھیں۔

اگر ایسے شخص سے حسین دایئم پاشا خوش نہ ہوتا تو اور کس سے ہوتا اس ملانے سے اُسکی ملاقات میدان جنگ میں ہوئی تھی مگر اب سلسلہ یگانگت یہانتک بڑھ گیا تھا کہ اس ملا برہنہ درویش کو خاص حرم سرائے میں بھی جانے کی اجازت تھی۔ پہلے اس درویش کی صورت سے مجھے خود بخود ڈر آتا تھا۔ اور میں اُسکے قریب بیٹھنا نہ چاہتا تھا۔ مگر جب میرے آقا نے میرا نام رشید رکھا۔ تو اُس شخص نے غالباً یہ سمجھا کہ میں مسلمان ہوگیا ہوں۔ اس لیئے میرے ساتھ کشادہ پیشانی سے پیش آنے لگا۔ اگرچہ اُسکا یہ خیال بالکل غلط تھا۔ مگر میں نے ظاہرا ایسی روش اختیار کرلی کہ اسکو اپنی غلط گمانی پر یقین ہوگیا۔

اس احمد آفندی نے مجھ سے خوش ہوکر مجھے اجازت دی کہ تو میرے پاس مسجد کے حجرہ میں جہاں میں طالبعلموں کو سبق پڑھایا کرتا ہوں آجایا کر۔ میں مسجد میں اُسکے پاس جایا کرتا تھا۔ اور دیکھتا تھا کہ وہ گویا ایک بحر العلوم ہے۔ وہ عربی اور فارسی میں فارغ التحصیل تھا۔ اور جب کبھی خاقانی۔ نظامی یا جامی کی تصانیف سے میں کوئی شعر پڑھتا تھا تو وہ تمام قصیدہ یا غزل یا قطعہ جیسا موقعہ ہو حفظ سنا دیتا تھا۔ اور کئی گھنٹے اُسپر تقریر کرتا رہتا تھا۔

اس مولوی نے مجھے مغربی انسان سے مشرقی انسان بنادیا۔ میری پیارے ناظرین اس سے یہ نہ سمجھیئے کہ میرا دل بھی بدل گیا تھا۔ نہیں ہرگز نہیں جتنا مجھے مشرق کا زیادہ تجربہ ہوا اُتنا ہی مغرب کی عظمت میرے دل میں زیادہ ہوگئی۔

فصل سوم

استنبول میں قیام

۱۸۶۱ء میں شاید ہی کسی یورپین کا رسوخ ترکوں کی سوسائٹی میں اسقدر ہو جس قدر کہ میرا تھا۔ اور شاید ہی کسی یورپین کو اس قدر حالات استنبول کے اس زمانہ میں معلوم ہوں جس قدر کہ مجھے معلوم تھے۔ اس موقعہ پر میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ بعض ترکی امرا کا شکریہ ادا کروں کہ جنہوں نے نہایت فیاضی سے ان ایام میں میرے ساتھ برتاؤ کیا تھا۔ مجھے تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ترکوں کے بڑے بڑے اعیان سلطنت اس طرح اخلاق اور عجز و انکسار اور اہلیت اور تلطف سے اجنبی کے ساتھ پیش آتے ہیں کہ یہ باتیں بہت ہی کم ہیں مغرب کے بڑے بڑے لوگوں میں ملتی ہیں۔ جب ہم بعض مغربہ کے امرا کو نخوت مآب اور رعونت مجسم دیکھتے ہیں تو ہمکو یہہ لوگ اُن کشادہ پیشانی فیاض اور زندہ دل مشرقی امرا کے مقابلہ میں بہت ہی ادنےٰ معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس تکبر اور انانیت پر وہ لوگ بھی خندہ زن ہوتے ہیں۔ مشرق میں سب انسان بھائی ہیں اور بلحاظ انسانیت کے برابر ہیں۔ اُنمیں ذات صرف کتوں اور گھوڑوں میں دیکھی جاتی ہے۔ لیکن یہہ صفتیں جو وہ لوگ کتوں میں دیکھتے ہیں ہمارے بھائی بند اپنے آپ میں ڈہونڈتے ہیں اور اسپر ناز کرتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی سُنا ہے کہ کوئی اجنبی ہم میں صرف وسعت معلومات کے لیئے آیا ہو۔

اور ہمارے امرا نے اُسے اپنے گھر میں جگہ دینا تو درکنار اُس سے سیدھے منہ سے بات بھی کی ہو۔ اِسمیں کلام نہیں کہ ہم میں عالموں اور فاضلوں کی قدر ہے۔ لیکن جو اخلاق اور اہلیت اہل مشرق میں ہے وہ ہم میں معدوم ہے یورپ میں قدیمی خاندان بڑے بڑے شجرے پیش کرکے لیڈر بننے کی ہوس رکھتے ہیں۔ لیکن ایشیا میں یہ بات نہیں ہے۔ عرب بیشک اپنے آبا و اجداد کے کارنامے سنکر خوش ہوتے ہیں۔ مگر اِن باتوں کو وہ ذاتی فخر نہیں سمجھتے۔ یورپ میں باپ دادا کی خوبیاں بہت سے ملکوں میں اپنی طرف منسوب کیجاتی ہیں[لہ]

سنہ ۱۸۵۵ء میں میں نے جرمن اور ترکی زبانوں کی ایک لغات لکھی اب میں دیکھتا ہوں کہ یہ لغات بہت نامکمل اور ناقص ہے مگر ابتک کوئی اس سے بہتر لغات نہیں چھپی۔ اور قسطنطنیہ میں اگر کسی جرمنی کے مسافر کو کوئی لغات ملسکتی ہے تو وہ یہی میری چھوٹی سی کتاب ہے۔ ترکوں کا علم زبان سیکھنے میں مجھے دو باتیں ملحوظ خاطر تھیں۔ ایک تو یہ بات تھی کہ مجھے سلطنت عثمانیہ کی تاریخ میں کئی باتیں ایسی نظر آتی تھیں جو میرے اپنے ملک

لہ گو فاضل مصنف نے پیچھے بتلایا ہے کہ جوں جوں مجھے مشرق کا تجربہ بڑھتا مغرب کی عظمت میرے دل میں زیادہ ہوگئی۔ مگر بقول حق برزبان جاری کے وہ اہل مشرق کی شائستگی کی تعریف کرنے سے باز نہیں رہ سکا۔ ممالک یورپ وامریکہ میں ابتک خاندانی لوگوں کو اسقدر عزت دیجاتی ہے کہ اسوقت لاکھوں برائے نام ڈیوک اور پرنس جو صرف مورث خاندانوں کی یادگار ہیں ہرچند کہ روٹی سے عاجز ہیں مگر امریکہ اور یورپ کے دولتمندوں کی لڑکیاں صرف اس وجہ سے ان سے شادیاں کرتی ہیں کہ شوہروں کے خطاب میں شریک ہوں۔ عموماً ان بیویوں کو عمر بھر اپنے شوہروں کے اخراجات کا متحمل ہونا پڑتا ہے۔ اس پر بھی یہ لوگ اپنے باپ داداؤں کے کارناموں پر بڑے نازاں ہوتے ہیں۔ مشرق میں ہم جانتے ہیں کہ ؎

گرد نام پدر چہ میگردی ؎ پدر خویش باش گر مردی

کے لیئے کئی لحاظ سے مفید تھیں۔ اِس لیئے میں نے ترکوں کی تاریخ کا ترجمہ اپنی زبان میں کرنا چاہا۔ اور اِس بارہ میں ہنگری کے بیت العلوم سے امداد چاہی۔ اگرچہ تاریخ عثمانیہ کے مورخ اظہار رائے میں بعض اوقات رعایت کو مدنظر رکھ لیتے ہیں۔ اِنکی محنت اور پیرایہ جس میں اُنہوں نے تاریخ لکھی ہے واقعی قابل داد ہے۔ اہل یورپ بہت کم اِس بات سے واقف ہونگے کہ جن ایام میں کہ سلطان جنوبی یورپ میں ہنگامہ رستخیز برپا کر رہے تھے۔ اُنکے ساتھ ہی مورخ بھی ہوتے تھے۔ جو انکی حرکات اور سکنات کو ساتھ ساتھ قلمبند کرتے جاتے تھے یہ بات اُس زمانہ کے رومن کیتھلک پادریوں کو مطلق نصیب نہ تھی۔

دوسری بات جو میرے ملحوظ خاطر تھی وہ یہ تھی کہ اِن زبانوں کی تحقیقات میں مجھے ایک وسیع میدان تعلیم و تربیت کا دکھائی دیتا تھا۔ جو ابھی تک بنجر پڑا ہوا تھا۔ اور اس میں میں تخم ریزی کرنا چاہتا تھا۔ اِس مطلب کے لیئے میں نے بہت سے کتب خانوں کی سیر کی۔ اور وہاں کئی قلمی کتابیں مطالع کیں۔ کبھی کبھی میں بخارا کے مسافروں کے تکیوں میں جایا کرتا تھا۔ اور اُن سے وسط ایشیا کے معاملات سنا کرتا تھا۔ میں نے ادق کتابیں اچھی طرح سمجھنے کے لیئے ایک معلم بھی رکھا ہوا تھا۔ اِس کا نام ملا خلیل مراد تھا۔ اِس نے وسط ایشیا کی رسم و رواج سے مجھے کماحقہ آگاہ کر دیا۔ یہ اکثر بخارا اور سمرقند کی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ اور میں ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرتا تھا۔ یہ شخص بڑا سیاح اور جہاں گرد تھا۔ دو بار حج بھی کر آیا تھا۔ اور وہ تمام صفتیں جو جہاں دیدہ لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ اِسمیں موجود تھیں۔

یہ لوگ مجھے اِس قسم کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ کہ مجھے وہاں جانے میں بعض اوقات جان کا خطرہ نظر آتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد استنبول میں رہنا مجھے ناگوار معلوم ہونے لگا۔ کبھی میں "بیرا"

میں یورپین سوسائٹی میں وقت گذارتا تھا۔ اور کبھی محل سرائے میں اہل اسلام کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ زندگی جو ایک ہی قسم کی زندگی تھی اور جس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ آخرکار مجھے ناگوار معلوم ہونے لگی۔ اور میں نے چاہا کہ اس میں اب کچھ انقلاب ہونا چاہیئے۔ جب کبھی کوئی اہل وطن مجھے ملتا تھا۔ تو کوئی کوئی انہیں میرے خیال کی تائید کرتا تھا۔ اور مجھے بخارا اور سمرقند جانے کی ترغیب دیتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ تعجب ہے تم اتنے سال سے ترکوں میں رہتے ہو اور ابھی تک سر موتم میں فرق نہیں آیا۔ ابھی تک تم وہی یورپین ہو جو تم اُس وقت تھے جب یہاں آئے تھے۔ اِن لوگوں کی گفتگو سمند شوق کے لیئے تازیانہ کا کام دیتی تھی۔ کیونکہ میرا تو یہ حال تھا کہ سمرقند اور بخارا کا نام سُن کر میرے دل میں ایک ولولہ سا پیدا ہو جاتا تھا۔ بخارا اور سمرقند کی زبان سے اب میں بخوبی واقف تھا۔ اور اگر کسی بات کا مجھے خیال تھا تو صرف یہ تھا کہ مبادا وہاں جان نہ چلی جائے۔

ابھی میں اِس معاملہ پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک بات ایسی پیش آئی جسنے تمام شاک شکوک رفع کر دیئے۔ ہنگری کے بیت العلوم نے میرے ترجموں سے خوش ہو کر مجھے اپنا ممبر بنا لیا تھا۔ اور اس عزت نے میری کمر ہمت چست باندھ دی۔ اور جب ۱۸۶۱ء میں میں ہنگری میں کئی سال کے بعد اپنا لیکچر دینے گیا۔ تو بیت العلوم کے پریزیڈنٹ مجلس کونٹ الف کے اشارہ پر مجھے چھ سو فلارن اس سفر میں زاد راہ کے لیئے ملگئے۔ اِس میں شک نہیں کہ بہت سے لوگ وطن میں ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے کہا کہ ایسے کمزور دُبلے پتلے آدمی سے کیا ہو سکیگا۔ مگر میں نے ان لوگوں کے فضول اعتراضوں کی کچھ پرواہ نہ کی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ جہاں میں جاتا ہوں وہاں نہ تو زور آور ٹانگیں مطلوب ہیں۔ نہ بھرا ہوا کیسہ بلکہ وہاں صرف "زبان" مطلوب ہے۔

بیت العلوم نے وسط ایشیا کے جملہ سلطانوں۔ خانوں اور نعیکوں کے نام ایک فرمان لکھدیا۔ جس میں میری سفارش کی کہ میرے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ شکر ہے کہ یہ فرمان میں نے کہیں پیش نہیں کیا۔ ورنہ ایک دم میں جلاد میرا سر تن سے جدا کر ڈالتا۔ بہرحال میں نے کسی کی دلشکنی روا نہ رکھی۔ اور پستھ میں تین مہینے رہ کر پھر قسطنطنیہ میں آگیا۔ اور وسط ایشیا کے سفر کی تیاریاں کرنے لگا۔ قسطنطنیہ میں چھ مہینے اور مجھے تیاریوں میں لگ گئے اور ان چھ سو فلارن میں سے جو میرے پاس زاد راہ کے لیئے تھے۔ تین سو فلارن صرف ہوگئے۔ اس قسم کا بہت ساحصہ مجھے مسافروں کی نذر کرنا پڑا۔ جو بخارا اور سمرقند سے وہاں آئے ہوئے تھے۔ انمیں اکثر نہایت مفلس اور قلاش تھے۔ انکو میں نقدی دیا کرتا تھا۔ اور ان سے حالات سنا کرتا تھا۔ غرض اس طرح مطالعہ اور کہانیاں سننے سے اسلامی مشرق کے بہت سے حالات مجھے معلوم ہوگئے۔ میرا حال بعینہ ان ناول پڑھنے والوں کی طرح تھا جو فرانس کے ناول پڑھ کر پیرس کے حالات سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔

میرے دوستوں نے جب استنبول میں سنا کہ میں ترکستان جانے والا ہوں تو انکو سخت حیرت ہوئی۔ اب وہ زمانہ نہ تھا کہ جس زمانہ میں ان ملکوں میں ابن بطوطہ۔ ابن فضلان۔ مسعودی اور یاقوت وغیرہ جیسے نامور آدمی موجود ہوتے۔ بلکہ اب وہ زمانہ تھا کہ لوگوں کے خیال میں ایسے ملکوں میں جانا جہاں کے باشندے جاہل۔ جابر اور متعصب ہیں سخت خطرناک تھا۔ چنانچہ جب میرے دوست آفندیوں نے سنا کہ میں ترکستان کو جاتا ہوں تو وہ متعجب ہو کر کہنے لگے کہ خدا اسکے حال پر رحم کرے۔ یہ ضرور دیوانہ ہوگیا ہے واقعی انکے خیال میں میرا باسفورس کا کنارہ ایسے امیر کبیر کا مکان اور راحت آرام و آسایش چھوڑ کر ایسے دور دراز سفر پر جانا جنون سے کم نہ تھا۔ پھر بھی

ان مہمان نواز لوگوں نے جہانتک ان سے ہو سکا میری مصیبت کو کم کرنا چاہا۔ سب سے پہلا ملک جو میرے رستہ میں تھا وہ ایران تھا۔ یہاں طہران میں مدت سے حیدر آفندی سفیر سلطانی مقیم تھا۔ یہ میرے مربی کا دوست تھا۔ اِسکی طرف مجھے میرے مربیوں نے خطوط لکھدیئے۔ اور سب نے میری سفارش کی کہ جہانتک ہو سکے میری حفاظت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہے۔ یہاں سے مجھے جملہ سرداروں کے نام فرمان بھی ملے۔ اور ان فرمانوں میں میرا نام رشید آفندی درج ہوا۔ اِن فرمانوں سے یہ مطلقاً مترشح نہ ہوتا تھا کہ میں یورپین ہوں۔ اور ایک خاص مطلب کے لیئے وسط ایشیا میں جاتا ہوں۔ مجھے اِن فرمانوں میں مسلمان ظاہر کیا گیا۔ اور میں نے بھی اپنے ہم پکو آفندی از قسطنطنیہ سمجھکر ویسا ہی برتاؤ اختیار کر لیا۔

یہ تو میری جسمانی تیاری کا حال تھا۔ اب سنیئے کہ میرے دل میں کیسے کیسے خیالات اُٹھ رہے تھے۔ جوں جوں میری روانگی کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا میری آتش شوق زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ اِس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے کانوں اور میری آنکھوں کے آگے مہریں لگی ہوئی ہیں۔ اور اگر کوئی بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ تو وہ صرف "قنامرگانہ" کی طرح مشرق اور مشرقی علم زبان ہے۔ اگر کسی بات کا مجھے خطرہ ہو سکتا تھا۔ تو وہ صرف یہ تھا کہ میں نادار ہوں اور کمزور ہوں۔ خدا جانے مجھے آب وہوا موافق آئے یا نہ آئے۔ بجز اِسکے مجھے اور کوئی ڈر نہ تھا۔ کیونکہ موت اور ناکامی کا خیال تک کبھی میرے دل میں نہ آیا تھا۔ لیکن اے پیارے ناظرین ان باتوں کا مجھے کیا ڈر ہو سکتا تھا؟ وہ کونسی تکلیف تھی جو بچپن کے زمانہ سے میں نے اُس وقت تک نہیں اُٹھائی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک مجھے پیٹ بھر کر کھانا بہت کم

ـــہ آفندی ایک ترکی زبان کا لفظ ہے جسکے معنی صاحب یا جناب ہیں عرف عام میں آفندی کے نام سے علما مخاطب کیے جاتے ہیں ۱۲

نصیب ہوا تھا۔ اور جس قسم کا میرا لباس ہوا کرتا تھا وہ میرے ناظرین جانتے ہی ہیں۔ مجھے لوگوں کی طبائع کا حال معلوم تھا اور میرے خیال میں بیہودہ مشرقی لباس اور یورپین کپڑے یکساں تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اہل مشرق کی وہ فیاضی اور ہمدردی دیکھی ہوئی تھی کہ وہ خوفناک تصویر جو ہمارے اہل تعلم ان وحشیوں کی کھینچتے ہیں۔ مجھے مطلق نہ ڈرا سکتی تھی ہاں ایک بات کا ضرور میرے دل پر اثر تھا۔ اور وہ یہ تھی کہ آرام اور راحت کی چاشنی کے بعد پھر میں مصیبتوں کا بار گراں سر پر اٹھانے والا تھا۔ قسطنطنیہ میں میں امیروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ اچھا مکان۔ اچھا کھانا سواری اور تمام سامان آسایش مجھے میسر تھا۔ اے ناظرین مجھے ناز ہے کہ میں نے اپنی مرضی سے یہ امیری چھوڑی۔ اور فقیرانہ کاسہ ہاتھ میں لیا۔ لیکن میں غلطی پر ہوں۔ اولوالعزمی ہم سے کیا کچھ نہیں کراتی۔ اور کہاں ہمیں نہیں لیجاتی۔ دولت رتبہ اور منزلت خوبصورت کھلونے ہیں۔ جو مدت تک ہمارا دل نہیں بہلا سکتے۔ ایک نہ ایک دن انسان کا دل ان سے اکتا ہی جاتا ہے مگر بنی نوع انسان کی خدمت واقعی وہ نعمت ہے جو دوامی مسرت بخشتی ہے میرے دل میں یہ خیال سمایا ہوا تھا اور اسی خیال نے میری کمر ہمت باندھ دی میں جانتا تھا کہ فہم و فراست کی کتاب میں اگر ایک حرف میں زیادہ کر دوں تو مجھ سے بڑھ کر کوئی بھی خوش نصیب نہیں ہو سکتا۔

میرے یہ حالات تھے جب کہ میں قسطنطنیہ کے آرام کو چھوڑ کر بحیرۂ اسود میں داخل ہوا۔ اس وقت میرا کوئی دوست یا رشتہ دار موجود نہ تھا جو مجھے الوداع کہتا۔ میں تن تنہا روانہ ہوا۔ اور جب میں جہاز میں سوار ہوا تو میں نے نظر اٹھا کر مغرب کی طرف دیکھا۔ اور کہا دیکھئے۔ اے سرزمین مغرب! مجھے پھر بھی تجھ دیکھنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں؟

فصل چہارم

طرابزون سے ارضِ روم تک

جب ہمارا جہاز طرابزون[1] کے بندرگاہ میں پہنچا تو سلامی کی توپیں چلنے لگیں۔ اور باجہ بجنے لگا۔ مگر یہ استقبال مجھ بے نوا درویش کا نہ تھا جو کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیئے وسط ایشیا میں بادیہ پیمائی کرنے کو جا رہا تھا یہ تمام تیاریاں **مخلص پاشا** کے لیئے تھیں جو حال میں طرابزون کا والی (گورنر) مقرر ہوا تھا۔ اور اپنے عہدہ کا چارج لینے کے لیئے وہاں جا رہا تھا اتفاق سے میں بھی اُسی جہاز میں سوار تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس نئے گورنر کے آنے سے اُنکی حالت بدل جائے گی اور اُنکی تمام شکایتیں رفع ہو جائیں گی۔ مگر افسوس کہ اُنکی تمام اُمیدیں یونہی خاک میں مل گئیں۔ اور یہ گورنر بھی بالکل اپنے ماسبق گورنروں کا نمونہ ثابت ہؤا۔

طرابزون جو کسی زمانہ میں متھرِیڈیٹ[2] کا دارالخلافہ تھا۔ اگر سمندر میں جہاز میں سے دیکھا جائے تو دور سے یہ بہت خوبصورت شہر نظر آتا ہے۔

---

[1] طرابزون اسی نام کی ولائت کا صدر مقام بحیرہ خضر پر قسطنطنیہ سے (۵۶۰) میل کے فاصلہ پر واقعہ ہے۔ جو ترکوں کا بحیرۂ خضر کا بندرگاہ ہے۔ اسکے ذریعہ سے بہت سی تجارت ایران اور اندرونی ترکی صوبجات سے ہوتی ہے۔ شہر بہت عمدہ ہے اور قریب نصف لاکھ کے آبادی ہے۔ یہاں چالیس مسجدیں سولہ گرجے اور اُنیس مُسلمانوں کے مدارس ہیں ◆

[2] متھرِیڈیٹس کئی بادشاہوں کا نام ہے جو قدیم زمانہ میں طرابزون کے علاقہ میں حکمران تھے ۱۲

اور جب شہر میں جاؤ تو اور بھی زیادہ اس کی خوبصورتی معلوم ہوتی ہے جو کئی ترکی قصبوں سے بڑھ کر دلکش ہے۔ مخلص پاشا کی ملاقات مجھ سے قسطنطنیہ میں ہوئی تھی۔ اس شہر میں جب تک میں رہا۔ اُنہوں نے مجھے اپنے ہاں مہمان رکھا۔ جب ہم جہاز سے اُترے تو میں بھی ایک گھوڑے پر سوار ہو کر مخلص پاشا کے جلوس کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ اور ہم سب گورنر کے محل کیطرف روانہ ہوئے۔ راہ میں ہر طرف جوق جوق لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ پاشا نے حکم دیا کہ کچھ نقدی اِن لوگوں میں لٹا دو۔ پس نقدی کا اُنکی طرف پھینکا جانا تھا کہ لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور جن جن خوش نصیبوں کو کچھ ہاتھ آگیا وہ بآواز بلند دعائیں دینے لگے۔ میں صرف تین یوم تک طرابزون میں رہا۔ یہ تین دن میں نے اُن ضروری چیزوں کے خریدنے میں صرف کئے جو مجھے راہ میں مطلوب تھیں۔ منجملہ اور اشیاء کے میں نے ایک گھوڑا بھی کرایہ پر لیا۔ میں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ طہران تک تو میں آفندی بنا رہونگا۔ اور اُس سے آگے اپنے آپکو کاتب مشہور کرونگا۔ تاکہ لوگ مجھ سے مہماں نوازی سے پیش آئیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸) ۱۴ لیکن مِتھریڈیٹس ششم انہیں ایام ہو گزرا ہے۔ جو اپنے عہد میں اہل روما کا بڑا زبردست دشمن تھا۔ ۱۲۳ سال قبل مسیح ۱۲ سال کی عمر میں یہ اپنے باپ کے تخت پر بیٹھا اہل روما اسکی طاقت کمزور کرنے کی فکر میں تھے اسلئے اُنہوں نے اس سے جنگ کرنے کی تیاری کی ادہر اس نے بغرض انتقام ایک لاکھ رومیوں کو جو اس کے علاقہ میں رہتے تھے قتل کا حکم دیدیا۔ اور خود اکوالیس سے زور آزمائی کو بڑھا جسکو اس نے شکست دی لیکن سلا نے اس پر چند فتوحات حاصل کر کے ۸۴ سال قبل مسیح اسکو صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد شاہ آرمینیا ٹگرینس سے اتفاق کر کے اس نے پھر رومیوں پر فوجکشی کی مگر ۶۶ سال قبل مسیح پامپی نے دریائے فرات کے قریب اسپر فتح حاصل کی یہ بھاگ گیا اور رومیوں سے صلح چاہی مگر وہ اصرار کرتے تھے کہ یہ بذات خود حاضر ہو کر صلح طلب کرے اسپر اس نے خودکشی کر لی یہ بڑا قابل سپہ سالار اور دانشمند آدمی تھا۔ اور پچیس زبانیں جانتا تھا۔

میرا تمام اسباب ایک "خورجین" میں تھا۔ اسمیں دو کرتے چند کتابیں اور کچھ متفرق اشیا اور دو دریاں بھی تھیں۔ ان دریوں میں سے ایک تو میں نیچے بچھایا کرتا تھا۔ اور دوسری اوپر اوڑھا کرتا تھا۔ ان اشیاء کے علاوہ اس تھیلے میں ایک دیگچی۔ ایک "سماوار" چائے پینے کا سامان اور ایک پیالہ بھی تھا۔ میرے دوست پاشا نے مجھے بار بار کہا کہ دو "خواص" (پولیس مین) بھی اپنے ہمراہ لے جاؤ۔ تاکہ معلوم ہو تم باحیثیت آدمی ہو مگر میں نے اسکی مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ انکی مجھکو ضرورت نہیں آخرکار میں تنہا اپنے "سروجی" کے ساتھ جس کا گھوڑا میں نے کرایہ کیا تھا۔ ۲۱ مئی ۱۸۶۲ء کو اس سلسلہ کوہ کی طرف جو جانب مشرق پھیلا ہوا ہے روانہ ہوا۔

جب میں اس شہر سے روانہ ہوا تو آفتاب بھی نکلا ہوا تھا۔ اور ہم قدم قدم جا رہے تھے۔ جب میں پہاڑوں کی گھاٹی میں پہنچا تو میرے ارمنی رفیق نے جس کا نام "سجاتر" تھا مجھے کہا کہ تھوڑی دیر کے بعد سمندر ہماری نظروں سے غائب ہو جائے گا۔ یہ سن کر میں ایک بلند مقام پر کھڑا ہو گیا۔ اور میں نے اپنے پیچھے کی طرف نظر ڈالی۔ اس وقت سمندر میں کسی قسم کا تلاطم نہ تھا۔ جو اس وقت بصورت ایک جھیل کے مجھے دکھائی دیتا تھا۔ اس وقت میرے دل میں پھر ایک مرتبہ اپنے سفر اور ان خطرات کا جو اس سفر میں میری قسمت میں لکھے تھے خیال آیا۔ اور انہیں باتوں کے تصور میں میں نے طرابزون کو دیکھا اور بہت دور سمندر میں اس آسٹریا کے جہاز کو بھی پہچان لیا۔ جس میں سوار ہو کر میں اس شہر تک آیا تھا۔ اس جہاز کے مستول پر ایک جھنڈا نصب تھا۔ جس کا پھریرا اس وقت ہوا میں ہل رہا تھا۔ اسکو دیکھکر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ گویا یہ اس وقت

مجھے الوداع کہہ رہا ہے۔ غرض میں چھ گھنٹے گھوڑے پر سوار رہا۔ حالانکہ میرے راست و چپ بہت ہی دلکش نظارہ تھا۔ مگر اس چھ گھنٹے کے سفر میں میں تھک گیا۔ اور تکان کے باعث میرا بند بند درد کرنے لگا۔ گھوڑے پر سفر تو ابتدا میں ہر ایک کو تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مگر اس قسم کے کرایہ کے جانور پر خصوصاً بہت تکلیف ہوتی ہے۔ یہ لوگ جن کو سرجی کہتے ہیں۔ عموماً اپنے جانور باربرداری کے لیئے رکھتے ہیں۔ اور انکو باربرداری کی عادت ہو جاتی ہے۔ جب کوئی مسافر اُن پر سوار ہوتا ہے تو اسکی شامت آجاتی ہے۔ اس طرح قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں۔ اور سوار کو بار بار اس طرح ایڑ یا پاشنہ لگانی اور لگام کے جھٹکے دینے پڑتے ہیں۔ کہ تمام بدن میں درد ہونے لگتا ہے۔ کوپری کے پاس ایک سرائے میں جس کو وہاں "خان" کہتے ہیں۔ میں آخر کار مقیم ہوا۔ یہاں چارپائی کہاں تھی۔ مجھے خانہ بدوشوں کی طرح زمین پر سونا پڑا۔ مگر میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ نیند مجھے کسی طرح نہ آئی۔ اس سرائے میں بہت سے کرایہ کے گھوڑوں اور خچروں والے بھی ٹھیرے ہوئے تھے۔ اس وقت ان میں سے چند اپنے جانوروں کو مل رہے تھے۔ بعض کھانے پکا رہے تھے اور جو بیکار تھے وہ گا رہے تھے۔ ان لوگوں کا شور و غل میرے لیئے بلائے جان تھا۔ ناچار میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔

بیٹھے بیٹھے یوں ہی سی مجھے نیند آگئی۔ اتنے میں میرے رفیق نے مجھے آواز دی اور کہا کہ اے دوست آپنے آرام کر لیا ہے تو اُٹھو۔ آج کا راستہ بہت سخت ہے۔ آج تم سے گھوڑے کی پیٹھ پر نہیں بیٹھا جائیگا۔ اس لیئے مناسب ہے کہ چل پڑو تاکہ تمازت آفتاب محسوس ہونے سے پہلے ہم چوٹی پر پہنچ جائیں۔ میں نے فوراً اُس کی صلاح کو مان لیا۔ اور پاپیادہ چل پڑا۔ یہ

چڑھائی نہایت ہی دشوار تھی۔ اور جب میں اپنے ساتھ خچروں کو جو بھاری بوجھ سے لدی ہوئی تھیں۔ یہ رستہ طے کرتے دیکھتا تو مجھے حیرت آتی تھی۔ کیونکہ حالانکہ میں نے کوئی بوجھ اُٹھایا ہوا نہیں تھا پھر بھی بمشکل میرے قدم اُٹھتے تھے۔ رستے میں ہمیں آگے سے چند خچریں بوجھ سے لدی ہوئی ہماری طرف آتی ہوئی ملیں۔ اِن کے ساتھ جو اُنکے مالک تھے وہ شور و غل کر رہے تھے۔ اور اِس تنگ رستہ میں جو بمشکل دو بالشت چوڑا تھا۔ خچریں اِس طرح اُتر رہی تھیں کہ جیسے وہ خوب سدھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ اِس رستہ کے آس پاس ایک خوفناک عمیق غار تھی۔ اور مجھے ہر وقت یہی اندیشہ رہتا تھا کہ اب خچروں کے پاؤں پھسلے اور یہ غار میں غائب ہوئیں۔ مگر اِس قسم کا حادثہ کہیں شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ اگر کبھی اتفاقیہ ہوتا بھی ہے تو جاڑے میں۔ اور پھر بھی اِس صورت میں کہ جب دو قافلوں کی مڈبھیڑ آپس میں ہو جائے۔ اِس قسم کے حادثہ کا علاج یہ سوچا گیا ہے کہ خچروں کے گلے میں بڑے بڑے گھنٹے باندھ دیئے ہیں جو ہمیشہ بجتے رہتے ہیں۔ اِن گھنٹوں کی آواز سے قافلہ والے خبردار ہو کر رستہ چھوڑ دیتے ہیں۔

یہ چڑھائی چار گھنٹوں تک رہی۔ اِس رستہ سے بڑا شاہراہ تمام ایشیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن اِس سڑک کے بغیر آرمینیا اور ایران کے درمیان اور کوئی راہ ہی نہیں ہے۔ موسم تابستان میں لاکھوں خچریں اِس سڑک پر سے ایشیا کی پیداوار اور یورپ کے تجارتی مال سے لدی ہوئی گذرتی ہیں۔

جب ہم دوسری منزل پر پہنچے تو میرا خطاب آفندی میرے کام آیا اور مجھے اچھی جگہ مل گئی۔ سونے سے پہلے یہاں میرے رفیق نے مجھے صلاح دی کہ تمہیں جسم میں جہاں جہاں درد ہے۔ نمک آمیز پانی سے دھو ڈالو۔ میں نے اُسکے کہنے پر عمل کیا۔ پہلے تو مجھے اِس عمل سے سخت تکلیف ہوئی۔ مگر دوسرے دن

جب میں پھر گھوڑے پر سوار ہوا تو اگلی بے چینی معدوم تھی۔

۲۲ مئی کو ہم تیسری منزل پر پہنچے۔ یہاں ہمیں دو ارمنی ملے۔ اُن میں سے ایک نے پہلے فرانسیسی زبان میں اور پھر انگریزی زبان میں میرے ساتھ گفتگو شروع کی۔ یہہ شخص تبریز کا سوداگر تھا۔ کئی سال تک انگلستان میں رہ چکا تھا۔ اور اَب اپنے وطن کو جا رہا تھا۔ ہم دونو بہت جلد بے تکلف ہو گئے۔ اور اُس شخص کی صحبت میں مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی۔ کیونکہ یہہ اس رستے سے کہ جس میں ہمنے بہت عرصہ تک باہم سفر کرنا تھا بخوبی واقف تھا۔ تین دن کے بعد جب خوشاب بونار پہاڑوں کی اُترائی شروع ہوئی تو ہمیں رستہ میں ایک شیراز کا قافلہ ملا۔ اہل قافلہ نے لمبی لمبی ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اِن کی خچریں شیراز کی پیداوار سے لدی ہوئی تھیں۔ قافلہ والے اپنی خچروں کے آس پاس قدم قدم آ رہے تھے۔ اور قافلہ سالار خواجہ حافظ کی غزلیات گا رہا تھا یہ غزلیں پہلے ایرانی الفاظ تھے۔ جو میں نے اہل مُلک کی زبان سے سُنے۔ میں نے چاہا کہ اُن سے گفتگو کروں۔ مگر اُنہوں نے میری باتوں کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور اپنے سرود اور دُھن میں مست چلے گئے۔ پھر مجھے اپنے رفیق کی زبانی معلوم ہوا کہ خچریں راگ کی آواز سنکر خوش ہوتی ہیں۔ اور خوشی خوشی رستہ طے کرتی ہیں +

فصل پنجم

ارض روم سے سرحد ایران تک

۲۰ مئی کو ہم ارض روم میں وارد ہوئے۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ میں ایشیا میں آگیا ہوں۔ یہاں کے مکانات مشرقی طرز کے بنے ہوئے تھے۔ دیواریں مٹی اور اینٹوں کی تھیں۔ جن سے بجد اپن نمودار تھا۔ یوں تو بہت سی کھڑکیاں ان مکانوں میں تھیں۔ لیکن تمام بجائے بازار کے صحن مکان کی طرف کھلتی تھیں۔ ان مکانوں میں کئی چور دروازے اور اس قسم کے سامان موجود تھے۔ جو مشرقی عمارتوں میں دیکھے جاتے ہیں۔

ارض روم میں میں حسین دائم پاشا کا کہ جن کی قسطنطنیہ میں مجھ سے ملاقات ہو چکی تھی مہمان تھا۔ اس پاشا کے بیٹے کو میں نے فرانسیسی زبان اور مغربی علوم پڑھائے تھے۔ جب اس کو میں نے کہا کہ میں بخارا جا رہا ہوں تو وہ سخت متعجب ہوا۔ اور اس نے چاہا کہ مجھے کسی طرح اس ارادہ سے باز رکھے۔ لیکن میں نے نہ مانا۔ آخر کار اس نے مجھے ترکستان کے دارالخلافہ کے ذی رسوخ شیخوں کے نام خطوط دینے کا وعدہ کیا۔ یہاں میں نے کئی سرکاری اہلکاروں سے جو میرے قسطنطنیہ کے واقف تھے۔ ملاقات کی۔ ادر میں انکی ملاقات کے لیئے ان کے دفاتر میں گیا۔ ترکی گورنمنٹ کے دفتروں کی بیرونی صورت مجھے ہمیشہ یاد رہیگی

دروازہ پر بے انتہا جوتیاں - چھڑیاں - ہتھیار اور کتے دیکھنے میں آئے - اندر بھی وہی حالت تھی جو میں نے باہر دیکھی - چند میلی دریوں پر چند اہلکار بیٹھے ہوئے تھے - ایک کمرہ میں چند عورتیں جھگڑ رہی تھیں - ایک کمرہ میں ایک مسخرہ چند اہلکاروں سے مذاق کر رہا تھا - اور ایک کوٹھڑی میں ایک شخص نے شکایات کا دفتر کھولا ہوا تھا - جو ہنگام شکائت کبھی کبھی قسمیں کھانے لگ جاتا تھا -

ارض روم کے لوگ بہت غریب ہیں - یہاں کے بازار نہایت غلیظ ہیں - اور غریبی کے باعث لوگ تہ زمینی مکانوں میں رہتے ہیں - اُن کے کھانوں میں سخت بدبو آتی ہے - لکڑی کی جگہ یہ گوبر جلاتے ہیں[1] جس کی بدبو سے غشیاں کی نوبت پہنچ جاتی ہے - اور جسکو یہ لوگ "تزک" کہتے ہیں -

میں نے شکر کیا کہ جب میں اِس غلیظ شہر سے ۹ مئی کو اپنے ارمنی رفیق کے ساتھ نکل گیا - آدھی رات کے قریب گذری تھی کہ ہمیں کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی - اور ہم سمجھ گئے کہ ہم بستی کے قریب آپہنچے - میں جھاڑیوں اور خندقوں کو عبور کرتا ہوا اُن مکانات کی طرف گیا - جہاں سے روشنی نمودار تھی - میں آگے آگے تھا اور میرا رفیق میرے پیچھے تھا - اِس جگہ میری طرز گفتگو نے جو آفندیوں کی سی تھی میرا کام نکالا - اور ہم دونوں کو شب باشی کے لیئے مکان مل گیا - کیونکہ اُس وقت تمام باشندے سوئے ہوئے تھے - اِس گانوں کا نام کردچک تھا - اور جہاں ہم فروکش ہوئے - وہ اِس گانوں کے قزل یعنے نمبردار کا مکان تھا - یہاں کے مکان عجیب قسم کے تھے - عموماً ان میں ایک ہی کمرہ تھا - اور اِس کمرہ میں مرد عورتیں بچے اور مویشی بلاتمیز رہتے تھے - ہر کمرہ میں آس پاس مویشیوں کے لیئے جگہ بنی ہوئی تھی -

[1] غریب ہندوستان کی بھی یہی حالت ہے - جہاں بوجہ ارزاں ہونے کے گوبر جلایا جاتا ہے - بحالیکہ گوبر ملک کے کھیتوں کے لیئے بہترین کھاد ہے -

اور درمیانی سطح جو کسیقدر بلند تھی آدمیوں کے لیئے تھی۔ اِس بلند سطح کو وہاں کی زبان میں سکو کہتے ہیں۔ اگر یہہ کہا جائے کہ یہاں کے باشندے اصطبل میں رہتے ہیں تو بالکل ناموزون نہ ہوگا۔ خیال فرمائیے کہ جس شخص کو چالیس یا پچاس بھینسوں۔ چند بچھڑوں اور ایک گھوڑے کے پاس رات گذارنی پڑ جائے اُسکی طبیعت کیسی رہ سکتی ہے۔ ارض روم کے دیہات کے مکانوں میں ایک اور بڑی خرابی یہہ ہے کہ اُنمیں کھڑکیاں نہیں ہیں۔ انسان اُنمیں دم بخت ہو جاتا ہے۔ اور جب صبح کو باہر نکلتا ہے اور تر و تازہ ہوا میسر آتی ہے۔ تو خدا کا شکر بجا لاتا ہے۔

چار گھنٹے کے سفر کے بعد ہم "خن کیئ" میں پہنچے۔ یہ مقام ایک پہاڑ کے کونے پر واقعہ ہے۔ کرد لوگ اُن ایام میں بہت دق کیا کرتے تھے۔ اس لیئے یہاں سامان حرب موجود تھا۔ یہ لوگ دیہات پر تو حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ مگر راہ میں اِکے دکے مسافر کو نہیں چھوڑتے تھے۔ اور چھوٹے موٹے قافلے بھی اُن سے نہیں بچتے تھے۔ احتیاطاً ہم نے دو مسلح خواص اپنے ساتھ لے لیئے مجھے اپنا تو کچھہ فکر نہ تھا۔ لیکن اپنے ہمراہیوں کی خاطر جنکے پاس بیش قیمت زیور یا کھلونے تھے۔ اور جوہ یوروپ سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ مینے اُس فرمان سے فایدہ اُٹھایا جو ارض روم کے گورنر نے بہ حیثیت آفندی مجھے عطا کیا تھا۔

دریائے ارکسیس عبور کر کے ہم کردستان خاص میں آ پہنچے۔ اِس جگہہ کے باشندے ہیرو ڈوٹس[1] کے زمانہ سے مشہور قزاق اور لٹیرے

---

[1] ہیرو ڈوٹس ایک مشہور یونانی مورخ تھا جسکو "تاریخ کا باپ" کہتے ہیں۔ یہ ابھی نوجوان ہی تھا اور جس زمانہ میں کہ ظالم لیڈامس نے اُسکے وطن میں دست تظلم پھیلایا ہوا تھا اُس نے یونان۔ افریقہ۔ ایشیا اور یوروپ میں سفر کیا۔ اور مختلف ملک کے باشندوں کے

(دیکھو صفحہ ۴۷)

چلے آتے ہیں۔ راستہ میں ہمارے راہ نماؤں نے ہمکو ایک بلند چٹان دکھایا۔ اور کہا کہ اس چٹان کی چوٹی پر مشہور "کروگلو" رہا کرتا تھا۔ یہ شخص اہل اسلام کی نظم میں ایک مشہور شہسوار سمجھا گیا ہے۔ اور اُس کی مہموں اور ظفریابیوں کی حکایات ابتک ترکوں اور اناطولی وغیرہ کے باشندوں میں زبان زد خلایق ہیں ؞

اس جگہ جب ہمارا گذر اُس گھاٹی میں سے ہوا تو میرے ارمنی ہمراہیوں نے اپنی بندوقیں بھر لیں اور مجھے کہا کہ یہاں صرف کرد اور ارمنی رہتے ہیں۔ اس جگہ فرمان اور سفارشی خطوط محض بیکار ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ان لوگوں پر تمہارا رعب غالب آئے تو اُس کا ایک ہی علاج ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خوب مسلح ہو جاؤ۔

[illegible] اوضاع و اطوار اور رسوم معلوم کرتا گیا۔ کہ جن کو بعد میں اُس نے اپنی مشہور کتاب میں درج کیا ہے۔ واپس لوٹ کر اُس نے ظالم کے ہاتھ سے حکومت چھوڑانے میں مدد کی۔ لیکن اہل وطن کی ناشکر گذاری سے شکستہ دل ہو کر وہ اپنے ملک سے چلا گیا۔ اور اپنی عظیم تصنیف کے تیار کرنے میں مصروف رہا۔ ۴۴۵ سال قبل مسیح اس نے اسکا ابتدائی حصہ اپنے اہل وطن کو سنایا تو اُنہوں نے اسکو بہت پسند کیا۔ اسکی تاریخ نو حصوں میں مشتمل ہے۔ اور اسکا مضمون زیادہ تر یونانیوں کی اندرونی جد وجہد پر مشتمل ہے۔ لیکن اس نے بطریق تذکرہ ایرانیوں مصریوں وغیرہ دیگر ممالک کی تاریخ بھی لکھ دی ہے / درج کر دی ہے۔ زمانہ قدیم کے تمام مورخوں میں ہیروڈوٹس زیادہ معتبر سمجھا جاتا ہے۔ مقام ہیلی کارنیس میں ۴۸۴ سال قبل مسیح پیدا اور ۴۲۵ قبل مسیح فوت ہوا۔

سلہ اناطولی جو یونانی لفظ "اناطولیا" کی ایک صورت ہے۔ ترک ایشیا کوچک کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کے معنے طلوع آفتاب کے ہیں اور یہی معنی لیونٹ کے ہیں جو یورپین عموماً اس ملک کے مغربی ساحل کو نام دیتے ہیں۔ پانچویں صدی میں دوسری ایشیا کوچک کا نام دیا گیا تھا لیکن سولہویں صدی میں اناطولیا کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ایشیا کوچک بوجہ اپنی سرسبزی اور قدیم زمانہ سے مذہبی اور پولیٹیکل تاریخ کے لیے مشہور ملک ہے ؞

کردستان کے ایک گاؤں سے جس کا نام مشق الیاس تھا۔ ہم نے
دو راہ نما منگائے۔ اور علے الصباح ہم روانہ ہوئے۔ اتفاق سے اُس وقت
دُھند پھیلی ہوئی تھی۔ اور پہاڑوں کی چوٹیاں نظر نہ آتی تھیں۔ ہم نے
اپنے مویشی جن پر اسباب لدا ہوا تھا آگے بھیج دیئے۔ اور ہم ایک
پہاڑ کے دامن میں چائے تیار کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ جب ہم نے ایک ایک
دو دو پیالیاں چائے کی پی لیں تو ہماری سردی دور ہوئی۔ اور ہم گھوڑوں
پر سوار ہو کر آگے روانہ ہوئے۔ اس وقت سورج نکل آیا تھا۔ اور سورج کی
کرنوں نے دھند اور غبار کو منتشر کر دیا تھا۔ صبح کا سہانا سماں تھا
اور میں کوہسار میں یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ کہ میرے ایک ہمراہی نے پہلے
تو اُن مویشیوں کی طرف دیکھا جن پر اسباب لدا ہوا تھا۔ پھر اپنے ساتھیوں
کی طرف مضطرب ہو کر نگاہ کی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا خیر تو ہے؟ اُس نے زبان
سے کچھ جواب نہ دیا۔ صرف ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔ اور میں نے دیکھا کہ چاروں
طرف سے مسلح کُرد جن میں بعض تو گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور بعض پاپیادہ
تھے۔ مگر سب مسلح تھے ہمارے اسباب پر ٹوٹ پڑے۔ میرے ارمنی رفیق نے
جو یوروپ ہو آیا تھا۔ اور جس کا نام کربے گاف تھا۔ فوراً اپنی بندوق
پکڑ لی۔ اور اُن چوروں کی طرف جھپٹا۔ مگر میرا گھوڑا اس قسم کا مریل جانور
تھا کہ میں نے ہر چند کوشش کی مگر سب سے آخر وہاں پہنچا۔ اُس وقت میں نے
وہ پیتل کی تختی اپنی ترکی ٹوپی پر پہنی ہوئی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ
میں آفندی ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی کُرد جہاں تھے وہیں کھڑے ہو گئے۔ اور
میں نے کڑک کر کہا۔ "تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو"؟ یہ سن کر ایک بوڑھا
یک چشم کُرد جو ڈھال تلوار نیزے اور بندوق سے مسلح تھا۔ آگے بڑھا اور کہا بے آفندی[1] ہمارے

[1] بے آفندی یعنی آفندی صاحب بے ایگ کا مخفف ہے۔ مگر یہاں ان معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا۔

بیل آوارہ ہو گئے ہیں۔ اور ہم تمام رات سے اُنکو ڈھونڈھ رہے ہیں اگر آپنے کہیں رستہ میں دیکھے ہوں تو بتا دیجئے" میں نے اسی طرح کڑک کر جواب دیا۔ کہ مسلح ہو کر بیل ڈھونڈھ رہا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی سفید داڑھی اور یہ کرتوت اسے بے حیا قزاق۔ اگر تیری سفید داڑھی کا خیال نہ ہو تو ابھی پکڑ کر تجھے بایزیدؔ[1] کے قایم مقام کے پاس لیجاؤں +

یہ لوگ آرمینیوں اور ایرانیوں کی تو مطلق پروا نہیں کرتے لیکن سلطان کے اہلکاروں کو ہاتھ لگانا مناسب نہیں سمجھتے۔ جب انکو معلوم ہوا کہ میں سلطان کا اہلکار ہوں تو میری دہمکیاں کارگر ہوئیں۔ اور وہ آٹھ کرد جو مسلح ہو کر لوٹنے آئے تھے منتشر ہو گئے۔ راہ میں میرے ارمنی دوست میرے بہت مشکور ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ اگر آپ ساتھ نہ ہوتے تو یہ تمام سامان جو ہم یورپ سے ساتھ لائے تھے اُس وقت کُرد لیجا چکے تھے۔ ہمارے ساتھ چند ایرانی سوداگر بھی آملے تھے اُنکے چہرے کُردوں کو دیکھ کر زرد ہو گئے تھے۔ جب یہہ قافلہ میری حکمت عملی سے بچگیا تو اہل قافلہ سب میرے ممنون ہوئے۔ چنانچہ یہ ایرانی سوداگر تو شام کو کچھہ مٹھائی لیکر میرے پاس آئے۔ اِس وقوعہ سے مجھہ کو یہ ثابت ہو گیا کہ آفندی کا نام اِن لوگوں کے خیال میں ایک معمولی چیز نہیں ہے +

شام کو ہم ایک گاؤں میں جس کا نام ملا سلیمان تھا مقیم ہوئے یہاں کے تمام باشندے ارمنی تھے۔ جب ہمارے میزبان نے ہمارے کُرد راہنماؤں کو دیکھا تو مجھے علیحدہ لیجا کر کہا۔ "آفندی صاحب آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپکو کوئی نقصان اِن لوگوں کے ساتھ ہونے کے باعث نہیں پہنچا۔ جس

---

[1] بایزید سے مراد بایزید یلدرم سلطان ٹرکی سے ہے۔ جو بڑا زبردست بادشاہ اپنے وقت کا تھا۔ یلدرم ترکی زبان میں رعد کو کہتے ہیں۔ جس سے اُسکی طاقت اور انتظام کی سختی ظاہر ہے۔ بایزید کے قایم مقام سے مطلب سلطان وقت سے ہے۔

قافلہ کے ساتھ یہ لوگ آئے ہیں ضرور اِسکو چوروں سے لوٹا ہے۔ یہ سن کر میرا رہا سہا شک بھی دور ہوگیا۔ کہ یہ دونو راہ نما قزاقوں سے سازش رکھتے ہیں۔ اور اگر میرے دوستوں کے پاس بندوقیں اور میرے پاس آفندی کا نشان نہ ہوتا تو ہمارا بچنا بھی مشکل تھا۔ یہ وقوعہ کوئی انوکھا وقوعہ نہ تھا۔ حکام خوب جانتے ہیں کہ اکثر ڈاکے پڑتے ہیں۔ اور یہہ بھی جانتے ہیں۔ کہ کون ڈاکو ہیں۔ لیکن اُنھوں نے ہر ایک کو اُس کے حال پر چھوڑ رکھا ہے تاکہ اپنی ہمت سے اپنے آپ کو بچائے۔

ہمارے میزبان نے بڑے تکلف سے ہماری دعوت کی۔ لذیذ کھانے پکوائے اور موضع کے مولوی اور قاضی کو بھی مدعو کیا۔ اِس دعوت میں قزاقوں کی کہانیاں کثرت سے بیان ہوئیں۔ منجملہ اور کہانیوں کے جو وہاں بیان ہوئیں۔ ایک کہانی یہ بھی تھی کہ گذشتہ موسم خزاں میں وہاں سے ایک قافلہ گذرا۔ اِس قافلہ میں چالیس مویشی اور پندرہ آدمی تھے۔ اِن پندرہ آدمیوں میں ایک انگریز بھی تھا۔ جب قافلہ جائے معلوم پر پہنچا تو بارہ کرد قزاقوں نے معہ اپنے سردار کے قافلہ کو آگھیرا۔ جب ایرانیوں اور ترکوں نے کُردوں کی آواز سنی تو فرار ہوگئے۔ اِن کردوں کا قاعدہ ہے کہ جب آتے ہیں "لو لو" کے نعرے مارتے آتے ہیں۔ بیچارہ انگریز تنہا وہاں کھڑا رہگیا۔ جب چند مویشیوں کا اسباب اُتار چکے تو انگریز نے جو اس وقت تک چُپ چاپ کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ بندوق اُٹھا کر سب سے پہلے اِن قزاقوں کے افسر کو نشانہ بنایا۔ جو گولی لگتے ہی گر کر مرگیا۔ قزاق یہ حال دیکھ کر پہلے تو متعجب ہوئے۔ مگر پھر ہوش میں آکر تمام اُس انگریز کی طرف جھپٹے۔ انگریز نے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیئے۔ اور تین چار کُردوں کو اَور بھی نشانہ بندوق بنایا۔ اور بلند آواز سے کہا کہ خبردار! جو تم سے میرے قریب آئیگا۔ اُس کا یہی

حال ہوگا۔ اُس ایک انگریز کا خوف اُن کردوں پر اس قدر غالب آیا کہ سب وہاں سے کھسک گئے۔ پھر اُسکے سردار کے کنبہ نے خون بہا کا دعوے اُس انگریز پر دایر کیا۔ اور کہا کہ وہ سہواً اپنے آدمیوں کے شکار کھیل رہا تھا۔ کہ انگریز نے مار ڈالا۔ ترکوں نے اس دعوے کو سچا دعوے سمجھا۔ اور ضرور انگریز کے برخلاف ڈگری دیدیتے۔ اگر انگریزی سفیر دخل نہ دیتا۔

جب ہم اس مہمان نواز میزبان کے گھر سے روانہ ہوئے۔ تو سخت بارش ہو رہی تھی۔ اس لیئے رات ہم نے ایک گاؤں میں بسر کی۔ جس میں دس سے زیادہ گھر نہ تھے۔ بارش کے باعث ہم موضع دریادین تک نہیں جاسکتے تھے۔ اس لیئے وہیں قیام کیا۔ اس گاؤں کے باشندے عجیب قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انسان۔ حیوان۔ لکڑیاں اور اناج سب ایک چھت کے نیچے دیکھا۔ رات کے وقت نصف باشندے باری باری سے سوتے ہیں۔ اور باقی نصف چھت پر بیٹھ کر پہرہ دیتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا۔ کہ کیوں تم ارض روم کے گورنر کو نہیں کہتے کہ کچھ انتظام کرے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ گورنر خود چوروں کا سردار ہے۔ اگر کوئی شخص بجز خدا ہماری مدد کر سکتا ہے تو وہ شہنشاہ روس ہے۔

دریائے فرات سے ہم کشتی پر سوار ہو کر ایک معبد میں پہنچے۔ جہاں چند درویش تارک الدنیا و بدمعاش رہتے تھے۔ ان کی مسلمان اور عیسائی دونو یکساں عزت کرتے تھے۔ ممالک مشرق میں یہ ایک عجیب بات دیکھنے میں آتی ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی بلاتمیز مذہب عزت ہوتی ہے۔ اور اس قسم کے انسان جو اپنے آپ کو بزرگ اور خدا رسیدہ بیان کرتے ہیں۔ ہر جگہ عزت پاتے ہیں۔ گو وہ دور دور تک قزاقی اور لوٹ مار کرتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کے چال چلن حال نہیں ہوتے۔

شام کے قریب ہم وایا دین میں پہنچے۔ اور بڑی مشکل سے ہم کو رئیس موضع کے مکان کا پتہ ملا۔ جہاں ہم نے شب باش ہونا تھا۔ اس مکان میں میں نے ایک امریکہ کا پادری اُسکی بیوی بچہ اور بعض بیٹھے ہوئے دیکھے۔ یہ مقام "ارمیا" میں جو ایران میں واقع ہے رہا کرتے تھے۔ اور اب اپنے وطن "فلاڈلفیا" کو جا رہے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ کہاں ارمیا اور کہاں فلاڈلفیا۔ مگر پادری لوگ فاصلہ کی کچھ پرواہ نہیں کیا کرتے۔

قزل کردستان یعنے رئیس میرے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا۔ اور جب میں نے اُسکو کہا کہ میں رات کے لیئے جائے رہائش چاہتا ہوں تو اُسنے کہا بسر و چشم۔ لیکن صرف ایک کمرہ خالی ہے۔ جس میں ایک سپاہی پاشا اُترا ہوا ہے۔ اگر اُسمیں رات گذار لو تو حاضر ہے۔

میں نے کہا کہ کوئی ہو۔ مجھے کمرہ دکھا دو۔ دس گھنٹہ میں نے گھوڑے کی سواری کی ہے۔ میرے خیال میں اگر شیطان بھی اس قدر مشقت کرے تو اس کی بھی شیخی قایم نہیں رہ سکتی۔ اسکے علاوہ میں اجنبیوں سے ملکر ہمیشہ خوش ہوتا ہوں۔

کُرد نے ایک چراغ اُٹھا لیا۔ اور آگے آگے ہو کر ایک مال گودام کی شکل کے کمرہ میں مجھے لے گیا۔ اُس کمرہ میں میں نے ایک کونہ میں بجائے ایک اجنبی کے اپنے عزیز دوست جنرل کال مین کو جو مجری پاشا کے نام سے مشہور تھا بیٹھا ہوا پایا۔ ہم دونوں تپاک اور گرمجوشی سے ملے اور آگ کی انگیٹھی کے سامنے ہو بیٹھے۔ جنرل کال مین ہنگری کا ایک ذی رسوخ آدمی تھا۔ اور جن ایام میں میں روم میں تھا۔ اُس نے مجھے بہت فایدہ پہنچایا تھا۔ اُسکو معلوم تھا کہ میں کس مطلب کے لیئے سفر کرنے والا ہوں۔ اس لیئے وہ اس ملاقات سے بہت خوش ہوا۔ جو ہنگام رخصت

اتفاقیہ حاصل ہوگئی تھی آج کل وہ ٹرکی کے سرحد پر چند فوجی بارکوں کے ملاحظہ کے لیئے جو زیر تعمیر تھیں۔ آیا ہوا تھا۔ رات بڑی دیر تک ہم آپس میں باتیں کرتے رہے اور آخرکار میں سینہ پر پتھر رکھکر اپنے اس ہموطن دوست سے اور اسملک سے کہ جہاں میں نے کچھ حصّہ اپنی زندگی کا بسر کیا تھا۔ علی الصباح رخصت ہوا۔

فصل ششم

سرحد ایران سے تبریز تک

جب ہم سرحد ایران میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے جو گاؤں ہم کو ملتا ہے اُس کا نام قزل دیزہ تھا۔ اس گاؤں سے روانہ ہو کر ہم کوہ ارارات[1] کے دامن میں پہنچے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر موسم تابستان میں بھی برف جمی رہتی ہے۔ آجکل چونکہ جاڑے کا موسم تھا۔ یہ پہاڑ نصف سے زیادہ برف میں چھپا ہوا تھا۔ یہاں کے باشندوں نے مجھے یقین دلانا چاہا کہ نوح کی کشتی کے اجزا ابھی تک اس پہاڑ کی چوٹی پر موجود ہیں۔ بلکہ چند سن رسیدہ مذہبی پیشواؤں نے تو مجھے کہا کہ ہم اس پہاڑ کی چوٹی پر کی جھیل میں جس کا پانی بلور کی طرح شفاف ہے۔ اس کشتی کے تختے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے ہیں۔ بلکہ بعض نے تو مجھے اس کشتی کے ٹکڑے بھی دکھلائے

[1] کوہ ارارات علاقہ آرمینیا میں ایک پہاڑ ہے کہ جسپر بقول اہل اسلام اور نصارا کے حضرت نوح کی کشتی بعد طوفان آکر ٹھہری تھی۔ عرب اُسکو جبل جودی ایرانی کوہ نوح۔ ارمنی ماسیس یعنی کوہ کشتی اور ترک اگری داغ کہتے ہیں۔ کوہ مذکور کی شکل دور سے کشتی کی طرح نظر آتی ہے اور اسکے جوار میں بسنے والی سب قومیں اس مقام کی عزت کرتی ہیں۔ اس پہاڑ کی دو چوٹیاں ہیں ایک تخمیناً (۱۶۹۱۶) فیٹ اور دوسری (۱۳۰۸۰) فیٹ بلند ہے آتش فشاں پہاڑ ہے چنانچہ ۱۸۴۰ء میں اس سے بڑے بڑے گندھک کے ٹکڑے برآمد ہوئے اور سخت زلزلے آئے۔ پہاڑ پر ہمیشہ برف جمی رہتی ہے

اور کہا کہ یہ مقدس ٹکڑے سر درد قولنج اور آشوب چشم اور کئی اور بیماریوں کے لیئے حکمی علاج ہیں۔ اُن لوگوں کا اعتقاد یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ جو شخص اس بارہ میں شک کرے اُس کے وہ دشمن ہو جاتے ہیں۔ اِس میرے سفر میں مجھے چار ایسے مقامات سے گذرنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں کے باشندوں نے مجھے یقین دلایا کہ حضرت نوح کی کشتی طوفان کے بعد وہاں ٹھیری تھی۔

جب حدود ایران میں داخل ہوگئے تو میں نے دیکھا کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جلتے ہیں ملک زیادہ تر خوبصورت آتا جاتا ہے۔ گویا کہ قدرت خود ایرانیوں کے اِس دعوے کی کہ اُن کا ملک خلد بریں کا نمونہ ہے" تائید کرنے پر آمادہ ہے۔ میرے رفیق جو تمام ایرانی تھے مجھے کہنے لگے۔ "آفندی صاحب ملک ایران آپکے ملک سے بہت مختلف ہے ذرا بصیرت کی آنکھیں کھولو اور دیکھکر متعجب ہو" جس وقت ہم حدود ایران میں داخل ہوئے تو ایرانی مسافروں کی باچھیں کھل گئیں بیچارے ارض روم سے روانہ ہوکر راستہ کے ارمنی دیہات میں بہت تکلیف اٹھائی تھی۔ اہل تشیع کے پورے پورے مذہبی اعتقادات کے مطابق نہ صرف عیسائی ناپاک ہیں بلکہ وہ شئے بھی کہ جسکو عیسائی چھودیں نجس ہوجاتی ہے۔ اِس لیئے جو پکے شیعہ ہیں وہ اس چیز کو کہ جس کو عیسائی کا ہاتھ لگجائے نہیں کھاتے۔ خواہ بھوکوں کیوں نہ مر رہے ہیں*

ایران میں ہمنے موضع اوادجاک میں رات کو قیام کیا۔ اس جگہ چونکہ کافہ انام کا مذہب شیعہ ہے۔ اِس لیئے وہ ہر شئے کو جو سنیوں سے تعلق رکھے مکروہ سمجھتے ہیں۔ پس میں نے مناسب سمجھا کہ آپنے آفندی کے رتبہ کو بالائے طاق رکھکر آئندہ اپنے آپ کو آفندی نہ ظاہر کروں تعجب ہے

کہ سنی اور شیعہ دونو اسلام کے پیرو ہیں۔ پھر اُن کی آپس میں کیوں اس قدر عداوت ہے۔

۵۔ جون کو علے الصباح ہم پھر چل کھڑے ہوئے۔ اور چونکہ ہم نے اُس دن کدائین کے پہاڑوں میں سے گذرنا تھا۔ جہاں چوروں اور قزاقوں کا اندیشہ تھا۔ اِس لیئے میرے رفقا نے ایک دستہ مسلح محافظوں کا ہمراہ رکھنا مناسب سمجھا۔ ہماری خوش قسمتی سے راہ میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ اور بعد از دوپھر ہم جب منزلِ مقصود پر پہنچے تو ہماری فرودگاہ کے محاذ کے مکان سے رقص وسرود۔ بندوقوں کے چلنے اور قہقہہ کی آوازیں آنے لگیں۔ اُس مکان میں شادی کا اہتمام تھا۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا کہ کسی طرح میں بھی اِس جلسہ میں شریک ہو سکتا ہوں۔ اگر میں جاؤں تو انکو اعتراض تو نہ ہوگا۔ یہ کلمہ میرے مُنہ سے سُن کر میرے میزبان کا فرزند مجھے فوراً اُس مکان میں لے گیا۔ جس وقت ہم اُس مکان میں پہنچے تو اُسی وقت برات بھی دولہن کے مکان میں آئی۔ تاکہ دُلہن کو میکے سے سسرال لیجائے۔ جب برات آئی تو یکبارگی کئی بندوقوں کی شلاک ہوئی۔ یہ گویا برات کے آنے کی اطلاع تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دُلہن سُرخ نقاب چہرہ پر ڈالے اندر سے نکلی اور دو براتیوں نے اُسے گھوڑے پر جو اُسکے لیئے لایا گیا تھا سوار کیا۔ اگرچہ دُلہن کا لباس اتنا بھاری تھا کہ اُسکی تہوں میں اُلجھی جاتی تھی۔ مگر وہ اِس طرح پر زین پر ڈٹ کر بیٹھ گئی جیسے فن شہسواری میں مشاق لوگ بیٹھتے ہیں۔ پھر بہت سی عورتیں نکلیں اور دولہن کے گرد حلقہ باندھ کر گیت گانے لگیں۔ اِس گیت کا ماحصل یہ تھا کہ "اے خدا ہمارے دوست سلامت رہیں اور ہمارے دُشمن اندھے ہو جائیں"۔ تھوڑی دیر کے بعد

برات واپس دولھا کے گھر روانہ ہوئی۔ میں بھی برات کے ساتھ ساتھ تھا جب ہم دولھا کے مکان پر پہونچے تو مجھے بھی مسند پر عمدہ جگہ پر بٹھایا گیا۔ جب کھانا کھانے کا وقت آیا تو انہوں نے شادی کے تحفے تحائف دولھا کو دیئے۔ شادی کی رسومات بالکل اسی قسم کی تھیں جو ترکمانوں میں رائج ہیں۔

جب ہم کرائین سے روانہ ہوئے تو دو گھنٹہ راستہ طے کرنے کے بعد پہاڑ کے دروں میں سے ایک عجیب قسم کی ہولناک اور دہشتناک آواز سنائی دی۔ جب میرے ہمراہیوں نے یہ آواز سنی تو وہ فوراً کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی بندوقیں سنبھال لیں۔ لحظہ بلحظہ یہ آواز قریب ہوتی گئی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ایک خوبصورت بارہ سنگھا درہ کوہ سے نمودار ہوا۔ جو دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ اور اس کے تعاقب میں دو بھیڑیئے تھے۔ ایرانیوں کو شکار کا بہت شوق ہے اس بارہ سنگھے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور ایک نے آگے بڑھ کر ایسا تاک کر نشانہ لگایا کہ ادھر بندوق سر ہونے کی آواز آئی۔ ادھر وہ بارہ سنگھا بے جان ہو کر زمین پر گر پڑا۔ بندوق کی آواز سے بھیڑیئے ڈر کر بھاگ گئے۔ مگر پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک بھیڑیا شاید بھوک سے مجبور ہو کر یا اس غصہ سے کہ اس کا شکار ہاتھ سے جاتا رہا پھر اس جگہ آیا۔ جہاں ہرن گرا پڑا تھا۔ شکاری پہلے تو چپ کھڑا رہا۔ جب بھیڑیا ہرن کے قریب پہنچ گیا۔ تو اس کو بھی گولی مار کر مار دیا۔ اس شکار کے دستیاب ہونے سے ہم تمام بہت خوش ہوئے۔ ہم نے سواریوں سے اتر کر بارہ سنگھے کا چمڑا اتارا۔ اور اچھا اچھا گوشت لے کر کباب بھون لئے اور کھائے۔ باقی حصہ اس کا بھیڑیئے کی نعش کے پاس چھوڑ کر ہم روانہ ہو گئے

یورپ کے سیاح کو وہ مشہور مقام جو قلمرو سلطنت ایران میں سب سے پہلے ملتا ہے وہ "خوئے" ہے۔ مجھے اِس شہر کے بازار کو دیکھکر بہت تعجب ہوا۔ اِس جگہ وہ تمام ایشیائی شان و شوکت جو قدیم زمانہ کے لوازمات سے تھیں۔ اور جو سر زمین مغرب میں معدوم ہے۔ موجود تھے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جس شخص نے اِس شہر کے بازار میں بعد از دوپہر سیر کی ہے اُس وہاں کی بھیڑ۔ شور و غل۔ داد و ستد۔ خرید و فروخت۔ بیش بہا آرائشی اور تجارتی سامان۔ اور اشیاء خوردنی دیکھی ہیں۔ اُس کو ایشیائی صفات کے لحاظ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اِس شہر کا بازار استنبول کے بازار سے بڑھا ہوا ہے۔

جب میں پہلے پہل اُس بازار میں داخل ہوا تو عقل گئی۔ حیران رہ گیا اور میرا دل نہ چاہتا تھا کہ یہ عجیب و غریب نظارہ چھوڑ کر یہاں سے ہلوں۔ یہاں کا شور و غل اور گونج اور تماشہ اِس قسم کا تھا کہ اِس سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہنگام سیر میرا گذر ایک مکان میں ہوا۔ جس پر ایک گنبد تھا۔ اِسمیں چند برتن ساز دیگچیاں بنا رہے تھے۔ اور دیگ کوٹ رہے تھے۔ اِس شور و غل کے درمیان جس سے مغز کے پردے پھٹے جاتے تھے اُسی مکان کے ایک حصہ میں دو مدرسے تھے جنمیں اکثر سے طالب علم پڑھ رہے تھے۔ معلم ایک لمبی چھڑی جو ہر ایک طالبعلم تک پہنچ سکتی تھی۔ ہاتھ میں لئے بیچ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور اُس کے ارد گرد نصف دائرہ کی صورت میں طالب علم بیٹھے ہوئے گلے پھاڑ پھاڑ کر سبق یاد کر رہے تھے۔ میں اُن کے قریب گیا۔ اور میں نے چاہا کہ اُن کے الفاظ میری سمجھ میں آئیں۔ مگر خاک بھی سنائی نہ دیا۔ معلم اور شاگرد سب اُسی طرح بلند آواز سے چیخنے کے باعث اُنکے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ گردن کی رگیں

پھیلی ہوئی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُس وقت بجائے خود چند غضب آلود مُرغ ہیں۔ اُن لوگوں کا دعویٰ ہے کہ با وصف اس شور و غل کے اگر قرآن خوانی میں زیر زبر کی بھی غلطی ہو تو فوراً معلم کو معلوم ہو جاتی ہے۔ اور وہ غلط پڑھنے والے کو فوراً زجر و توبیخ کرتا ہے۔

جب بازار سے ہو کر میں کاروان سرائے میں گیا تو بہت خوش ہوا۔ عرب اور روم کی کاروان سرائے بہت غلیظ ہوتی ہیں۔ مگر ایران کی جہاں تک ایشیائی مذاق کو دخل ہے بہت مصفا اور ستھری ہوتی ہیں۔ ایران کی کاروان سرائے عموماً شہر کے مرکز میں ہوتی ہیں۔ یہ شکل میں مربع ہوتی ہیں۔ اور اس کے مختلف ضلعوں میں متعدد کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہوتی ہیں سرائے کا دروازہ بشکل دائرہ ہوتا ہے جو دروازے اور کھڑکی دونوں کا کام دیتا ہے۔ جب اس دروازہ سے داخل ہوتا ہوں تو ایک میدان یا چبوترہ ہوتا ہے۔ اس چبوترہ کے نیچے اصطبل ہوتا ہے۔ اور جو مسافر پہلی منزل میں مقیم ہوتے ہیں وہ ہر وقت اپنے گھوڑوں کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ یہ چبوترہ عموماً چار فیٹ اور بعض اوقات چھ فیٹ بلند ہوتا ہے۔ اس چبوترہ سے گذر کر صحن آتا ہے۔ جس کے وسط میں ایک کنواں ہوتا ہے اور کنوئیں کے گرد ایک مختصر سا باغیچہ ہوتا ہے۔ سرائے کی کوٹھڑیاں ٹھنڈی اور ہوادار ہوتی ہیں۔ اور رات کو یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوتا۔ سرائے کا دروازہ گنبد نما ہوتا ہے۔ اور دروازہ پر ایک شخص ہر وقت موجود رہتا ہے جسکو "دلندار" (یعنی محافظ در) کہتے ہیں۔ سرائے کا انتظام اُسی شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس شخص کو اس قسم کی قابلیت حاصل ہوتی ہے کہ مسافروں کے لباس وضع اور چہرے کے ساخت و ساخت سے یہ معلوم کر لیتا ہے کہ مسافر کس حیثیت اور رتبہ کا انسان ہے اور

اس کے رتبے کے بموجب اُس کو اُتارتا اور رفو کش کرتا ہے۔ رات کے وقت سرائے کی سقف پر سنتری پہرہ دیتے ہیں۔ اور تمام رات بلند آواز سے کہتے رہتے ہیں "خبردار رہنا۔ خبردار رہنا"۔ اس پہرہ کی وجہ سے کوئی چور وہاں نہیں آسکتا۔ اور بہت کم ایسا اتفاق ہوا ہے کہ کبھی کارواں سرائے میں چوری ہوئی ہو۔

۹ جون کو شام کے وقت ہم اس شہر سے روانہ ہوئے۔ شام کے وقت اسلئے روانہ ہوئے تاکہ دعوت (کرام بیرام[1]) عید رمضان کے باعث ہم ٹھیرائے جاویں۔ اس شہر سے روانہ ہو کر ہم حاجی آتما نام گاؤں میں جا کر ٹھیرے۔ اس گاؤں کے تمام باشندے سید ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی سیادت پر بڑا ناز ہے۔ اور مسافروں سے بڑی کبر اور نخوت سے پیش آتے ہیں۔ انکی بد دماغی اور انکی گستاخیاں برداشت کرنے کے لئے صبر ایوب درکار ہے ہر چند کہ یہ بڑے مالدار ہیں۔ مگر پھر بھی انکو مانگنے میں عار نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ خیرات نہیں لیتے۔ بلکہ ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم پیغمبر کی اولاد میں سے ہیں۔ اس لیئے ٹیکس وصول کرنا ہمارا حق ہے۔ ان کو دعویٰ ہے کہ ہم پاک ہیں اور اس دعوے کی آڑ میں بڑے بڑے جرم کر بیٹھتے ہیں اور کسی کو مجال نہیں ہوتی کہ ان سے باز پرس کرسکے۔ مگر حکام انکی رعایت چنداں ملحوظ نہیں رکھتے۔ ایک دفعہ حاکم تبریز نے ایک سید کی نسبت سرقہ کی علت میں یہ حکم صادر کیا کہ اسکو آگ میں ڈال دو۔ یہ حکم سُن کر مولویوں نے اعتراض کیا جس پر حاکم نے جواب دیا کہ اگر یہ سید ہے تو اس پر آگ اثر نہیں کریگی۔ یہ کہکر مجرم کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈلوا دیا۔

[1] ترکی زبان میں عید کو بیرام کہتے ہیں۔ عید رمضان کو ترک بڑی عید کہتے ہیں اور اسپر بڑی خوشی مناتے ہیں۔ بیرام کے لغوی معنے جشن ہے۔

فصل ہفتم

تبریز

تبریز[1] ایک بڑا پُرانا شہر ہے - اور کہتے ہیں کہ اسکو خلیفہ ہارون رشید کی چاہتی بیگم نے تعمیر کرایا تھا - وہ قدیمی شان و شوکت جو کسی زمانہ میں تبریز کو حاصل تھی اَب مفقود ہے - لیکن پھر بھی اِس کی تجارت اَب تک ویسی ہی رونق پر ہے جیسی کہ قدیم زمانہ میں تھی۔ شہر خیوے کے بازار کی شان و شوکت دیکھکر میں سخت متعجب ہوا تھا - لیکن تبریز میں آکر میں نے دیکھا کہ وہ بازار تبریز کے مقابلہ میں بالکل ہیچ تھا - تبریز کے بازار میں کثرت انبوہ خلائق سے شانے سے شانہ چھلتا تھا اور شور و غل اِس قدر تھا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی - چند لوگوں کے مشورے سے میں "امیر کاروانسرائے" میں جسکو میں نے ایک گھنٹہ کی تلاش کے بعد ڈہونڈا تھا - فروکش ہوا - میں گھوڑے پر سوار تھا - جس وقت میں اِس شور و غل اور جسم غفیر میں سے گذرا تو چونکہ میں اِس قسم کے شور و شغب اور ایسی بھیڑ سے گذرنے کا

---

[1] شہر تبریز یا طارس ایران کے صوبہ آذربائیجان کا ایک شہر ہے جو دریائے آجی کے قریب جنگل میں واقع اور شہر پناہ سے محصور ہے - شہر کا محیط ساڑھے تین میل ہے - ایران ہندوستان روس اور قسطنطنیہ کے مابین یہ تجارت کی بڑی بارونق منڈی ہے - ریشم اور روئی کے کپڑے کی بڑی تجارت ہوتی ہے - یہاں بڑے خوبصورت باغ اور بہت سی کاروانسرائیں ہیں۔

عادی نہیں تھا۔ ہر لحظہ مجھے یہی اندیشہ تھا کہ مبادا کوئی آدمی میرے گھوڑے کے نیچے دب کر کچلا نہ جائے۔ بازار میں کثرت کے ساتھ خچریں کھڑی تھیں۔ بھیڑ کے درمیان درویش رقص کر رہے تھے۔ اور عجیب قسم کے نعرے مار رہے تھے۔ اور اکثر وجد میں آکر اپنی تیز کلہاڑیاں آسمان کی طرف پھینک دیتے تھے۔ اور جب وہ نیچے گرنے لگتی تھیں تو بیشتر اسکے کہ وہ زمین پر آکر گریں دست سے انکو پکڑ لیتے تھے۔ اب جس وقت مجھے وہ وقت یاد آتا ہے تو میں متعجب ہوتا ہوں کہ میں کس طرح ان کلہاڑیوں سے بچکر "امیر کاروانسرائے" تک سلامت پہنچ گیا تھا۔

اس کاروان سرائے میں میرے اپنی رفقا نے ایک معمولی حیثیت کی کوٹھڑی میرے لئے کرایہ پر لی۔ اور چونکہ اب وہ منزل مقصود پر پہنچ گئے تھے تو وہ اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور کہتے گئے۔ کہ ہم پھر حاضر ہونگے۔ میں اس کوٹھڑی کے دروازہ پر سستانے اور تماشہ دیکھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ حسب رواج شہر تھوڑی دیر کے بعد بہت سے آدمی میرے اردگرد جمع ہو گئے کسی نے مجھے صراف سمجھکر دریافت کیا کہ کیا تمہارے پاس اشرفیاں ہیں اور کیا تم اُن کا تبادلہ کرنا چاہتے ہو۔ بعض نے مجھے سفارت طہران کا ایک رکن تصور کیا غرض مختلف قسم کے استفسارات کا جواب دیتے دیتے میں دق ہو گیا۔ کیونکہ نئے مسافروں کا کاروان سرائے میں یہی حال ہوتا ہے۔

تبریز میں میں نے دو ہفتے کامل قیام کیا میرا ارادہ تھا کہ یہاں رہکر سفر کا تکان بھی دور کروں اور شیعوں کے مذہبی حالات سے بھی کماحقہ آگہی حاصل کر لوں۔ میں مدت تک شیعوں کے درمیان رہا تھا اور ان کے حالات سے بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ اس لئے اہل تشیع کے حالات سے

اِن کا مقابلہ بدرستی کرسکنے کی مجھے خاصی سمجھ تھی۔

اس وقت تک میرا یہ خیال تھا کہ جس طرح عیسائیوں میں پراٹسٹنٹ[1] فرقہ ہے۔ اسی طرح اہل اسلام کے پراٹسٹنٹ شیعہ لوگ ہیں۔ مگر یہاں آکر میں نے دیکھا کہ جس قدر سخت تعصب اِن لوگوں میں تھا اور جس قدر تقدس کی یہ نمائش کرتے تھے اُس کا شائبہ کبھی میں نے نام نہاد تک بھی نہ دیکھا تھا۔ اِنکی سب سے زیادہ نامناسب بات جو مجھے سخت ناگوار گذری یہ تھی کہ یہ اہل یوروپ سے سخت نفرت کرتے ہیں اور اُن سے الگ رہنا چاہتے ہیں۔ اِنکی شریعت انہیں ہدایت کرتی ہے کہ اگر کسی ایرانی کے پیراہن کو بھی کسی فرنگی کا ہاتھ لگ جائے تو وہ ایرانی نجس ہو گیا اور پھر اسکا غسل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ بڑے پاک و صاف ہوتے ہیں۔ مگر ایک دن ایک بات کو دیکھ کر میرا یہ خیال بھی بالکل بدل گیا۔ اس کاروان سرائے[2] کے وسط میں ایک چھوٹا سا حوض تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک طرف اس حوض میں لوگ چمڑے دھو رہے تھے۔ ایک طرف میلے کچیلے کپڑے چند آدمی صاف کر رہے تھے۔ ایک جگہ ایک شخص اپنے لڑکے کو نہلا رہا تھا۔ ایک دوسری جگہ اسی حوض پر چند آدمی وضو کر رہے تھے۔ اور میں نے دیکھا کہ ایک شخص جو پیاسا

[1] پراٹسٹنٹ عیسائی مذہبی فرقوں میں سے ایک کا نام ہے۔ گو اسکا اطلاق عموماً رومن کیتھولک اور دوسرے مشرقی چرچوں کے باقی سب عیسائی فرقوں پر ہوتا ہے جو رومن کیتھولک عقائد کے پیرو نہیں جبکہ عیسائی مذہب کے مشہور مصلح مارٹن لوتھر نے جرمنی میں مذہبی اصلاح کا شور مچایا تو مقام سپائر کی مجلس میں حکام وقت نے اسکو اور اسکے پیروؤں کو بعض نئی بندیوں پر مجبور کیا۔ انہوں نے پروٹسٹ (Protestation) یعنی اعتراض کیا کہ مذہبی معاملات میں دنیاوی کونسلیں دخل پا گئیں کیا اسی سے انکا نام پروٹسٹنٹ ہو گیا۔ یہ لوگ رومن کیتھولک عیسائیوں کی بدعتوں کو نہیں مانتے۔

ہو گا وہاں آیا اور اس تالاب کا سبز پانی اُس نے اس طرح پیا جیسے وہ آب زلال تھا۔ یہ حال دیکھ کر مجھے نفرت سی آئی۔ ایک ایرانی میرے پاس کھڑا تھا۔ مجھے متنفر دیکھ کر کہنے لگا کہ معلوم ہوا تو شریعت سے واقف نہیں۔ اگر ایک سو بیس پیمانوں سے زیادہ پانی ہو تو وہ ناپاک نہیں ہو سکتا۔

ان کے تعصب کی ایک اور عجیب مثال بھی سُن لیجیے۔ ان ایام میں تبریز میں ایک درویش آیا ہوا تھا۔ جس کی لوگ بہت تعریف اور عزت کرتے تھے۔ اس درویش کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت رسالتمآب کی وفات کے بعد خلافت حضرت علیؓ آپ کے داماد کا حق تھا حضرت ابی بکرؓ کا حق نہ تھا۔ اس لیے اُس نے تیس سال سے قسم کھائی ہوئی تھی کہ بجز حضرت علیؓ کے نام کے اور کوئی کلمہ منہ سے نہ نکالے گا۔ چنانچہ وہ لوگوں کو جتانا چاہتا تھا کہ وہ حضرت علیؓ کا جو کہ فوت ہوئے ایک ہزار سال سے زیادہ ہو گئے ہیں، سچا عاشق ہے۔ ہر وقت وہ علی علی کے نعرے مارتا تھا۔ جب اُسکو بھوک لگتی تھی تو منہ سے علی علی کہتا تھا۔ جب خیرات مانگنی ہوتی تو علی علی پکارتا تھا۔ تمام دن یہ گلیوں میں ادھر اُدھر دوڑتا پھرتا تھا اور ہنگام تک وہ اپنی لاٹھی آسمان کیطرف پھینک کر پھر ہاتھوں پر سنبھالتا اور علی علی بلند آواز سے پکارتا جاتا تھا۔ لوگ اس درویش کی بہت عزت کرتے تھے۔ شہر کے ایک امیر نے اسکو ایک خوبصورت گھوڑا بلساز و سامان دیا۔ یہ فوراً گھوڑے پر سوار ہو گیا اور علی علی چیختا ہوا نظروں سے غائب ہو گیا۔ اُس کا لباس عموماً سفید یا سبز ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اُسکا عصا بھی اسی رنگ کا ہوتا تھا کہ جس رنگ کا اُس کا لباس ہوتا تھا۔ ایک دن یہ کاروان سرائے کے سامنے سے گذرا اور کاروان سرائے کے دروازہ پر

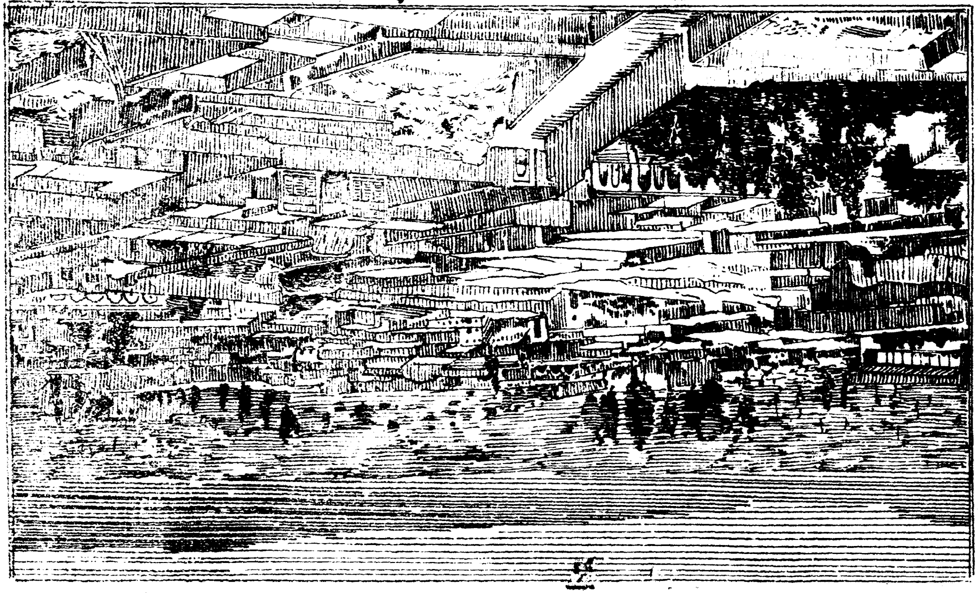

کھڑا ہو کر اُس نے اِس زور سے بازار کے معمولی شور و غل کے درمیان علی علی کے نعرے لگائے کہ اُسکی گردن اور سر کی رگیں اور نسیں رسیوں کی طرح اُبھری ہوئی دکھائی دینے لگیں۔

تبریز میں چند دن کے قیام سے مجھے معلوم ہوا کہ دراصل تبریز مشرقی شہر ہے۔ اور استنبول تو درحقیقت ایک بیجان نیم مغربی مجسمہ یا ایک تیز رنگ پر وہ مشرقی دنیا کا رہگیا ہے۔ چند دن کے قیام کے بعد جب میرے دل سے اِس شہر کا نیاپن جاتا رہا تو مجھے یوروپ یاد آگیا۔ اور بے اختیار اپنے وطن کو دیکھنے کے لیئے دل تڑپنے لگا۔ حسن اتفاق سے کارواں سرائے میں مجھے دو سوئٹزرلینڈ کے شرفاء مل گئے۔ اُنمیں سے ایک کا نام مسٹر ورتھ اور دوسرے کا مسٹر ہین ہرڈٹ تھا۔ اُنہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اُنکے پاس چل رہوں۔ مگر میں نے اُنکا شکریہ ادا کیا اور سرائے میں ہی رہنا مناسب سمجھا۔ البتہ کبھی کبھی اُنکے ساتھ کھانا کھا لیتا تھا۔ اِن دونوں کی بدولت میری اور چند اہل یوروپ سے بھی جو اِن ایام میں اِس شہر میں بھرے ہوئے تھے ملاقات ہوگئی۔ اور اِن لوگوں سے کسی مغربی زبان میں مختلف مغربی مضامین پر بحث کر کے میں بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ جبکہ تھوڑی دیر کے بعد میں فوراً ایرانی جماعتوں میں آفندی بنجاتا تھا۔ اِس طرح ایک دم بھر میں مغرب سے مشرق میں کوچ کر جانے سے مجھے عجیب فرحت محسوس ہوتی۔ چنانچہ استنبول میں اکثر اِس فرحت سے مستفید ہوا کرتا۔

ایرانی مجھے فرنگیوں سے اِس قدر مخلوط دیکھکر متعجب ہوتے تھے۔ مگر سنہ سمجھ نہ سکتے تھے۔ وہ سنی سمجھے ہوئے تھے اور جانتے تھے کہ سنی لوگ اِس قدر پرہیز غیر مذہب والوں سے نہیں کرتے جس قدر کہ شیعہ کرتے ہیں

اگر میرا کوئی یوروپین دوست مجھے ایرانیوں کے متعلق کوئی بات بتاتا تھا تو تاوقتیکہ میں مشرقی نگاہ سے اسکو خود نہ دیکھ لوں اُس پر اعتبار نہ کرتا۔ شاید بعض لوگ میرے اس دو بھیسا پن کو پسند نہ کریں۔ مگر میں اُنکو یقین دلاتا ہوں کہ یہی صفت میرے بہت کام آئی۔ اور اسی کی بدولت میں نے مشرقی باشندوں کے اندرونی حالات باسفورس سے لیکر سمرقند تک دریافت کئیے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ جس وقت گرم لو چل رہی تھی۔ میں اُسی کاروان سرائے میں بیٹھا ہوا چند درویشوں کے درمیان اپنے کپڑوں سے جوئیں چُن رہا تھا مشرق میں غریب مسافروں کے کپڑوں میں خواہ وہ کیسے ہی صاف ہیں ضرور جوئیں پڑ جاتی ہیں۔ اتنے میں دو انگریز کہ جنہوں نے ہندوستانی وضع کی یورپین ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں وہاں آئے۔ اور ان میں سے چھوٹے نے میری طرف دیکھکر کہا۔ " دیکھئے کس جوش کے ساتھ شکار کر رہا ہے" میں نے سر اُٹھا کر اُسکی طرف دیکھا اور کہا کہ آئیے اور آپ بھی شریک ہو جیئے۔ میرے مُنہ سے انگریزی زبان میں یہ کلمہ سُنکر وہ دونوں سخت متعجب بلکہ حیران ہوئے۔ اُنہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم نے انگریزی کہاں سیکھی تھی۔ اور تم کس قوم کے آدمی ہو؟ غرض ہر چند کہ اُنہوں نے مجھے اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا۔ مگر مینے سر اُٹھا کر بھی اُنکی طرف نہ دیکھا۔ بلکہ جھٹ اپنی کوٹھڑی میں گُھسکر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

اس بات کو کئی سال گذر گئے۔ پھر یوروپ میں پہنچکر ایک دفعہ ایک دعوت میں ایک انگریز امیر کے ہاں وائیٹ ہال میں مجھے اِن دونوں انگریزوں میں سے ایک شخص ملگیا۔ چونکہ مجھے تحقیق نہ تھا کہ یقیناً یہ وہی ہے جو مجھے تبریز میں ملا تھا اس لیئے مینے اُسکو نہ بلایا۔ جب کھانا کھا چکے تو مینے صاحب خانہ کی بیوی سے

جو میری زبان تھی درخواست کی کہ میری اِس جنٹلمین سے ملاقات کرا دو۔ لیڈی صاحبہ نے کہا آپ لارڈ آ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ نام تو میں نہیں جانتا مگر اُنکو شکل سے جانتا ہوں۔ جب لیڈی صاحبہ نے مجھے لارڈ موصوف کے پیش کیا تو وہ بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ مگر کہنے لگے کہ میں تم سے پہلے واقف نہیں ہوں۔ میں نے کہا۔ جناب عالی۔ آپ تبریز میں گئے تھے۔ کیا آپ اُس درویش کو بھول گئے۔ جو کاروان سرائے میں جوئیں چن رہا تھا جس نے آپ سے انگریزی میں گفتگو کرنی چاہی تھی۔ یہ سُن کر اُنہوں نے فوراً مجھے شناخت کر لیا اور یہ قصہ مہمانوں کے روبرو کیا۔ وہ سُن کر بہت متعجب اور محظوظ ہوئے۔

تبریز میں چونکہ چند یورپین بھی موجود تھے۔ اور سوائے اہل ایشیا کے میں اُن کی صحبت میں بھی رہتا تھا۔ اِس لیئے اِس شہر کا قیام مجھے کسی طرح دوبھر معلوم نہوا۔ اِن ایام میں یہاں ایک بڑا جشن ہوا۔ مظفر الدین میرزا[1] شاہ ایران کا بڑا بیٹا تھا۔ اُن ایام میں یہ ولیعہد سلطنت ہوا۔ اور پبلک طور پر اسکو خلعت ولیعہدی دیا گیا۔ یہ جشن کئی دن تک رہا۔ محل شاہی کے دروازے پر بھیڑ لگی رہتی تھی جس دن میں پہلی مرتبہ اعلیٰ کونک (شاہی محل) میں داخل ہوا۔ تو وہاں کی شان و شوکت دیکھ کر سخت متعجب ہوا۔ جہاں شان و شوکت اور غلاظت جاہ و جلال

[1] یہی شہزادہ آجکل ایران کے شاہ کجکلاہ ہیں۔ شاہ مظفر الدین شاہ ناصر الدین مستوفی کے بیٹے ۲۵ مارچ ۱۸۵۳ء کو پیدا ہوئے۔ ہر چند کہ شاہ ناصر الدین کے دوسرے بیٹے ہیں مگر یہ ولیعہد مقرر کیئے گئے۔ کیونکہ شاہان ایران اس باب میں مطلق العنان ہیں۔ یہ صوبہ آذربائیجان کے گورنر مقرر رہے اور مدت العمر اسی صوبہ پر حکمران رہے۔ ظل السلطان انکے بڑے بھائی اصفہان کے گورنر تھے۔ یکم مئی ۱۸۹۶ء کو شاہ ناصر الدین کے مقتول ہو جانے پر یہ تخت نشین ہوئے اور ۸ جون کو طہران اپنے پایۂ تخت میں داخل ہوئے۔ یہ فرانسیسی زبان بخوبی جانتے ہیں اور یورپین علوم اور فلسفہ میں باخبر ہیں۔ مگر اپنے ملک کی اصلاح میں ابھی انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

اور سکنت دوش بدوش موجود تھے۔ دیوان عام میں دروازہ کے سامنے بڑی بڑے اُمرا اور اعیان سلطنت بیٹھے تھے۔ اور خاص امراء کے حلقہ میں شہزادہ جسکی عمر نو سال کی تھی بیٹھا ہوا تھا۔ اُمرا کے لباس زرق برق تھے۔ مگر اُن کے چہرہ سے سنجیدگی اور مردانگی برس رہی تھی۔ اُنکے حرکات و سکنات اور نشست کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمکنت اور نمود کے فراز و نشیب سے بخوبی ماہر ہیں جو ایسے پبلک موقعوں پر دکھلانا پڑتا ہے۔ دربار کے گرد سیر باز (سپاہی) یورپین طرز کی وردیاں پہن کر دو قطاروں میں کھڑے تھے۔ البتہ اُنکے سروں پر ایرانی ٹوپیاں تھیں۔ اور اِن غیر ملکوں کی وردیوں میں وہ نہایت بے چین معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ میں ہنسی کو روک نہ سکا جب میں نے دیکھا کہ اِنکو یہ وردی پہننی نہ آتی تھی۔ کئی چیزیں اُنہوں نے اُلٹی پہنی ہوئی تہیں۔ اُنکی طرف صحن باغ میں لکڑی کے تخت پوشوں پر مصری مختلف قسم کی ایرانی مٹھائیاں اور شیرینی کھلے بڑے بڑے چوبی کشتیوں میں رکھے ہوئے تھے۔ یہ چیزیں تکمیل جشن کے لیئے ایران میں ضروری سمجھی جاتی ہیں۔

وسط میں تخت متمکن تھا جس پر ولیعہد کہ جس کا رنگ زرد تھا اور کمزور معلوم ہوتا تھا۔ آکر جلوس کیا۔ اور اُس وقت بڑے بڑے اُمرا اُس کے گرد حلقہ زن تھے۔ اُسکے تخت پر جلوس فرماتے ہی توپیں چلنے لگیں۔ اور فوجی باجے بجنے لگا۔ اِتنے میں شاہی سفیر خلعت لیکر وہاں نمودار ہوا۔ اور اُس نے خلعت ولیعہدی شہزادے کو پہنایا۔ پھر سفیر نے مرصع تمغہ "شیر خورشید[1]" لے کر شہزادہ ولیعہد کی چھاتی پر لگایا۔ جب یہ تمام رسومات ادا ہو چکیں تو سفیر نے ایک پردہ اُٹھا دیا۔ اور اُس پردے کے پیچھے شاہ جمجاہ ایران کی تصویر

[1] شیر خورشید ایران کا شاہی نشان ہے۔

کپڑے پر منقش تھی۔ جس وقت اس تصویر کے آگے سے پردہ اٹھا تو تمام دربار سرو قد کھڑا ہو گیا۔ نوجوان شہزادہ نے دوڑ کر اس تصویر کو بوسہ دیا۔ اسکے بعد فوراً اس تصویر پر پردہ ڈال دیا گیا۔

جس وقت شہزادہ تصویر کو بوسہ دیکر واپس آیا اور اس نے دوبارہ تخت پر جلوس فرمایا تو پھر توپوں کی شلک ہوئی۔ اور پھر باجے بجنے لگا ایک مقدس اور معزز منولوی نے روبرو آکر دعا دی اور فرمان شاہی کا زور سے اعلان کیا گیا۔ اور اخیر میں ایک نوجوان شاعر نے اس جشن کی تقریب میں ایک قصیدہ پڑھا۔ اس قصیدہ میں شاعر نے بیان کیا کہ شاہزادہ نازک گلاب کا پھول ہے۔ خورشید انور ہے۔ اور بحر حکومت و شرافت کا درِ شہوار ہے۔ اخیر میں اس نے کہا کہ یہ گوہر لائق تاج شاہنشہی ہے۔

اس قصیدے میں اس شاعر نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ شہزادہ شجاعت مجسم ہے۔ اسکی شمشیر آبدار کا ایک وار تمام سپاہ کو غارت کرنے کیلئے کافی ہے پہاڑ اسکو دیکھکر کانپتے ہیں اور اسکو خشمناک دیکھکر دریا خشک ہو جاتے ہیں۔ اس نوجوان شاعر کے پڑھنے کا طریق میرے لئے بالکل نیا تھا جو اسکے مبالغہ آمیز قصیدہ سے بھی بڑھ کر مجھے عجیب معلوم ہوا۔

اسکے بعد دربار برخاست ہوا۔ اور سب نے صحن باغ میں جا کر مٹھائی چکھی۔ جو بڑے بڑے طشتوں سے لیکر حاضرین میں تقسیم کیگئی۔ ساتھ ہی ساتھ دربار کا ایک افسر لوگوں کے حاضر ہونے کے لئے اپنی طرف سے انکا شکریہ ادا کرتا جاتا تھا۔

اس جشن کے خاتمہ پر شاہ اطالیہ کا سفیر مسی روٹی نامی جو چند چھپیس دوسرے اہلکاران سفارت خانہ کے تبریز سے گذر کر طہران کو جا رہا تھا

اور اِن ایام میں یہاں مقیم تھا۔ اُسکے استقبال کا جلسہ ہوا۔ اِن لوگوں کے آنے سے دربار تبریز اور نیز یورپین باشندوں میں بڑا چرچا ہوا۔ ایرانی اہلکار کہ جن کا افسر سردار عزیز خاں تھا۔ اِس سفیر کو اپنا تزک و احتشام دکھانا چاہتے تھے۔ کہ جسکے یہ بیحد مشتاق ہوتے ہیں۔ اور یورپین لوگ جو یہاں موجود تھے۔ وہ اٹلی کی مدد یار گورنمنٹ کے قایم مقام کو دیکھنے کے مشتاق تھے میں بھی اِن یورپین مسافروں کے ساتھ رسومات استقبال دیکھنے کو گیا۔ ماہ جون کا ایک گرم دِن تھا۔ اور شہر سے دو گھنٹوں کے راستہ کے فاصلہ پر یہ سفیر مقیم تھا۔ جب ہم سفیر کی فرودگاہ پر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ اراکین سفارت ابھی کپڑے ہی بدل رہے ہیں۔ اِس سفارت میں پچیس اشخاص شریک تھے۔ جنمیں بعض مدبران ملک بعض سپاہی۔ بعض سوداگر اور بعض محققان سائینس تھے۔ اِنکو کپڑے پہنتے بڑی دیر لگی۔ کیونکہ یہ ایرانیوں کے روبرو اپنے پوری فوق البھڑک لباس میں آنا چاہتے تھے۔ جب دوپہر کا وقت ہوا اور گرمی ناقابل برداشت ہوگئی تو یہ اراکین سفارت شاندار لباس میں شہر کے دروازہ میں داخل ہوئے اِنکی وردیاں زرق برق تھیں۔ اِنکی چھاتیوں پر مختلف طبقوں کے ستارے اور تمغے چمک رہے تھے۔ بیش بہا نیاموں میں تلواریں اِنکی کمر سے لٹک رہی تھیں اور اِنکی ٹوپیوں کے پر ہوا میں ہل رہے تھے۔ اہل یوروپ کو تو یہ تمام چیزیں بڑی شاندار معلوم ہوتی تھیں۔ مگر میں نے چاہا کہ دیکھوں تو سہی۔ ایرانیوں کی رائے اِنکی نسبت کیا ہے؟ چنانچہ میں اُن لوگوں کی بھیڑ میں ملگیا۔ تو سنا کہ وہ ہر چیز پر مذاق اُڑا رہے تھے۔ ہمارے یوروپ کے چھوٹے چھوٹے چست کوٹ اِنکی نگاہوں میں سخت معیوب معلوم ہوتے ہیں۔ وہ سادگی کے سخت مخالف ہیں۔ اِن لوگوں کے خیال میں زرق برق لباس۔ شوخ رنگ اور ڈھیلے

کپڑے قابل تعریف چیزیں ہیں چُست لباس کو جس سے تمام اعضا کا اندازہ معلوم ہو جائے۔ عموماً ایشیائی لوگ اپنے جھوٹے حجاب کی وجہ سے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اُنکے خیال میں خوبصورت لباس وہی ہے جو ڈھیلا ہو۔ اور جسکے تہیں ہر طرف کو لٹکے ہی ہوں۔ یہ لوگ فرنگیوں کے گھوڑے پر اکڑ کر سوار ہونے کی طرز کو بھی پسند نہیں کرتے۔ اور میرے خیال میں اعتراض اُنکا بجا ہے۔ فرنگی اکڑ کر اور چھاتی نکال کر گھوڑے پر اس طرح بیٹھتے ہیں۔ جیسے شکنجہ میں کسے ہوئے ہیں۔ مگر ایشیائی باشندے نہایت بے تکلف ہو کر سواری کرتے ہیں جس سے اُنکا رُعب بھی قایم رہتا ہے۔ اور وہ خوبصورت بھی معلوم ہوتے ہیں۔

اِن ارکین سفارت کو پہلے دن تو خوب ہی تکلیف ہوئی۔ دو گھنٹوں تک بیچاروں کو اِدھر اُدھر شہر میں ہر طرف پھرنا پڑا۔ تاکہ شہر کے باشندے اُن کو دیکھکر اشتیاق کو پورا کریں۔ جب گھنٹہ کی تگ و دو کے بعد وہ اپنی جائے قیام پر ٹھہرے تو تب بھی اُنہیں آرام نہ ملا۔ تین دن تک تو جہانوں کا تانتا لگا رہا۔ اُمرائے شہر اُنکی ملاقات کو خدمتگاروں کی پلٹنیں لے کر جاتے تھے۔ اور اُن خدمتگاروں کے سروں پر تحفے لاکر لاتے تھے۔ جو سفارت کی طرف سے اُنکو ملتے تھے۔

ان ایام میں تبریز سے بہت سے قافلے دار الخلافہ ایران کو جا رہے تھے۔ اور بہت سے وہاں سے اِدھر کو آ رہے تھے۔ اِسلیئے راہ میں کسی کا خوف وخطر نہ تھا۔ میں نے توکل بخدا تن تنہا دار الخلافہ تک سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک سریل سا ٹٹو معہ اُسکے مالک کے بہت سستا کرایہ پر لیا۔ اور اُسپر اپنا اسباب لاد کر تبریز کو خدا حافظ کہا۔

فصل ہشتم

زنجان میں

تبریز سے روانہ ہو کر دو دن کے بعد میں ایک گاؤں میں پہنچا جس کا نام ترکمان چای ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ صلحنامہ قرار پایا تھا۔ جس کے رو سے روس اور ایران کے درمیان ۱۸۲۷-۱۸۲۶ء کے جنگ کا خاتمہ ہوا تھا۔

اس گاؤں سے میں مقام میانی کو گیا۔ راہ میں کوئی بات ایسی نہ پیش آئی جو قابل بیان ہو۔ البتہ ایک کاروان سرائے میں ایک نرا معاملہ پیش آیا۔ راستہ میں شیعہ لوگ میرے پاس آتے تھے۔ اور مجھے سُنی سمجھکر مجھ سے تعویذ جن کو وہ "نسخہ" کہتے ہیں لیتے تھے۔ ایک دن ایک سید جو مذہب کا شیعہ تھا میرے پاس آیا۔ اور اُس نے مجھ سے تعویذ مانگا۔ میں نے فوراً ایک کاغذ پر چند آیات قرآنی لکھکر وہ کاغذ اُسکے حوالہ کیا۔ مگر اس کاغذ سے اُسکی تسلی نہ ہوئی۔ اور اُس نے مجھ سے تمباکو کی فرمائش کی۔ تبریز سے میرے دوستوں نے مجھے ایک قسم کا تیز تمباکو دیا تھا۔ میں نے اُس شخص کو کہا کہ سید صاحب تمباکو حاضر ہے۔ مگر میں ڈرتا ہوں تمکو اسکی عادت نہیں ہے۔ مبادا تم بیمار ہو جاؤ۔ اُس نے اصرار کیا اور میں نے تھوڑا سا تمباکو اُسکے حوالہ کیا۔ اُس نے تھوڑا سا اُسمیں سے چلم میں رکھکر اوپر آگ رکھی۔ اور دو تین دم حقہ کے لگائے آخر وہی بات

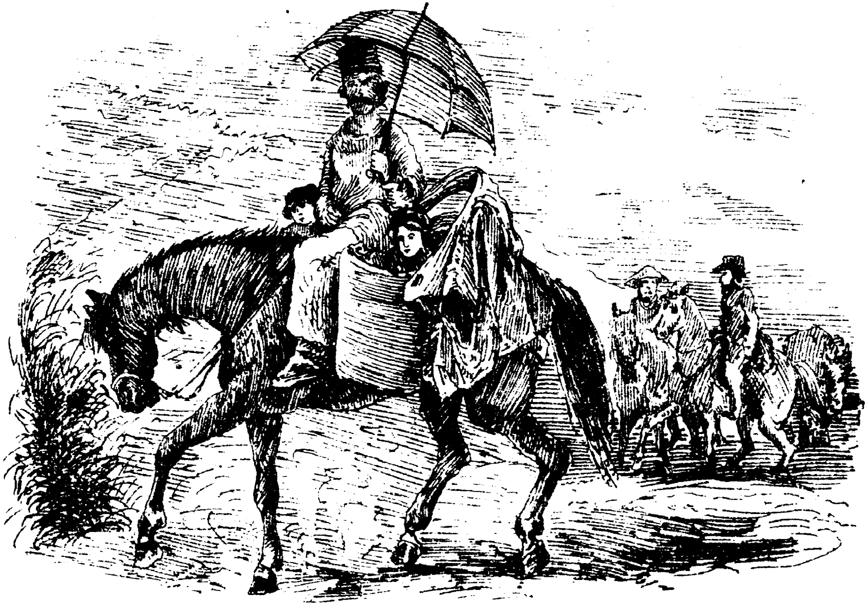

ایران میں سفر کرنا

ہوئی جس کا مجھے ڈر تھا۔ دم نکالتے ہی اُس شخص کا سر چکرانے لگا۔ رنگ زرد ہو گیا۔ اور بڑے زور سے استفراغ ہوا۔ پھر تو اس سید کے سر پر جن سوار ہو گیا۔ یہ شور و غل کرتا ہوا دوڑا کہ لوگو دوڑو۔ دوہائی ہے۔ مجھے سُنی نے زہر دے دیا ہے۔ میں اُس کے پیچھے دوڑا۔ اور جب میں اُس کے قریب پہنچا تو وہ اوندھا زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اور چند ایرانی اُس کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ اگر میں اپنی فصیح بیانی کے باعث اس وقت اُن لوگوں کو قائل نہ کرتا۔ اور اپنی بیگناہی اُن پر ثابت نہ کر دیتا تو بس میری شامت آگئی تھی۔

ابھی زنجان سے میں چند ہی گھنٹوں کے فاصلہ پر تھا۔ کہ راہ میں مجھے ایک ایرانی ملا۔ جو بڑا باتونی مگر صاحب علم شخص تھا۔ اُس نے نصف گھنٹہ کے عرصہ میں ہزارہا مختلف مضامین پر مجھ سے بحث کی۔ اور ہر چند کہ میں اُس کو نہیں جانتا تھا۔ مگر اُس نے مجھے آفندی کے نام سے مخاطب کیا۔ اُس نے مجھے آگاہ کیا کہ وہ طبیب ہے اور اپنے مریضوں کو دیکھ کر آرہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد حکیم صاحب کا خدمتگار ایک خچر لئے نمودار ہوا۔ بیچاری خچر بوجھ سے دبی جا رہی تھی۔ اُس پر خشک میوے اناج اور اسی قسم کی اشیا لدی تھیں جو حکیم صاحب نے اپنے بیماروں سے فیس یعنے نذرانہ کے طور پر وصول کی تھیں۔ یہ گو حکیم صاحب زیادہ تر یہی جتلاتے رہے کہ فلاں جگہ میں نے یہ علاج کیا۔ اور فلاں جاں بلب مریض کو میں نے اس طرح اچھا کیا۔ اور یورپین ڈاکٹروں کی گستاخی پر نہایت تعجب سے مجھے یہ بھی کہا کہ ان فرنگیوں کو دیکھو کہ بوعلی سینا کے گھر میں بھی علاج کے لیئے آجاتے ہیں بھلا اِن کو آتا کیا ہے۔ حکیم صاحب نے اپنے چند نہایت موثر تعویذوں اور عملوں کا ذکر مجھے سنایا کہ جن کے ذریعہ سے وہ گنگوں

جھڑ دل) اور اندھوں کو چنگا کرتے تھے اور آسیب زدوں سے جن نکالا کرتے تھے۔ جب میں شہر میں پہنچا تو اس باتونی حکیم کی تقریر سنتے سنتے واقعی میرا سر درد کرنے لگا تھا۔

جب میں شہر میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ شہر میں جابجا سیاہ علم نصب تھے۔ یہ ماہِ محرم کا پہلا عشرہ تھا جس میں اہل اسلام سوگ نشین رہتے ہیں۔ اور ہر قسم کی خوشی سے پرہیز کرتے ہیں۔ یہاں کے شیعہ لوگ تو ایک مہینہ پہلے سے ہی عزاداری میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ روزے رکھتے ہیں ماتم کرتے ہیں۔ اور تعزیہ داری و مرثیہ خوانی میں مشغول رہتے ہیں سیاہ علم گویا اس بات کی نشانی ہے کہ اس جگہ ماتم اور مرثیہ خوانی ہوتی ہے۔ ان ایام میں ایک مشہور مرثیہ خوان وہاں آیا ہوا تھا۔ جو علی اکبر کا مرثیہ بہت اچھا پڑھتا تھا مجھے تعزیہ داری دیکھنے کا ازحد شوق تھا۔ اس لئے میں از راہِ علائق کے ساتھ حاکم شہر کے محفل عزا میں پہنچا۔ وہاں جاکر میں نے دیکھا کہ ایک کمرہ کے وسط میں ایک چوبی چبوترہ بقدر دو گز بلند بنا ہوا ہے اور اس کے ارد گرد بلند علموں پر شیر اور چیتے کے چمڑے فولاد اور چمڑے کی ڈھالیں اور ننگی تلواریں آویزاں ہیں۔ بکثرت سیاہ علم کھڑے ہیں اور انکے بیچوں بیچ جا بجا چراغ بھی روشن ہیں۔ یہ چبوترہ ہے جس پر تعزیت کی جاتی تھی۔ اس صحن کے جانب راست عورتیں بیٹھی تھیں اور محاذ میں مرد جمع تھے۔ حاکم اور اس کا کنبہ دوسری منزل سے مجلس عزا کو دیکھ رہا تھا۔ درو دیوار سے ماتم برس رہا تھا اور لوگوں کے چہروں پر غم اور اُداسی چھائی ہوئی تھی۔

یہ تعزیہ داری ماتم حسین میں ہوتی ہے جسکی مختصر کیفیت یہاں بیان کرنی مناسب ہے۔ جب حضرت محمدؐ نے وفات پائی تو انہوں نے کسیکو اپنا جانشین

مقرر نہ کیا۔ اس لیئے اُنکے پیرو دو فریق میں منقسم ہوگئے۔ بڑے گروہ نے
حضرت ابو بکر صدیق کو خلیفہ بنانا چاہا۔ مگر چھوٹے گروہ نے حضرت علیؓ کو حقدار
سمجھا۔ وہ کہتے تھے کہ حضرت رسالت پناہ خود علیؓ کی شان میں فرمایا کرتے
تھے "لحمک لحمی ودمک دمی" لیکن چھوٹے گروہ کی پیش نہ گئی اور حضرت
ابو بکر صدیق خلیفہ بنائے گئے۔ حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے۔ اور حضرت
عمرؓ کے بعد حضرت عثمان کی باری آئی۔ حضرت علی کے پیرو پھر مایوس ہوگئے
اور حضرت عثمان کے بعد اُنکو خلیفہ بنایا گیا۔ حضرت علی نے بہت تھوڑا عرصہ خلافت
کی۔ اُنکے دشمنوں نے جنمیں حضرت رسالت پناہ کی بیوہ بھی تہیں اُنکو قتل کرڈالا۔
حضرت علیؓ نے چونکہ بہت سی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ اور اُنکا خاتمہ ایسا افسوسناک
ہوا تھا۔ اس لیئے اُنکے پیرو اور بھی زیادہ ہوگئے۔ یہانتک کہ اُنکو خلفائے
راشدین میں سب سے افضل سمجھنے لگے۔ حضرت علیؓ کے نو حرم تھے۔ مگر صرف حضرت
فاطمہؓ کا جو حضرت رسالت پناہ کی پیاری صاحبزادی تھیں نام لیا جاتا ہے۔
حضرت فاطمہؓ سے حضرت علیؓ کے ہاں دو بیٹے ہوئے تھے۔ اُنمیں ایک کا نام حسنؓ
اور دوسرے کا حسینؓ تھا۔ حضرت علی کی وفات پر اُنکے صاحبزادے حضرت
حسینؓ نے خلافت کا دعوے کیا۔ مگر یزید نے اُنکے دعوے کو تسلیم نہ کیا۔ اور
میدان کربلا میں جبکہ حضرت امام حسینؓ کا قافلہ مکہ سے کوفہ کو اہل کوفہ کی دعوت
پر کہ جو اُنکے طرفدار تھے جا رہا تھا۔ نہایت بیرحمی سے اُنکو اور اُنکے بچوں
کو شہید کیا۔ امام حسینؓ کے ہمراہ اُنکے وہ پیرو تھے جو مکہ کو ترک کرآئے تھے
دجلہ کے کناروں پر بیابان کے درمیان یزید کی بھیجی ہوئی فوجیں اُنپر آپڑیں
اور نہایت بیرحمی سے ان سب کو تہ تیغ کیا۔ اس شہادت کی یادگار میں ماہ محرم
میں ہر سال ایران میں بیشمار عزاداری کی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ اور غم والم
کے مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔

مجلس عزا سے پہلے ایک زرد رو اور لاغر اندام درویش جو بوجہ کثرت استعمال افیون کے ایسا نظر آتا تھا ممبر پہ آ کھڑا ہوا۔ اور پکار کر کہنے لگا "یا مومنین" اس کلمہ کے کہتے ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ پھر اس درویش نے ایک لمبی دعا کے بعد نامور شیعوں کے کمالات اور دلاوری کی تعریف اور بڑے مبالغہ کے ساتھ سنیوں کی شرارتوں اور گناہوں کی مذمت شروع کی۔ اور چند نامور سنیوں کا نام لیکر ایک جوش کے ساتھ جو دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اس نے کہا "بھائیو کیا ہمیں انپر لعنت نہیں کرنی چاہیئے" اور اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ۔ عمرؓ اور عثمانؓ سب کی شان میں تبرے کہے[له] بلکہ حضرت عائشہ کی شان میں بھی نازیبا الفاظ کہے۔ اور یزید اور معاویہ کی نسبت تو کوئی گالی باقی نہ چھوڑی۔ جس وقت یہ درویش کسی پر تبرہ کہتا تھا تو تمام حاضرین پکار کر کہتے تھے "بیش باد" تبرہ بازی کے بعد اس درویش نے شاہ ایران۔ علمائے ایران اور حاکم شہر کی صفت و ثنا کی اور پھر ممبر سے نیچے اتر آیا۔ اور اپنے جوش کے جلدو میں جو اس نے ظاہر کیا تھا حاضرین سے معقول صلہ فراہم کرنے لگا۔ اور اس درویش کی تقریر گو یا تمہید تھی۔ اس تقریر کے بعد مرثیہ خوانی شروع ہوئی۔ مرثیہ خوانوں نے سوز کے ساتھ اور تحت اللفظ آئمہ کے مصائب بیان کرنی شروع کیں تاکہ لوگوں کے دلوں کو اس ڈراما کے لیئے تیار کریں۔ جو عنقریب سٹیج پر کیا جانے والا تھا۔[عه]

اب امام حسینؓ چبوترہ پر تشریف لاتے ہیں۔ وہ بمعہ اپنے اہل و عیال اور ایک مختصر جماعت رفقائے باوفا کے کوفہ کو جاتے ہوئے عین دشت کربلا میں پہنچتے ہیں۔ تمام جماعت مارے پیاس کے بہت پریشان حال ہے۔ اور امام حسین اہل بیت کی پیاس کی مصیبت کو حوصلہ اور تسلی کے کلمات سے کم کر رہے ہیں۔ اسی اثنا میں

له یہاں مصنف کے پورے الفاظ کا ترجمہ مصلحتاً نظر انداز کیا گیا ہے۔ مترجم

عه معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں واقعہ کربلا ہو بہو ڈراما کے پیرایہ میں دکھلایا جاتا ہے۔

سٹیج کی پچھلی طرف سے ایک سخت بلند ہوتا ہے جس پر یزید امام حسینؑ کا دشمن بڑے جاہ و جلال میں بیٹھا ہوا حضرت حسین اور اُنکے ہمراہیوں کی نسبت اپنے جنگجو اور زرہ پوش پیرووں میں سخت بیرحمانہ احکام جاری کر رہا ہے۔ علی اکبر امام حسین کے سب سے چھوٹے صاحبزادے اپنے والدین بھائیوں اور بہنوں کو پیاس کے مارے تڑپتے ہوئے دیکھکر دجلہ سے اُنکے لیئے پانی لانے کا عزم کر لیتے ہیں۔ ہرچند کہ وہ واقف ہیں کہ دشمن چار طرف کمین میں ہے۔ اُنکے والدین اور عزیز و اقربا اِس عزم سے باز رکھنے کے لیئے اُنہیں نہایت دردناک اور محبت آمیز پیرایہ میں سمجھاتے ہیں۔ ماں کے نالہ و بکا کی آوازوں اور باپ کی التجاؤں میں واقعی کچھہ دردناک اثر محسوس ہوتا ہے۔ اور امام حسین اور اُنکی مختصر سی جماعت کی سسکیاں بوجہ اردگرد کے ہمدردانہ شور و شین کے بمشکل سنی جا سکتی ہیں۔ خصوصاً عورتیں ایسا سخت روتی ہیں کہ میں اِس خوبصورت اور رقت پیدا کرنے والی گفتگو کے الفاظ صرف کہیں کہیں سے سُن سکا۔ مگر علی اکبر اپنے عزم میں مستقل رہتا ہے۔ والدہ کو غش آجاتا ہے۔ مگر تھوڑی دیر میں افاقہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی دلاوری دیکھنا چاہتی ہے۔ اور اُسکی سلامتی کے لیئے دعا کرتی ہے۔ امام حسینؑ خود اپنے بیٹے کی کمر میں شمشیر باندھتے ہیں۔ اور وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ اور دو تین مرتبہ اُس چبوترہ کے گرد چکر لگاتا ہے۔ فوراً یزید کی فوج کا ایک زبردست جنگجو اُس کا تعاقب کرتا ہے۔ جوں جوں دشمن قریب آتا جاتا ہے جوش حیرت اور دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ آخرکار بہادر امام زادہ قابو آ جاتا ہے۔ اور اُس پر متواتر وار ہونے لگتے ہیں۔ علی اکبر کا خون کئی زخموں سے بہنے لگتا ہے۔ اہل بیت اور امام زادہ کے ہمراہیوں کی جماعت سے جو دور سے اِس افسوس ناک انجام کو کلیجے تھامے ہوئے دیکھتے ہوتے ہیں۔ نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ وہ مین

گر پڑتا ہے۔ اور نیم مردہ جسم کو چبوترہ کے سامنے کیجانب اٹھا لیجاتے ہیں
اُس وقت جبکہ باپ ماں بھینیں اور بھائی بلند آواز سے ماتم کرتے ہوئے
ناشاد نوجوان کے گرد جمع ہو کر اسکے کھلے ہوئے زخموں پر بجائے مرہم کے
آنسو بہاتے ہیں۔ حاضرین کا واویلا ماتم اور چیخ پکار انتہا درجہ تک پہنچ
جاتی ہیں۔ عورتیں سینہ کوبی کرتی ہیں۔ اور ہر شخص ماتم کے لحاظ سے بجائے خاکستر کے
خاک اور خس و خاشاک اپنے سروں پر ڈال لیتا ہے۔ ناظرین اس حیرت انگیز
نظارہ کو دیکھکر اس قدر از خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ مجھے شک ہے کہ یوروپ
میں کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا ٹریجیڈی (دردناک فسانہ) کا کھیل کرنیوالا
بھی حاضرین پر اس سے زیادہ اثر پیدا کر سکے۔ جب امام حسین اپنے لخت جگر
کو حالت نزع میں دیکھتے ہیں تو انکی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ اور وہ
حالت خشم میں سوار ہو کر خود دشمنوں کے مقابلہ کو جاتے ہیں۔ لیکن بہت
سے دشمن دفعتاً انپر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور شمر جو یزید کے طرفداروں میں
سے ہوتا ہے انہیں شہید کر دیتا ہے۔ جب امام حسینؑ کا جنازہ عزاداروں
کے درمیان رکھا جاتا ہے تو طرفۃ العین میں از سر نو کہرام مچ جاتا ہے حسینؑ
کا لاشہ انکے مظلوم پسر کی لاش کے پاس رکھدیتے ہیں۔ اور انپر سیاہ دوشالے
ڈال دیتے ہیں۔ اس کے بعد کشت و خوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور
خاندان امام حسین کا ہر ایک رکن شہید کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا دردناک
نظارہ ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ تماشہ گاہ کی فرش پر جدہر
دیکھو بجز لاشوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ نعشوں کا نظارہ اس ٹریجیڈی کا آخری سین ہوتا ہے۔
اس کے بعد ایک اور ڈراما دکھلایا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم اپنے بیٹے اسحاق[۵۱]

[۵۱] بعض مقامات میں عیسائیوں اور مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں اختلاف ہے۔ انمیں سے ایک یہ قصہ بھی ہے
کہ عیسائیوں کے مذہب کے رو سے حضرت ابراہیم اسحاق کو ذبح کرنے لگے اور مسلمانوں کے مذہب کے

(دیکھو صفحہ ۷۹)

کو قربانی کے لیئے ذبح کرنے کا قصد کرتے ہیں۔ یہ ڈراما بھی نقل کو اصل بنا کر دکھلایا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوتا ہے کہ تم اپنے فرزند کو راہ حق میں ذبح کرو۔ وہ حکم ایزدی کے بموجب لڑکے کو پہلے گلے سے لگاتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں اور پھر اُسے پچھاڑ کر اُسکے سینہ پر سوار ہو کر تلوار سے ذبح کرنے لگتے ہیں کہ خدا کا فرشتہ دو بکری کے بچے لیکر حاضر ہو جاتا ہے۔ اسحاق مذبح سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور حضرت ابراہیم اُسکے بجائے دونوں بزغالے ذبح کر دیتے ہیں۔ اِس نظارہ کو دیکھکر لوگ بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور قہقہے لگاتے ہیں۔ میں خصوصاً اِن نقل کرنے والے بچوں کی متانت اور پھرتی سے بہت حیران ہوتا تھا۔ کیونکہ بعض اُنمیں سے چھ سال سے زیادہ نہیں تھے۔ مگر اپنے اپنے پارٹ جو دو دو سو سطر سے کم نہیں ہوتے تھے بخوبی ازبر رکھتے تھے۔ اُن کے ہو بہو نقل اوتارنے کی لیاقت اور حرکات غیر معمولی تھیں۔ سب ایکٹر اپنے اپنے پارٹ خصوصاً ماتمی حصّے بڑی خوبی اور ایسی خوش الحانی سے بولتے ہیں کہ نہایت نازک کان اور نہایت درجہ کی نکتہ چین طبیعت بھی اُنکے سُننے سے مطمئن ہو جاتی ہے۔

محفل تعزیت کے یہہ اور اِسی قبیل کے دیگر مضامین ہوتے ہیں البتہ اُنکے ایکٹ کرنے کے طریقہ میں عموماً فرق ہوتا ہے۔ جو اُس شخص کی حیثیت کے مطابق کیا جاتا ہے کہ جس کے خرچ سے یہہ پرفارمنس (نقل) ہوتی ہے بہترین تعزیت کی محفل میں نے دربار ایران کی دیکھی ہے کہ جس میں سوائے اراکین سفارت ٹرکی کے حسب دستور اجنبیوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ چونکہ میں ٹرکی سفارت میں مہمان تھا میں بھی اُنکے ہمراہ گیا۔ اور جو ٹرکی احتشام

ردے اسمعیل کو جبکہ خدائے تعالیٰ نے بزغالہ بھیجا۔ جو حضرت ابراہیم نے ذبح کر دیا مُصنف کتاب کو چونکہ عیسائیوں کا قصہ معلوم ہے اُسنے ایرانیوں کے متعلق اُسی کو دُہرا دیا ہے۔ مترجم

جہاں دیکھا وہ مجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔ تمام ایکٹروں نے بیش بہا شالیں اور دوشالے اوڑھے ہوئے تھے۔ اون کے بازوؤں پر سچے ہیرے اور الماس چمک رہے تھے اور اوسکی تلواروں کے قبضے یا تو مرصع اور یا چاندی سونے کے بنے ہوئے تھے۔ یہہ لوگ پوری پوری نقل اُتارتے تھے۔ گویا کہ ہو بہو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یزید بذاتہ سامنے بیٹھا ہے۔ البتہ اتنی کمی ہوتی ہے کہ جس سے نظاروں کے غیر اصلی ہونے کا پتہ لگ جاتا ہے۔ کہ تمام زنانہ پارٹ بھی مرد ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ شرع اسلام کے رو سے عورتیں پردے سے باہر نہیں آسکتیں ؛

فصل نہم

قزوین سے طہران تک

زنجان سے چلکر میں نے قزوین کا قصد کیا۔ قزوین کسی زمانہ میں ایران کا پایۂ تخت تھا۔ مگر اب اس قدیمی شان و شوکت کا نام و نشان تک بھی باقی نہیں رہا۔ البتہ شہر کے اردگرد جو خوبصورت باغات ہیں وہ قابل دید ہیں۔ اور ان باغات کے نظارہ میں میں ایسا محو ہوا کہ رات کو شہر میں داخل ہوا۔ اور کاروان سرائے میں فروکش ہوا۔ میں نے اپنا اسباب کوٹھڑی میں بند کیا۔ اور کھانا لینے بازار کو گیا۔ مگر بازار میں جاکر دیکھا کہ تمام دوکانیں بند تھیں۔ آدھ گھنٹہ کی بیفائدہ جستجو کے بعد دن بھر کی تکان اور ماندگی سے مجبور ہوکر میں اپنے حجرہ کو لوٹ آیا۔ ہرچند میں نے دریافت کیا کہ کہیں سے مجھے روٹی ملے مگر جواب ملتا کہ کل امام حسینؑ کی شہادت کا دن ہے شیعہ سچے مسلمان ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ اس دن کاروبار کریں کہ جسدن امام حسینؑ اور انکی اہلبیت نے اس قدر مصیبت سہی۔ جب میں نے دیکھا کہ کہیں سے روٹی نہیں ملسکتی تو ناچار مانگ کر آتش شکم کو فرو کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ دیکھا۔ لیکن یہ ایرانی ایسے بخیل ہوتے ہیں کہ انکی خیرات سے مسافر کا پیٹ بھرنا ممکن نہیں ہے۔ دوسرے دن ایک شخص سے جو دوکاندار تھا میں نے یہ اقرار کرکے کہ یہ راز افشا نہ ہوگا تھوڑی سی روٹی اور تھوڑا خشک

خریدا۔ اور کارواں سرائے کی طرف روانہ ہوا۔ پھر میں نے اپنے رفیق کو کہا کہ اس شہر سے جلدی چل دینا چاہیئے۔ ابھی ہم شہر کے دروازہ کے پاس نہ پہنچے تھے کہ ہم کو راہ میں ایک جنازہ ملا۔ جسکے ساتھ بہت سے عزادار گریہ کر رہے تھے۔ بعض دیوانہ وار چیختے چلاتے اور کودتے تھے۔ بعض اپنی ایسی سینہ کوبی کرتے تھے کہ بدن سے خون جاری تھا۔ اور بعض واقعی چھریوں سے جسم پر زخم لگا رہے تھے تاکہ خون بہتا دیکھکر ناظرین کے دل پر اثر ہو۔ لفظ ان پرجوش واقعات کو پورے طور پر ادا نہیں کر سکتے جو آج کے دن ایران کے ہر شہر میں اسی قبیل سے نظر آتے ہیں۔ میں یہ دیوانگی کے آثار دیکھکر ایک طرف ہو گیا۔ اور جب یہ فرضی جنازہ وہاں سے نکل گیا۔ اور میں گوشہ میں سے کہ جہاں چھپ گیا تھا باہر آیا۔ تو میرے رفیق نے مجھے بتایا کہ قزوین (مومن قزوین جیسا کہ اُس نے کہا تھا) کو ایران کے دیگر شہروں کی نسبت یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں ہر سال ایک دو آدمی شدت غم و الم کے باعث امام حسینؓ کا ماتم کرتے ہوئے جان دیدیتے ہیں۔ مجھے اس بات کا فوراً یقین آگیا۔ کیونکہ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ کیونکہ عشرہ محرم کے روز جو نظارے یہاں پیش آتے ہیں اُن سے ہندوؤں کے مذہبی جوش میں اپنی جان دیدیتے اور مصر میں عید میلاد کے دن بعض آدمیوں کے مسجد کے سامنے لیٹ جاتے اور سجادہ نشین کے گھوڑے کے سموں کے نیچے روندے جانے کے واقعات آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔[۱]

[۱] میں نے خود تو مصر میں یہ کیفیت نہیں دیکھی لیکن بعض انگریزی کتابوں میں نظر سے گذرا ہے کہ مولد النبی کی تقریب میں قاہرہ کے فرقہ سعدیہ کے درویشوں کا شیخ احمد بنا زجمعہ گھوڑے پر سوار ہو کر پچاس ساٹھ درویشوں کی پیٹھوں پر سے (جو سامنے لیٹ جاتے ہیں) گھوڑے سمیت گذر جاتا ہے اور درویشوں کو ذرہ صدمہ نہیں پہنچتا۔ کتاب ماڈرن مصر کے صفحہ ۲۴۴ پر مفصل کیفیت درج ہے +

چونکہ گرمی نہایت سخت تھی۔ ہم نے رات کو سفر کرنا مناسب سمجھا۔ اور خوش قسمتی سے آجکل راتیں بھی چاندنی تھیں۔ صرف [illegible] کے سفر میں مجھے اتنا اعتراض تھا کہ راہ میں کوئی اور مسافر نہیں ملتا تھا۔ کبھی اتفاق سے اکا دکا مسافر یا کوئی چھوٹا موٹا کارواں طہران سے لوٹتا ہوا مل جاتا تھا ورنہ ہمیں کوئی ہمراہی نہیں ملتا تھا۔ اور ہم یکہ و تنہا سفر کرتے تھے۔ تیسری رات کو راہ میں میں نے عجیب قسم کی آوازیں سنیں۔ اور پھر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز مجھے سنائی دی۔ اور چند منٹ کے بعد تین سوار مجھے دکھلائی دیئے میں نے فوراً پستول پکڑ لیا۔ اور بلند آواز سے کہا۔ کہ خبردار جو آگے آئے ابھی پستول داغ دوں گا۔ شاید میری غیر زبان کے باعث یا میرے عجیب لباس کو دیکھ کر جو ان سے مختلف تھا۔ یہ تینوں سوار بھاگ گئے میرے رفیق نے اس وقوعہ کو مسخرہ سمجھا۔ مگر میں نہایت مضطرب ہوا۔ اور جب میں نے سنا کہ دوسرے دن شام کو ہم طہران میں پہنچ جاوینگے تو میرے دم میں دم آیا۔

میں بہت سے خطوط استنبول سے اپنے ساتھ حیدر آفندی سفیر روم متعینہ ایران کے نام لایا تھا۔ ان خطوں میں لکھا ہوا تھا کہ حامل رقعہ ایک عجیب آدمی ہے اور محض سیر و سیاحت کے شوق میں آرام چھوڑ کر ایران کے جنگلوں میں بادیہ پیمائی کرنے آیا ہے۔ بعض خطوں میں یہ بھی ذکر تھا کہ زبان سیکھنے کے شوق میں یہ شخص مشرقی ملکوں میں پھر رہا ہے۔ بہرحال ان خطوں سے حیدر آفندی کی بخوبی تشفی ہو جاتی تھی کہ میں تدابیر ملک میں دخل دینے والا آدمی نہیں ہوں۔ حیدر آفندی ایک نہایت صاف باطن اور خلیق انسان تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ اس کے ہاں میں آرام سے فروکش ہوں گا۔

میں انھیں خیالات میں محو ایک چشمہ کے کنارے پر پہنچا۔ جس کو وہاں کے لوگ کرش کہتے تھے۔ یہاں آکر میں نے دیکھا کہ بہت سے مسافر وضو کر رہے ہیں اور بعض نماز میں مشغول ہیں۔ میں جانتا تھا کہ دن کو سخت گرمی ہوتی ہے۔ اس لیے میں بہت جلد طہران پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اس چشمہ میں غسل کیا۔ اور ہرچند کہ میرا رفیق منع کرتا رہا میں گھوڑے پر سوار ہو کر طہران کی طرف روانہ ہو گیا۔ راہ میں مینے کئی بار اپنے رفیق سے پوچھا کہ ابھی طہران کہاں ہے۔ ہر مرتبہ اس نے انگلی سے اشارہ کرکے یہی جواب دیا کہ وہ دیکھو۔ مینے ہرچند دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر مجھے طہران نظر نہ آیا۔ بڑی دیر کے بعد مجھے دامن کوہ میں دھندسی دکھائی دی۔ یہی طہران تھا۔ جو ہم سے نصف گھنٹہ کے فاصلہ پر تھا۔ اتنے میں آفتاب نمودار ہوا۔ اور یہ دھند غائب ہو گئی۔ اور مجھے طہران کی سبز چھتیں اور گنبد اور مینار دکھائی دینے لگے۔ اور میں "شاہ شاہاں" کے دارالخلافہ کے دروازہ پر پہنچ گیا۔

میں دو ماہ سے سفر کر رہا تھا۔ اسلیئے البتہ میں کسیقدر دبلا ہو گیا تھا اور میرا رنگ بھی کسیقدر سیاہ ہو گیا تھا۔ ورنہ بحالت مجموعی میری صحت اچھی تھی اور مجھ سوائے تھکاوٹ کے مرض یابو کی سواری کے اور رستے کے تکان نے کچھ تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔

فصل دہم

طہران

طہران کی فصیل جس سے اِس شہر کے باشندوں کو اپنی حفاظت کی پوری امید ہے۔ اور جسکو وہ مبالغہ سے ہمیشہ کہتے ہیں کہ چٹانوں کی بنی ہوئی ہے در اصل مٹی کی دیوار ہے۔ اِس شہر میں ایک تنگ دروازہ سے جو اس دیوار میں تھا۔ میں داخل ہوا۔ راہ میں جا بجا سواروں۔ پیادوں۔ اور لدی ہوئی خچروں کا ہجوم تھا۔ جو شہر کی پیچ در پیچ گلیوں میں آمد و رفت کر رہے تھے۔ بڑی تلاش کے بعد مجھے ٹرکی سفارت خانہ کا پتہ لگا۔ مگر ان ایام میں اُس مکان میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ پہرے والے نے مجھے اطلاع دی کہ امرا میں دستور ہے کہ اس موسم میں شہر میں نہیں رہتے۔ بلکہ دیہات میں چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ٹرکی سفیر صاحب بھی آجکل دزر نامی گاؤں میں مقیم ہیں جو دامن کوہ میں واقع ہے۔ اور جہاں کا موسم قابل برداشت اور خوشگوار ہے

یہ خبر سن کر میں خوش ہوا۔ کیونکہ طہران میں ایک ہی دن کے تجربے نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ یہ شہر گرمیوں میں طپش کی شدت کے باعث کسی طرح رہائش کے قابل نہیں۔ علاوہ طپش کے وہاں کی بو بھی سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ خود مجھ پر اسکا ایسا اثر ہوا کہ جبدن میں وہاں پہنچا ہوں مجھ سے کچھ کھایا پیا نہیں گیا۔ وہ مقام جہاں سفیر مقیم تھا

طہران خاص سے دو گھنٹوں کی راہ پر تھا۔ میرا رفیق جو تبریز سے میرے ساتھ آیا تھا۔ یہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ اور سواری کا یابو بھی میں نے چھوڑ دیا تھا۔ اس لیئے یہاں تک ایک ٹٹو کرایہ پر لینا پڑا۔ اور شام کے وقت جب میں وزیر پہنچا تو ارکان سفارت ایک باغ میں ریشمی خیمہ کے اندر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے مجھے دیکھکر وہ امید سے زیادہ خوش ہوئے۔ اور کہا کہ آئیے کھانا تناول کیجیئے۔ سفیر کے سکرٹیریوں سے قسطنطنیہ میں میری یوں ہی سی ملاقات ہو چکی تھی۔ اس لیئے وہ مجھ سے کیقدر آشنا تھے۔ اور چونکہ میں اُنکے وطن سے آرہا تھا۔ اسلیئے اُس کے لیئے نعمت غیر مترقبہ تھا۔ اُنہوں نے میری سرگذشت نہائت اشتیاق کے ساتھ سنی۔ اُنہوں نے مجھ سے کئی باتیں دریافت کیں جو سلطان کے متعلق تھیں۔ اور ان باتوں کے علاوہ بھی دور کئی سوال کیئے اور باسفورس کے خوشنما آسمانی منظر کی تعریف و توصیف کی۔ آدھی رات تک یہ سلسلہ گفتگو جاری رہا۔ جب ان نیک نہاد ترکوں نے میرا عندیہ معلوم کیا تو سخت متعجب ہوئے۔ اور مجھ سے کہنے لگے کہ میاں اس خوفناک سفر سے تم کو کیا فائدہ ہوگا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وسطی ایشیا کے خوفناک جنگلوں میں وحشی لوگ آباد ہیں۔ سفیر صاحب نے بھی میری رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ ابھی دو تین مہینے ہمارے پاس رہو۔ اور ایران کو اچھی طرح سے دیکھو پھر ہم تمہارے اس سفر کے مضمون پر بحث کرینگے۔" ظاہرا سفیر کو یہ خیال تھا کہ اس عرصے میں بخوشی خاطر میں اپنی مہم کو چھوڑ دونگا۔

یہاں آتے ہی میری حالت میں عجیب کایا پلٹ ہو گئی۔ یا تو میں ایک غریب مسافر تھا اور یا یہاں نواب بنگیا۔ میرے میزبان نے میرے رہنے کے لیئے علیحدہ خیمہ نصب کرایا۔ میری سواری کے لیئے ایک گھوڑا مقرر کیا۔ ایک خدمتگار مجھے خدمت کے لیئے دیا۔ میری خاطر تواضع

میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ اور مجھے ایران کے پایہ تخت کی سیر کا خوب موقع ملا

طہران میں گلیوں کی صفائی اور مکانوں کی اندرونی حالت اچھی نہیں ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ ایرانی اپنی نشستگاہ میں عیش بھاتا اپنے کا فرش بچھاتے ہیں۔ اور دیواروں کو سامان آرایش سے آہستہ پیراستہ کرتے ہیں۔ مگر باورچیخانہ اور گدام نجاست ردی حالت میں ہوتا ہے۔ اس طرف یہ لوگ توجہ نہیں کرتے۔ یہی حال اُنکے اندرونی لباس کا ہے ایک شخص کے پاس دو سو اشرفی کی مالیت کے چغے اور کوٹ ہونگے۔ مگر کرتے شاید ہی دو ہوں۔ صابن کو یہ لوگ عیاشی کا سامان خیال کرتے ہیں بلکہ میں نے ایسے آسودہ اور متمول خان بھی دیکھے ہیں۔ جو خدمتگاروں کے رومال سے مونھ ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ ایرانی اُمرا میں دستور ہے کہ وہ اپنی سیاہ ڈاڑھی بلکہ آنکھوں پر بھی حنا لگاتے ہیں۔ جس سے اُنکی ڈاڑھیاں اور آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں۔ بعض ہاتھوں پر بھی مہندی لگاتے ہیں اس سے اُنکی شکل اور وضع اور بھی مکروہ ہو جاتی ہے۔ اِس رنگ کے استعمال سے اُنکو کئی دنوں تک مونھ ہاتھ دھونے کی نوبت نہیں آتی۔ اور رنگ کی آڑ میں بے انتہا غلاظت اُنکے بدن پر جمی رہتی ہے۔

ایران میں چھری۔ کانٹے اور چمچوں کا رواج نہیں ہے یورپین لوگ جب دیکھتے ہیں کہ میزبان اپنے ہاتھ سے مُرغ بریاں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے۔ اور مہمانوں کو تقسیم کرتا ہے اور ایک پیالہ شربت کا جسمیں کئی لوگوں کی حنا مالیدہ مونچھیں تر ہو جاتی ہیں۔ مختلف مہمانوں کو دیا جاتا ہے تو اُنکو سخت نفرت پیدا ہوتی ہے۔

ایران میں شائستگی نشست و برخاست اور تمیز گفتگو ہی میں دیکھی جاتی ہے۔ اس بارہ میں ایرانی تمام مشرقی قوموں سے بلکہ بعض مغربی

قوموں سے بھی سبقت لیگئے ہیں۔ اور یہ شائستگی دار الخلافہ میں درجۂ کمال کو پہنچگئی ہے۔ اگر یہاں کے قواعد ملاقات و ملاقات بازدید۔ گفتگو اور نشست و برخاست مشرح لکھے جائیں تو ایک بڑی بھاری کتاب بنجاتی ہے ہر ایرانی تمیز اور لیاقت میں دوسرے ایرانی سے بڑھکر خلیق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم انکی خانگی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ تمام باتیں محض بیہودہ معلوم ہوتی ہیں۔

ہر کوچہ و بازار میں شان و شوکت اور خواری و ذلت پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ ایک طرف بازار میں نیم برہنہ آوارہ گرد درویشوں کا گروہ چلا جاتا ہے۔ دوسری جانب ایک افسر اپنے کثیر التعداد جلوس کے ساتھ نظر آتا ہے۔ خانوں کے جلو میں دو طرفہ چالیس پچاس خدمتگار ہاتھوں میں لمبے لمبے عصا لیئے ہوئے ہیں۔ گھوڑے کا ساز و سامان بیش بہا ہوتا ہے۔ اور خان صاحب عموماً سر کو بڑی متانت اور شستے کے ساتھ ہر وقت ہلاتے رہتے ہیں اس ساز و سامان کو دیکھکر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ خان صاحب کوئی بڑے سرکاری افسر ہیں۔ اکثر اوقات یہ جلوس نرا دکھاوا ہوتا ہے اور خان صاحب کا بال بال قرضے میں بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اور وہ تلاش روزگار میں سرگرداں ہوتے ہیں۔ یہ خدمتگار جو جلوس کے ساتھ ہوتے ہیں در اصل خدمتگار نہیں ہوتے بلکہ اس حیلے سے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ کہ اگر خان صاحب کا روزگار لگ گیا تو انکی بھی دیگچی گرم ہو جائیگی۔

ایرانی اپنے بادشاہ کے حضور میں نہایت ادب سے پیش آتے ہیں۔ اور اپنے آپکو اُس کے مقابل میں سخت ناچیز سمجھتے ہیں۔ لیکن اکثر اپنے کانوں سے سُنا ہے کہ بادشاہ کی عدم موجودگی میں وہ اُسکی شان میں بہت نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ میں اُنکی خوشامدانہ تعظیم کی

کی ایک مثال بیان کرتا ہوں کہ ایک دفعہ بادشاہ سلامت نے ایک درباری سے کہا کہ میرے قریب آؤ تو اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ جہاں پناہ مجھے یہ جرات نہیں ہے۔ آپ کا جلوہ میری آنکھوں سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ دار الخلافہ سے دور ہیں وہ عموماً بادشاہ سلامت کے احکام کی پروا نہیں کرتے۔ خاص کر وہی لوگ جن پر بادشاہ کو اعتبار ہے اور جن پر ہمیشہ وہ نظر عنایت رکھتے ہیں۔ اور نیز جو شاہ کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ اکثر سخت بدنامی بادشاہ کی کرتے ہیں۔ یہ باتیں جو منظور نظر درباری مشہور کرتے ہیں۔ لوگوں کے کانوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ بعد شعرا انکو اپنے اشعار میں لیکر ہجو لکھتے ہیں۔ اور مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اور ملک کے ہر گلی کوچے میں تھڑی تھڑی ہوتی ہے۔ ایک دو ہفتہ میں نے یہاں ٹھر کر چین سے گذارے لیکن پھر مجھے شیراز دیکھنے کی دھن سمائی۔ اور چند دن کے بعد میں ایک قافلہ کے ساتھ جانب شیراز روانہ ہوگیا۔

فصل یازدہم

دشت کبیر

میں ۲ ستمبر ۱۸۶۲ء کو طہران کے پھاٹک شاہ عبد العظیم سے روانہ ہوا۔ اُس وقت میرا لباس اُن سُنّی درویشوں کا ساتھا جو بغداد سے آتے ہیں میرا جُبّہ میرے پاؤں کی ایڑیوں تک تھا۔ میری کمر میں ایک سُرخ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ایک سیاہ کوٹ جس کو مشلک کہتے ہیں (یہ بارش میں کام دیتا ہے) میں نے پس پُشت ڈالا ہوا تھا۔ اور میرے سر پر کفیہ کی دستار تھی۔ کفیہ[1] ایک بڑا سا ریشمی رومال ہوتا ہے۔ جس پر زرد دھاریاں ہوتی ہیں۔ اہل عرب اس کو سر پر باندھتے ہیں۔ طہران کا دستور ہے کہ غروب آفتاب کے بعد شہر کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہم نے شہر سے باہر ایک جگہ قافلہ جمع ہونے کیلئے مقرر کر رکھی تھی۔ اس قافلہ کے ساتھ ۳۰ تحت اسباب لدے ہوئے تھے۔ دو سوار تھے۔ چند مُلّا تھے۔ مشہد کے حاجی تھے۔ سوداگر تھے۔ کاریگر تھے۔ اور ایک یہ ناچیز بھی تھا۔ رات کے دو بجے ہم اُس راستے سے روانہ ہوئے جو شاہ عبد العظیم کی خانقاہ کو جاتا ہے۔ طہران

[1] عرب۔ شام اور مصر میں کفیہ اس چھوٹی سی سفید ٹوپی کو کہتے ہیں جو اُن ممالک کے علماء و مشائخ سر پر باندھتے ہیں۔

کے قریب ایک مشہور خانقاہ ہے۔ اور یہاں دور دور سے لوگ زیارت کو آتے ہیں۔ جب تک میں طہران میں رہا اکثر اس خانقاہ پر جایا کرتے تھے۔ بعد از دوپہر اس خانقاہ پر میلہ لگا رہتا ہے۔ ہر قسم کے آدمی یہاں آتے ہیں معزز خاتونیں گھوڑوں پر سوار ہو کر یہاں آتی ہیں۔ خان اور مرزا سب قسم کے لوگ یہاں دیکھے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی خانقاہ کے دروازہ پر یوروپ کی بنی ہوئی گاڑی بھی جو صرف دربار کے استعمال کے لیئے ہے کھڑی ہوئی دیکھی جاتی ہے[۱]۔ رات کو جب ہم اُس خانقاہ کے پاس سے گذرے تو یہاں خاموشی برس رہی تھی۔ اور چاندکی چاندلی نے شاہ عبد العظیم کی خانقاہ کے سنہری کلس کو منوّر کیا ہوا تھا۔ دو گھنٹے تو ہم لب بستہ سفر کرتے رہے۔ دو گھنٹہ کے بعد ہم میں سے بعض مسافر آپس میں کچھ گفتگو کرنے لگے۔

میں نے اپنی رفاقت کے لیئے ایک نوجوان سیّد کو جو بغداد سے آیا تھا منتخب کیا۔ یہ مرثیہ خوان تھا۔ اور جنوبی ایران میں جا رہا تھا۔ یہ پکا شیعہ تھا اور اُسکا میرے ساتھ سلسلہ یگانگت پیدا کرنا واقعی تعجب کی بات تھی لیکن یہ شخص چونکہ باب عالی کی رعیت اور بغداد کا رہنے والا تھا۔ اس لیئے چنداں متعصب نہ تھا۔ اور آفندی کی دوستی اُسکو ناگوار نہ تھی۔ اُس نے میری ملاقات دیگر اہل قافلے کرادی۔ یہ شخص ایسا زندہ دل تھا کہ کبھی کبھی مرثیہ خوانی چھوڑ کر مسرت بخش راگ بھی ہم کو سنانے لگ جاتا تھا۔ تمام اہل قافلہ اُسکو رونق قافلہ سمجھتے تھے۔ اور اُسکی بدولت میری بھی اُنہیں سے ملاقات ہو گئی۔

پہلے میں نے ہر چند چاہا کہ کسی طرح مذہبی معاملات پر بحث نہ ہو۔ مگر یہ بات نہائت مشکل تھی۔ ایرانیوں کو مذہبی بحث کا شوق ہے اور وہ عیسائیوں کے ...

[۱] شاہ ناصر الدین قاچار مرحوم اسی خانقاہ کو جاتے ہوئے رستے میں ایک بابی کے ہاتھ سے قتل کیئے گئے ۱۲

اور خاص کر شیعوں کے ساتھ بحث کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ ایران میں چاندنی راتیں دلپذیر بڑا اثر کرتی ہیں۔ چاندنی میں جب سر بفلک کشیدہ پہاڑ۔ وحشتناک کھنڈرات اور چلتے ہوئے قافلے کے ہولناک سائے نظر آتے ہیں تو یورپ کے مسافروں کے دلوں میں عجیب و غریب اثر پیدا ہوتا ہے یہ رستہ جس پر ہمارا قافلہ جا رہا تھا بہت پُر از رستہ تھا۔ جابجا خندقیں چٹان گھاٹیاں اور نالے راہ میں آتے تھے لیکن مجھے اس رستہ میں کچھ تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ میں نے اپنی سواری کے جانور پر بھروسہ کیا ہوا تھا۔ اور میرا زندہ دل رفیق مجھے ہر وقت خنداں اور خرم رکھتا تھا۔ اس میرے سید رفیق کو علم نجوم میں بھی دخل تھا۔ اور ہر ستارہ کے متعلق وہ مجھے کوئی نہ کوئی روائیت سُنا دیتا تھا۔ صبح کے قریب جبکہ دب اکبر افق مغربی تک ہو چکا تھا ہم کنارگرد نامی گانوں میں جو کوہ کریزک کے دامن پر واقع ہے پہنچ گئے۔ پہاڑ سے اُترنے سے پیشتر میں نے چاندنی کی سماں پر پھر ایک نظر ڈالی۔ اور جب ہم دامنِ کوہ میں اُترے تو پو کے پھٹنے سے چاندنی ماند پڑ گئی تھی۔

جونہیں صُبح کا ستارہ نظر آیا سید نے اذاں کہی۔ اور اہل قافلہ وضو کر کے نماز میں مشغول ہوئے۔

اہل قافلہ کا دستور ہے کہ وضو کر کے نہایت مودب ہو کر ایک جماعت میں نماز صُبح ادا کرتے ہیں۔ صُبح کے وقت منہ اندھیرے جبکہ حیوانات سر جھکائے خاموش کھڑے ہوتے ہیں تو اہل بہ شرق قبلہ رو صف بستہ اُسی دردناک متانت کے ساتھ سر بسجدہ ہوتے ہیں جو کہ عقیدتمند مسلمانوں کا خاصہ ہے اور جب سورج نکلتا ہے تو بلند آواز سے دُعا مانگتے ہیں جو اللہ اکبر کے

الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ غرض جب آفتاب نکل آیا تو ہم کنارگرد کے
قریب ایک وسیع کاروان سرائے میں فروکش ہوئے۔ اس گاؤں کے مشرق
میں وہ ریتلا بیابان ہے جسکو دشت کبیر کہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ
کنارگرد کہلاتا ہے۔ دشت کی نسبت عجیب عجیب روایتیں بیان کرتے ہیں
اور اکثر سُننے والوں کو ڈراتے ہیں مجھے اپنے تمام سفر میں کوئی ایرانی
ایسا نہیں ملا جس نے کنار گرد اور تیبس کے درمیانی حصے پر کبھی قدم رکھا ہو
ہر روایت میں یہہ ذکر ہوتا ہے کہ اس دشت کے فلاں مقام میں جن آباد ہیں
اور فلاں مقام میں بھوت پریت رہتے ہیں۔ سب سے مشہور کہانی جو اس دشت
کے بارہ میں بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مُحبانِ حسینؓ سے بھاگ کر شمر
قاتل حسینؓ نے اس دشت میں آ پناہ لی۔ اُس کے منحوس قدم کے اثر سے
یہ دشت وحشت خیز بیابان ہو گیا۔ اس دشت میں جو کھارے پانی کی جھیلیں
اور دلدل ہیں اُنکی نسبت یہ روایت مشہور ہے کہ جب شمر پر عذاب نازل
ہوا اور تکلیف کی حالت میں اُس کے جسم سے عرق کے قطرے بہے تو اُن
قطروں سے یہہ جھیل اور دلدلیں بنگئیں۔ اس دشت میں بہت خوفناک
مقام کبیر کوہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جگہہ ابتک شمر زندہ موجود ہے۔ اور
جو مسافر چھلاوا دیکھکر اُسکے پیچھے پیچھے اس دشت پُرخطر میں چلا جاتا ہے
پھر وہاں سے زندہ واپس نہیں آسکتا۔ اس قسم کی کہانیاں میرے ہمراہیوں
نے اس دشت کے بارے میں مجھے سنائیں۔ جب ہم کاروان سرائے میں پہنچے
تو ہم نے تمازت آفتاب کے سایہ دار مکان میں پناہ لی۔ جانوروں کو چرنے کے
لئے چھوڑ دیا۔ ہم میں سے بعض کھانا پکانے لگے۔ اور بعض جو آسودہ حال تھے
لیٹ گئے اور خدام کو حکم دیا کہ ہمارے پاؤں دباؤ۔ اور پیٹھ ملو۔ تھوڑی دیر

آرام کرکے ہم سب نے کھانا کھایا۔ اور پھر سو گئے۔ تمام دن اہل قافلہ اس موسم میں سوتے ہیں۔ اور شام کے وقت سفر کے لیئے پھر تیار ہو جاتے ہیں ح
شام کے قریب پلاؤ دم کیا جاتا ہے۔ اور مویشیوں کو ملا جاتا ہے۔
روانگی سے ایک گھنٹہ پیشتر شام کے کھانے سے فارغ ہو جاتے ہیں۔
فقیر اور درویش قافلے میں بڑے آرام سے رہتے ہیں۔ جوں ہی قافلہ منزل میں پہنچا وہ بلا کسی فکر و خیال کے بستر راحت پر آرام کرتے ہیں۔ اور جب پلاؤ کی خوشبو انکے دماغ میں جاتی ہے تو وہ بلا تامل کشکول اٹھا لیتے ہیں اور "یا ھو" "یا حق" کے نعرے مارتے ہوئے ہر طرف جاتے ہیں اور مختلف قسم کے کھانے مختلف ڈیروں سے مانگ کر ایک ہی جگہ ڈال لیتے ہیں۔ اور پھر بڑی اشتہا سے انکو کھاتے ہیں۔ درویش جہاں جاتے ہیں بیک بینی و دو گوش جاتے ہیں۔ انکا باورچی خانہ خدا گرم کر دیتا ہے۔

دوسرے دن مقام پر پہنچنے کے لیئے ہم کو اس بیابان سے گذرنا تھا۔ خاموشی نے بیابان کی وحشت کو دوچند کر دیا تھا۔ اور جہانتک نگاہ کام کرتی تھی کوئی قابل دید چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس دشت میں رات کو بجز ریت کے ٹیلوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ یہ ٹیلے رات کی تاریکی میں بیشک عفریت معلوم ہوتے تھے۔ کیا عجب ہے کہ بعض ڈرپوک اور زود اعتقاد لوگوں نے انکو دیو اور بھوت پریت سمجھا ہو۔ میرا رفیق اسی قماش کا انسان تھا اس نے اپنا جبہ اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اور قافلے کے گنجان حصہ میں چلا گیا۔ ہرچند میں نے چاہا کہ وہ ادھر ادھر دیکھے مگر اس نے آنکھیں اٹھا کر کسیطرف نہ دیکھا۔

آدھی رات کے قریب ہم نے جرس کی آواز سنی اور جب میں نے

دریافت کیا کہ یہ کیسی آواز ہے تو لوگوں نے مجھے کہا کہ ایک بڑا قافلہ ہم سے ایک گھنٹہ پہلے روانہ ہو چکا ہے۔ یہ آواز اُس قافلہ سے آرہی ہے۔ ہم نے جلدی جلدی اپنے قدم اُٹھائے۔ تاکہ اِس قافلہ تک پہنچ جائیں۔ مگر ابھی ہم اِس قافلہ سے کچھ فاصلہ پہ تھے کہ اِس قسم کی بوئے بد ہمارے دماغ میں آئی جیسی کہ سڑی ہوئی مردہ لاشوں سے آیا کرتی ہے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جاتے تھے یہ بدبو زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ ایرانی اِس بدبُو اور تعفن کے حال سے آگاہ تھے۔ مگر مُنہہ سے کچھہ نہ بولتے تھے مجھہ سے رہا نہ گیا۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ مجھے تو غشیان کی نوبت ہوگئی۔ اُسنے کہا خاموش یہہ مُردوں کا قافلہ ہے۔ یہہ سُنکر میں قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھا۔ اور میں نے دیکھا کہ اِس قافلہ میں چالیس گھوڑے اور خچر تھے اور اُنکے ساتھ تین عرب تھے۔ جو اُن جانوروں پہ تابوت رکھے ہوئے لیجارہے تھے۔ ایک مُردے کا چہرہ کفن میں سے دکھائی دے رہا تھا۔ اور چاندکی روشنی میں وہ اور بھی بھیانک معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ایک عرب سے پوچھا کہ بھائی یہہ کیا معاملہ ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ لاشیں اُن لوگوں کی ہیں جنہوں نے مرتے دم وصیت کی تھی کہ اُنکی لاش کربلائے مُعلّیٰ میں حضرت امام حسینؑ کے قدموں میں دفن کیا جائے۔ جن لوگوں کو توفیق ہے وہ چاہے خراسان میں رہتے ہوں۔ مرتے دم ضرور یہ وصیت کرجاتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ دو ماہ کے عرصہ میں اُنکی میت کربلائے مُعلّیٰ میں پہنچ جاتی ہے۔ یہہ رسم تمام ایران میں رائج ہے۔ ایک خچر پہ چار تابوت لادے جاتے ہیں۔ موسم زمستان میں تو خیر لیکن جولائی کے مہینہ میں اِن لاشوں کا اِس طرح جانا حیوانوں اور

انسانوں کی صحت کے لئے نہایت نقصان ہوتا ہے۔

جب اِس عجیب قافلہ سے ہم آگے نکل گئے تو میں نے لوٹ کر پیچھے دیکھا۔ غریب حیوانوں نے اپنی گردنیں اِس طرح ڈالی ہوئی تھیں کہ جیسے اِس بدبو سے مُنہ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سوار اِن لاشوں سے دور اور پیچھے سے آ رہے تھے۔ اور بلند آواز سے خچروں کو ہانک رہے تھے۔ یہ نظارہ ہر مقام پر خوفناک ہو سکتا ہے۔ مگر اِس وحشت خیز جنگل میں رات کے وقت بہادر سے بہادر آدمی کا بھی اِس کو دیکھکر کلیجہ ہل جاتا تھا۔

فصل دوازدہم

قم ۔ کاشان

اِس تین دن کے سفر میں تمام اہل قافلہ سے میری دوستی ہو گئی۔ اُنمیں سے کسی کو گمان تک نہ تھا کہ میں عیسائی ہوں جسکے چھونے سے ہر ایک شئے ناپاک ہو جاتی ہے۔ اور جسکے ساتھ ملکر کھانا گناہ کبیرہ ہے۔ یہہ مجھے قسطنطنیہ کا سُنی آفندی اور ترکی سفارت کا مہمان سمجھے ہوئے تھے۔ ہر چند کہ میری ان سب سے اچھی ملاقات ہو گئی۔ مگر پھر بھی اُنمیں جو متعصب شیعہ تھے وہ میرے سامنے سُنیوں کی بُرائیاں کر ہی دیتے تھے۔ اُنمیں سے ایک سبز عمامہ پوش کفش دوز تھا جس کا سبز عمامہ بتا رہا تھا کہ وہ حضرت علیؑ کی اولاد سے ہے۔ وہ ہمیشہ خلفائے ثلاثہ پر غضب کا الزام لگاتا تھا۔ لیکن اِس قافلہ میں چند باتمیز آدمی بھی تھے۔ وہ اکثر اُس کے غصہ کو ٹالتے رہتے تھے۔ اور جب وہ جوش میں آجاتا تھا تو کوئی اور بات چھیڑ دیتے تھے۔ ہر چند کہ خلافت کے واقعے کو بارہ سو سال سے زیادہ ہو گئے تھے۔ مگر وہ شخص اس جوش اور سرگرمی سے اُسپر بحث کرتا تھا کہ گویا کل کی ہی بات ہے۔

چوتھے دن ہمارے سامنے قم کے سبز رنگ گنبد نظر آئے۔ یہ ایرانی عورتوں کا مقدس شہر ہے۔ اِس میں چار سو چوالیس اولیاؤں کی قبریں ہیں جو حضرت فاطمہ ہمشیرہ امام رضا

کے ساتھ یہاں عدم کی نیند سو رہے ہیں۔ چونکہ حضرت فاطمہؓ یہاں دفن ہیں۔ عورتیں اس شہر کو مقدس مقام سمجھتی ہیں۔ سید فاطمہؓ کی نسبت یہہ روائت بیان کیجاتی ہے کہ یہ اپنے بھائی کی ملاقات کے لیئے بغداد سے مشہد آئی تھیں۔ راہ میں قم کے بخار سے بیمار ہو کر فوت ہوئیں۔ اور قم ہیں دفن ہوئیں۔ جس طرح لوگ وصیت کر جاتے ہیں کہ بعد از مرگ اُنکی لاش کربلا میں دفن ہو۔ اُسی طرح ایران کے تمام حصوں سے عورتوں کی لاشیں قم میں لاکر دفن کیجاتی ہیں۔ قم میں اگر کوئی مجرم جرم کرکے آجائے تو پھر اُسکو گرفتار کرکے سزا نہیں دیجاتی۔ گویا اس شہر کی مقدس حدود میں آکر وہ گناہ سے پاک ہو جاتا ہے۔ اور مامون و مصئون سمجھا جاتا ہے۔ یہاں جب مسافر آتے ہیں تو اپنی یادگار کچھ نہ کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ بعض تو جھاڑیوں پر کوئی دھجی باندھ جاتے ہیں۔ بعض پتھر کھڑا کرکے اسپر کچھ لکھ جاتے ہیں پہلے دستور تھا کہ مسافر درختوں میں میخ ٹھونک جاتے تھے۔ میں بھی اپنی سواری سے اُترا اور اپنے سر سے سُرخ ریشمی کپڑے کی دھجی پھاڑ کر لگادی۔ فن بافندگی کی عجیب و غریب صنعتیں یہاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ کہیں تو صحرا نورد کردوں اور ترکمانوں اور بدوؤں کے موٹے کپڑے موجود ہیں۔ کہیں بیش بہا کشمیری شالیں اور انگلینڈ اور امریکہ کے دوشالے جھاڑیوں پر موجود ہیں۔ بعض مسافروں کے وہاں آنے میں یہ شالیں دیکھکر پانی بھر آتا ہے۔ مگر کیا مجال کہ شال تو درکنار دھجی کو بھی ہاتھ لگائیں۔ یہاں اس جرم سے بڑھکر اور کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا۔

لہ قم عراق عجم کا ایک مشہور شہر طہران سے اسی میل جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ علاوہ زیارات کے اس شہر میں ایک مشہور مدرسہ اور مسجد ہے۔ مگر اب اُنکی حالت قابل مرمت ہے یہاں کی آبادی آٹھ ہزار کے قریب ہوگی۔

شہر پہنچنے سے پیشتر ایک قبرستان راستے میں آیا۔ جو دو میل تک پھیلا ہوا تھا۔ میں اس قدر وسیع قبرستان دیکھکر حیران ہو گیا۔ مگر میرے ہمراہیوں نے مجھے یقین دلایا کہ کربلا کے قبرستان کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ آخرکار ہم قم پہنچے۔ شہر کے وسط میں کارواں سرائے تھی۔ اُسمیں ہم فروکش ہوئے اور اہل قافلہ سے یہ سُن کر کہ یہاں دو دن قیام ہوگا۔ میں بہت خوش ہوا۔

اس شہر میں پہنچکر ہم نے وضو کیا۔ کپڑے دھوئے۔ اور فوراً خانقاہ پر گئے۔ اس خانقاہ میں آجتک کوئی فرنگی نہیں گیا۔ میں پہلا فرنگی تھا جس نے اس خانقاہ کے اندر قدم رکھا۔ کیونکہ کوئی دنیاوی طاقت کسی غیر مذہب کے آدمی کو اس خانقاہ میں جانیکی اجازت نہیں دلا سکتی۔

اس خانقاہ کے کئی سید مجاور ہیں جو سیدہ فاطمہؓ کی اولاد سے ہیں۔ یہ خانقاہ کے بیرونی صحن میں جہاں درخت لگے ہوئے ہیں خیموں میں رہتے ہیں۔ اندرونی صحن میں ایک گنبد نما کمرہ ہے۔ جس کا کلس سونے کا ہے۔ اس گنبد میں زائر مرمری سیڑھیاں چڑھکر داخل ہوتے ہیں۔ پہلی سیڑھی پر زائر لوگ اپنی جوتیاں اُتار دیتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس لکڑی ہو یا کوئی ہتھیار ہو تو وہ بھی اُس سے لیلیا جاتا ہے۔ اور جب تک دروازہ کی سنگ مرمر کی دہلیز کو کوئی بوسہ نہ دے لے اندر جانا نہیں ملتا۔ گنبد اندر سے طرح طرح کے نقوش سے منقش اور زرنگار ہے۔ قبر کے تعویذ پر بیش قیمت غلاف ہر وقت چڑھا رہتا ہے۔ قبر کے گرد ٹھوس چاندی کا کٹھرا ہے۔ کٹھرے پر تختیاں لٹک رہی ہیں جنپر دعائیں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ دعائیں یا تو زائر خود پڑھتے ہیں یا کسی ایک سیّد سے جو وہاں موجود ہو پڑھوا لیتے ہیں۔ اس گنبد میں نعروں کی آواز۔ نعت خوانی کی آواز اور رونے کی آواز ہر وقت گونجتی رہتی ہے

اور باوصف اِس آواز کے زائر خلوص نیت سے گھرے کے ساتھ سر ٹیک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ جو دعا مانگنی ہوتی ہے مانگتے ہیں۔ اِس قبر پہ بہت سی چیزیں سونے کی مکلّل بہ جواہر لوگوں نے چڑھا دا چڑھائی ہیں میرا لباس دیکھکر جو اہل بغداد کا لباس تھا بہت سے شیعہ زائرین ناراض ہوئے۔ مگر میں اپنے رفقا کا مشکور ہوں کہ اُنکے باعث کسی نے مجھے دق نہ کیا۔ اس قبر کی زیارت کرکے دنیا کے بعض اور مقدس اشخاص کے مزاروں پر بھی لوگ جاتے ہیں۔ چنانچہ فتح علی شاہ اور اُسکے دونوں بیٹوں کی قبریں بہت مقدس سمجھی جاتی ہیں۔ اِن قبروں کی بھی زیارت میں نے کی یہ قبریں سنگ مرمر کی ہیں۔ اور اُنپر متوفیوں کی تصویریں بڑی قابلیت سے پتھر پر کندہ کی ہوئی ہیں۔ اِس خانقاہ کی زیارت کرکے ہم شہر میں واپس آئے۔

پھر ہم نے شہر کی سیر کی۔ شہر میں بازار قابل دید جگہ ہے۔ آجکل میووں کا موسم تھا۔ اور دکانوں پر یہاں کے تربوز جو تمام ایران میں مشہور ہیں دھرے ہوئے تھے۔ موسم خزاں میں بہت سے لوگ تربوز کے سوا اور کچھ نہیں کھاتے۔ اور تربوز کا افشردہ کئی بیماریوں میں دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس شہر کی صراحیاں بھی بہت مشہور ہیں۔ اور یہاں سے دور دور ملکوں میں جاتی ہیں۔ اِس بازار میں میں ایک رنگریز کی دوکان کے آگے ٹھہر گیا۔ یہ شخص ململ کے تھان چھاپ رہا تھا۔ مجھے وہاں کھڑا دیکھکر اُس نے میری طرف قہر آلود نگاہوں سے گھورا۔ اور مجھے فرنگی سمجھکر کہا۔ "تمہاری ریشموں اور چھینٹوں کو ہم اب نہیں خریدا کریں گے۔ جب ہم کو تمہاری چالبازیاں معلوم ہوگئیں تو ہم کوئی شئے فرنگستان کی

نہیں لیں گے۔ اور پھر تم تمام بھیک مانگتے ہمارے پاس یہاں آؤ گے۔

اِس شہر سے ہم تیسرے دن روانہ ہوئے۔ دو دن ہم نے راہ میں گذارے اور چند معمولی مقامات سے ہوتے ہوئے تیسرے دن کاشان میں پہنچے۔ میرے ایرانی رفیق پہلے سے ہی اِس شہر کی تعریف میں رطب اللسان ہو رہے تھے۔ مگر مجھے اِس شہر میں سوائے کاشی کے برتن بنانے والوں کے بازار کے اور کوئی شئے پسند نہ آئی۔ جب میں برتن سازوں کے بازار میں گیا تو میں نے دیکھا کہ اسّی سے زیادہ دکانیں برتن بنانے میں مشغول ہیں۔ تانبے کے برتن جو یہاں بنتے ہیں وہ بلحاظ کاریگری کے بے نظیر ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اِس شہر کے برتن اِس قسم کے ہوتے ہیں کہ کئی صدیوں تک اُنکی چمک خراب نہیں ہوتی۔ پہلے اِن برتنوں کو کاشان کے برتن کہتے تھے لیکن اَب کاشی کے نام سے مشہور ہیں۔ اور تمام وسط ایشیا میں تحائف کے طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہاں ایک خوفناک قسم کا عقرب ہوتا ہے۔ مگر مسافروں کو نہیں ستاتا۔ مجھے کسی بچھو نے تو دق نہیں کیا۔ مگر چند انسان صورت حیوان سیرت گویوں نے بہت دق کیا۔ جو مسافروں کا بغیر کچھ لیئے پیچھا نہیں چھوڑتے۔ جونہی میں نے سرائے میں قدم رکھا۔ اور دس گویئے میرے گرد ہو گئے۔ اور بے ہودہ باجے بجانے اور میرے نام کے اشعار سُنانے لگے۔ پہلے تو میں حیران ہوا کہ اُنکو میرا نام کہاں سے معلوم ہو گیا۔ مگر پھر میں سمجھ گیا۔ کہ اُنہوں نے میرے ہمراہیوں سے معلوم کر لیا ہو گا۔ میں نے دو چار منٹ تک یہ بے سرو پا راگ سُنا اور پھر میں کھسکا۔ مگر یہ میرا پیچھا کب چھوڑتے تھے اُنمیں سے ایک میری کوٹھڑی میں میرے پیچھے پہنچا۔ ہر چند میں نے اُس کو

سمجھایا کہ بھائی میں خود درویش ہوں۔ میں تجھے کیا دے سکتا ہوں مگر وہ ٹلنے والی اسامی نہ تھا۔ جب تک اُس نے مجھ سے کچھ لے نہ لیا پیچھا نہ چھوڑا۔

کاشان سے ہمارا گذر ایک ایسے تنگ رستے سے ہوا جو ایک عجیب غریب پہاڑ کے درمیان تھا۔ رات کے وقت چاند کی کرنوں سے دن کا سماں بندھ ہوا تھا۔ چاندنی ایک ایک قدم پہ قرب وجوار کے منظر کو نئے رنگوں سے آراستہ کر رہی تھی۔ اِس راستہ میں وہ بڑا بند تھا جو شاہ عباس اعظم نے بنایا تھا تاکہ پہاڑوں پر سے برف پگھل کر اُس بند کے ذریعہ کھیتوں میں پہنچے۔ اگرچہ خزاں کے موسم کا اخیر تھا۔ لیکن بند پانی سے بھرا ہوا تھا۔ اور جب ۶۰ فٹ کی بلندی سے اِس بند میں سے رات کے وقت پانی گرتا نظر آتا تھا۔ تو بعینہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہیروں کا دریا بہ رہا ہے۔ اِس بند سے پانی کے گرنے کی آواز رات کے وقت دور تک جاتی ہے۔ اور یہاں کا آب زلال بیچارے مسافروں کو ایسا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیا کی نہریں اِس کے آگے ہیچ سمجھتے ہیں۔

کوہ رود کا رستہ پہاڑ پر سے ہو کر میدان کی طرف جاتا ہے۔ ہم کو اس راستہ سے ہو کر پہاڑ کی دوسری جانب قیام کرنا تھا۔ علے الصباح ہمیں اِس راستہ میں سردی محسوس ہوئی۔ اِس لئے ہم نے بوٹا کی شاخیں (جو ایک قسم کی گوندوالی لکڑی ہوتی ہے) جمع کر کے اُنکی آگ بنائی اور آگ تاپنے لگے۔ یہ لکڑی تازگی کی حالت میں بھی خوب جلتی ہے۔ لیکن جب خشک ہو جاتی ہے تو اُسمیں سے بڑی سخت چٹخنے کی آواز آتی ہے۔ ابھی ہم لکڑی آگ تاپ رہے تھے کہ ہم نے اپنے پیچھے تکرار کی آواز سُنی اور پھر ہمیں بندوق چلنے کی اور کسی زخمی کے چلانے کی آواز آئی۔ بندوق کی آواز سُنکر تمام

اہل قافلہ ہراساں ہوئے۔ اور ہم سب اُس طرف دوڑے گئے جدہر سے آواز آئی تھی۔ وہاں جاکر ہم نے دیکھا کہ ہمارا ایک رفیق زمین پر پڑا ہوا ہے۔ اور اُسکا بازو ٹوٹ گیا ہے۔ تکرار اِس طرح سے ہوئی کہ چند سوار شیراز سے جزیہ طہران میں لیجارہے تھے۔ اتفاقاً یہ سوار چند یہودیوں کو اندایں راہ کو ملے۔ اور اُنکو سخت سست کہا۔ ہمارا رفیق جو زخمی ہوا تھا۔ وہ وہاں موجود تھا۔ اُسکو یہودیوں پر رحم آیا۔ اور اُسنے اُنکی حمایت کی۔ اِسپر ایک مغلوب الغضب سوار کو ایسا غصہ آیا کہ اُس نے اپنی بندوق اٹھاکر یہودیوں کی طرف داغدی اور ہمارے رفیق کا ہاتھ زخمی ہوگیا۔ اِس سوار نے بعدازاں کہا کہ میں صرف یہودیوں کو ڈرانا چاہتا تھا۔ اور اُنکی ٹوپی گولی کا نشانہ بنانا چاہتا تھا کہ اتفاقیہ نشانہ خطا ہوا۔ اور ایرانی کا ہاتھ زخمی ہوا۔ اِس حادثہ سے تمام اہل قافلہ اِس قدر ناراض ہوئے کہ وہ اُس سوار کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ سوار بھی یہ بھانپ گیا تھا کہ وہ سرپٹ گھوڑا دوڑاکر نکل گیا۔ لیکن اہل قافلہ کے ہاتھ سے وہ کہاں جاسکتا تھا۔ آخر گرفتار ہوکر قافلہ میں لایا گیا۔ اور بعض نے ہم میں سے اُسکو مارتے مارتے ادہموا ساکردیا۔ نہ تو ہمارا رفیق اور نہ یہ سوار اَب اِس قابل رہے تھے کہ سوار ہوسکیں۔ دونوں کو ہم نے ٹوکروں میں بٹھاکر خچر پر لادا۔ اور روانہ ہوئے۔ نصف گھنٹہ میں یہ دونوں شخص آپسمیں باتیں کرنے لگے اور دوست بنگئے دونوں نے ایک دوسرے کے زخم باندہے۔ بلکہ یہ کہکر کہ جو کچھہ ہوا وہ ضرور ہونا تھا۔ کیونکہ قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور یار غار بنگئے ؞

پھر ہم مرلشتی خوار نامی گانوں میں پہنچے۔ یہاں کے قاضی نے

حاکم شیراز کو خوش کرنے کے لیئے اُس قیدی کو رہا کرانا چاہا۔ مگر اہل قافلہ نے صاف انکار کر دیا۔ اور اصفہان میں جا کر اُس کو پولیس کے حوالہ کر دیا۔

۲۴ ستمبر کو دور سے صبح کی دھندلی روشنی میں مجھے شہر اصفہان جو شاہ عباس کا دار الخلافہ رہ چکا ہے۔ نظر آیا۔ ایرانی خاصکر اصفہان کے باشندے جب سیر و سیاحت سے واپس آتے ہیں تو دور سے اصفہان کو دیکھکر کہتے ہیں کہ اصفہان بجز لاہور نصف جہان است ؛ مطلب اس کا یہ ہے کہ تمام دنیا کے شہروں میں لاہور کو چھوڑ کر سب سے بڑا شہر اصفہانؔ ہے۔ شائد ایسا ہو۔ مگر اس کی خوبصورتی صرف ظاہری خوبصورتی ہے۔ اِس شہر کی گلیاں تنگ۔ غلیظ۔ اور خراب ہیں ؛

لہ اِن بیچارے ایرانیوں کو یہ معلوم نہیں کہ لنڈن میں نصف کروڑ آبادی ہے جو اِس وقت پچیس نہیں لاہوروں کے برابر آباد ہے ؛

فصل سیزدہم

اصفہان سے کیخسرو کی خیالی قبر تک

اصفہان کا بازار بھی اور شہروں کی طرح بارونق بازار ہے اور شہر کی تجارت اسی سے ہے۔ اس شہر کے عظیم الشان سقف پوش بازاروں اور پیچ در پیچ گلیوں میں آدمی چاہے تو گھنٹوں پھرا کرے۔ اور اگر کوئی راہبر نہو تو کچھ شک نہیں کہ مسافر رستہ بھول کر تمام دن گلیوں میں بھٹکتا رہے۔ کسی زمانہ میں یہ شہر بیشک بڑا بارونق ہوگا۔ مگر اب وہ رونق خواب و خیال ہوگئی ہے۔ اور بڑی بڑی عالیشان دوکانوں میں صرف تربوز فروش بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ شہر کے بازار میں سے ایک رستہ میدان شاہ کو جاتا ہے۔ میدان شاہ کسی زمانہ میں بڑا بھاری چوک تھا جسمیں کبھی نہایت قیمتی اشیا کی منڈی لگا کرتی تھی۔ مگر اب یہ چوک ویران پڑا رہتا ہے۔ پھر میں نے لطف علی کی مسجد کو دیکھا۔ اس مسجد کے دروازے کسی زمانہ میں چاندی کے تھے۔ اس مسجد پر کھڑے ہوکر میدان شاہ کی طرف دیکھا۔ اس وقت میرے دلمیں عجیب خیالات پیدا ہوئے۔ میں نے سوچا کہ اللہ کی شان یہ چوک جو آج ویران پڑا ہے وہی ہے جس میں شاہ عباس جلوہ افروز ہوا کرتا تھا۔ جس میں ہر ملک اور ہر دیار کے باشندے اور شہسوار کھڑے ہوکر اس عظیم الشان بادشاہ کے آگے سرنگون ہوتے تھے۔ اسی چوک میں

جہاں کسی زمانہ میں عربی گھوڑے ہنہنایا کرتے تھے اب گدھے کھڑے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سبز عماموں والے مولوی بھی اِس چوک سے گذرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

میں امام جمعہ کے مکان میں بھی جا پہنچا۔ یہ ایران میں ایک بڑا ذی رسوخ آدمی تھا۔ اور طہران میں اسکو آغا بزرگ کہکر پکارتے تھے۔ دراصل یہ شیعوں کا پوپ تھا۔ اور اُن خطوط کی بدولت جو میں طہران سے ہمراہ لایا تھا۔ میری رسائی اُس بزرگ تک ہوئی اور اُس کے مکان میں آمد و رفت کے باعث ہر قسم کے باشندگانِ اصفہان سے میں واقف ہوگیا۔ جب میں اُسکی خدمت میں حاضر ہوا تو یہ میرے ساتھ بڑے تپاک سے پیش آیا۔ اور مجھے کہا کہ کل شام کو بھی میرے ہاں آؤ۔ آغا بزرگ صحیح النسب سید ہے۔ اور اِس عالی نسبی کا اسکو بہت فخر ہے آغا بزرگ کے مکان میں جو لوگ مجھے ملے وہ تمام شیعہ تھے۔ اور میرے ساتھ اُنہوں نے ایسا ہی برتاؤ کیا جیسا کہ شیعہ سُنیوں سے کرتے ہیں چنانچہ کئی فقرے اُنہوں نے طنز آمیز کہے۔ آغا بزرگ نے ہنگام گفتگو کہا کہ سلطان روم کی بڑی غلطی ہے کہ یوروپ کی طاقتوں سے رابطہ اتحاد قایم کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی سلطان کی تعریف بھی کر دی کہ اسکے زمانہ میں شیعہ لوگ جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو حج کے لیئے جاتے ہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پاتے۔ ورنہ پہلے شیعوں کو بہت مصیبتیں راہ میں پیش آتی تھیں۔ بے تکلفی سے بچنے اور اپنا وقار قایم رکھنے کے لیئے آغا بزرگ بہت کم بولتا تھا۔ چنانچہ اِس لیئے وہ تناول طعام کے بعد بہت جلد خود سرائے میں چلا گیا۔

اصفہان میں پہنچے دیکھا کہ وہاں کے متوسط درجہ کے باشندے بڑے ذہین اور تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ لوگ عموماً کفش دوز۔ درزی یا دکاندار تھے۔ مگر ایران کے بڑے بڑے شعرا کی غزلیات اور اشعار انکو ازبر تھے۔
اصفہان کے لوگ عموماً بڑے عقلمند زندہ دل اور بذلہ سنج ہوتے ہیں۔
ملکم صاحب نے انکی بذلہ سنجی کے متعلق ایک بڑی دلچسپ حکایت لکھی ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک سوداگر محاصل سرکار ادا نہ کر سکا اور حاجی ابراہیم کے بھائی نے جو ان ایام میں گورنر اصفہان تھا اُس کو اپنے روبرو طلب کیا۔ اور ان دونوں میں مفصلہ ذیل گفتگو ہوئی:۔

گورنر۔ "اگر تو روپیہ ادا نہیں کر سکتا تو یہاں سے چلا جا دفع ہو جا۔"

سوداگر۔ "کہاں جاؤں؟"

گورنر۔ "شیراز میں جا یا کاشان میں چلا جا۔"

سوداگر۔ "تو اسکے یہ معنے ہوئے کہ کڑاہی میں سے نکلکر تنور میں کود پڑوں۔"

گورنر۔ "اسکے کیا معنے؟"

سوداگر۔ "شیراز میں تمہارا چچا زاد بھائی اور کاشان میں تیرا حقیقی چچا حاکم ہیں۔"

گورنر۔ "تو جا بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو کر استغاثہ کر۔"

سوداگر۔ "وہاں بھی جانا فضول ہے۔"

گورنر۔ "وہ کیسے؟"

سوداگر۔ "وہاں تمہارے بھائی صاحب وزیر اعظم ہیں۔"

گورنر۔ "تو پھر سیدھے جہنم میں چلے جاؤ۔"

سوداگر۔ "چلا تو جاؤں مگر حضور کے والد ماجد کو مرے بہت عرصہ نہیں ہوا۔"

یہ سُن کر گورنر ہنس پڑا۔ اور اُسکا قرضہ اپنی جیب خاص سے ادا کر دیا۔ اصفہان میں میں اپنے دوست مرثیہ خوان کے ساتھ ایک ہی مکان میں مقیم تھا۔ یہہ شخص بھی عجیب آدمی تھا۔ چشم زدن میں رونے لگ جاتا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ اصفہان میں اُس نے خوب مرثیے سُنائے۔ مسجد میں کھڑے ہو کر اور بازار میں کھڑے ہو کر خوب ماتم کیا اور لوگوں کو رولایا۔ تمام دن تو یہ تصویر ماتم بنا رہتا تھا۔ اور جب شام کو گھر آتا تھا تو اُسکی قلب ماہیت ہو جاتی تھی اور ایک قلم لطیفہ گو اور بذلہ سنج انسان بنجاتا تھا۔ میں اسکے ساتھ ہر قسم کے لوگوں کی مجلس میں جاتا اور وہ جہان جاتا تھا اُسکی تعظیم و تکریم ہوتی تھی۔ پہلے تو یہ چند لغتیں گاتا تھا۔ اور پھر بہت جلد غزلیات شروع کر دیتا تھا۔ ہر چند کہ اپنے آپ کو سید کہتا تھا۔ اور ہر وقت سبز عمامہ باندہے رہتا تھا۔ مگر پرلے درجہ کا مے پرست اور بادہ گسار تھا۔ اصفہان کے باشندوں کو اپنے شہر پر بڑا ناز ہے اور وہ اپنے آپ کو دیگر ایرانیوں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ بادشاہ کو اور شاہی خاندان کو اور اُنکے ترک سپاہیوں کو وہ نظر حقارت سے دیکھتے ہیں اور اُن سے ڈرتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک امام جمعہ بادشاہ سے بالاتر ہے۔ اس آغا بزرگ کی نسبت بہت سی روایات مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ بڑا مالدار ہے اور ایک ہزار عود نواز اُسکے ہاں ملازم ہیں۔ یہ گویّے آغا صاحب کی تعریف میں جہاں جاتے ہیں پُل باندہتے ہیں۔ اور بادشاہ اور شاہی خاندان کی دل کھولکے بُرائیاں کرتے ہیں۔ یہ گویّے یہانتک کہتے ہیں کہ امام جمعہ معجزے دکھا سکتا ہے۔ بادشاہ اور اِس شخص کے درمیان اسی وجہ سے دوستانہ ارتباط نہیں کہ وہ بادشاہ کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

اصفہان میں میں دو ہفتہ تک رہا اور اس عرصہ میں مجھکو قابل دید مقامات کے دیکھنے اور مختلف لوگوں سے ملنے کا بہت اچھا موقعہ ملگیا۔ اسکے بعد اسی کاروان سالار سے ہم نے یہاں سے آگے کے سفر کا معاملہ ٹھہرایا اور ایک مقررہ وقت پر تمام ہمسفر شہر سے باہر کاروانسرائے میں جمع ہوگئے یہاں تین دن اور لگ گئے۔ اور مینے اُنکو بھی چھوٹی اور مختصر سیروں میں گذارا۔ یہاں رہکر میں نے جو چیزیں دیکھیں اُن میں لرزاں منار جن کو منار جم جم کہتے ہیں۔ میرے خیال میں قابل بیان ہیں۔ یہ دو منار خالدان کی مسجد کے منار ہیں۔ جو اصفہان سے ایک گھنٹہ کی راہ پر ہے یہ قریباً بارہ فٹ بلند ہیں۔ اور ایک دوسرے سے بیس قدم کے فاصلہ پر ہیں۔ میں اپنے رفیق کے ساتھ جو مجھے یہ منار دکھانے لیگیا تھا بالائے بام گیا۔ اور اُس نے ایک منار کو دونوں ہاتھوں سے پکڑکر خوب زور سے ہلایا۔ اُس کے ہلانے سے مجھے اِس قسم کی جنبش نہ صرف مناروں میں بلکہ تمام مکان میں معلوم ہوئی جو زلزلہ کے وقت محسوس ہوتی ہے۔ افسوس کہ اِن مناروں کے معمار نے یہ حکمت کیکو نہیں بتائی۔ اور یہ قابلیت اپنے ساتھ ہی قبر میں لیگیا۔ یہ منار بار بار ہلانے سے اب خراب حالت میں ہیں۔ اور عوام الناس کا یہ خیال ہے کہ یہ منار اِس لئے ہلتے ہیں کہ اسکے نیچے ایک ولی اللہ دفن ہے۔

اصفہان سے روانہ ہوکر ہم جنوب کے پہاڑوں کیطرف روانہ ہوئے پہاڑ کی بلندی پر کھڑے ہوکر پھر میں نے اصفہان کے بیشمار مکانوں اور باغات پر نظر ڈالی۔ ہمارے قافلہ میں جسکے تین حصے تھے (یعنی دو حصے فقط شیراز تک جانے والے مسافروں کے تھے) اب ایک سو پچاس مولیشی اور

ساٹھ مسافر تھے۔ اِس آباد راستے میں بھی ہمارا قافلہ بڑا بھاری قافلہ معلوم ہوتا تھا۔ اہل قافلہ نے دانستہ اس قافلہ میں چھوٹے چھوٹے قافلے اِسلئے شامل کرلئے تھے کہ بعض ایرانی خانہ بدوش قومیں پہاڑوں میں پڑی تھیں اور چھوٹے چھوٹے قافلوں کو طمع یا اول لگی سے لوٹ لیا کرتی تھیں۔ چنانچہ چند دِن ہوئے تھے کہ ایک چھوٹا قافلہ اُن لوگوں نے لوٹ لیا تھا۔ ممالک مشرق میں لوگوں کو جھوٹی باتیں بتانے کا بڑا شوق ہے وہ جھوٹ سوٹ ہم کو کہدیں گے کہ یہاں کل دس آدمی قتل ہوئے تھے یہاں ایک سوداگر کا مال لُٹ گیا۔ مگر ہمکو چاہیئے کہ ان باتوں سے مطلق نہ ڈریں اور دلمیں سمجھیں کہ یہ واقعہ جو وہ ہم سے بیان کررہے ہیں یا تو ہوا ہی نہیں۔ یا دس سال گذشتہ کی بات ہے۔ اِس قسم کی کہانیوں کے بیان کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ مشرق میں ایرانیوں سے بڑھکر کوئی بزدل قوم نہیں۔ یہ لوگ اپنے سائے سے ڈرتے ہیں۔ جرات اِنمیں بہت کم ہوتی ہے۔ اِس لئے ہمارے اہل قافلہ کو جنمیں یا تو زائر تھے یا سوداگر یا مولوی۔ ایسی ہی کہانیاں سُناکر ڈرانے کی کچھ ضرورت نہ تھی ابھی ہم شہر سے تھوڑے ہی فاصلہ پر گئے تھے کہ تمام اہل قافلہ اکٹھے ہوکر اِس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگے کہ جیسے ابھی کوئی آیا اور گردن ناپی۔ یہ بیچارے اس قدر ڈرے ہوئے تھے کہ مارے ڈر کے بلند آواز سے بولتے تک نہ تھے۔ اور جب کوئی بات کرنی ہوتی تھی تو سرگوشیاں کرتے تھے۔ اِس قافلہ میں ایک شراب فروش بھی تھا۔ اُس نے چار خچروں پر شراب لادی ہوئی تھی۔ اُس شخص کو ایک ملّا نے کہا کہ تو علیحدہ ہوکر چل مبادا تیرے گناہ کے پاداش میں تمام قافلہ پر کوئی آفت نازل ہوجائے

ہرچند کہ حجرے والے نے کہا کہ صاحب میں نے تمام عمر میں کبھی شراب چکھی تک نہیں۔ میں تو یہ مبنی کو لئے جاتا ہوں تاکہ کافر فرنگی اسے پئیں۔ مگر اُسکی بات کو کسی نے نہ سُنا۔ پھر اُس نے تمام اولیاؤں کے نام لے لیکر قسمیں کھائیں اور کہا کہ مجھے یہ خبر بھی نہیں کہ اِس شراب کا رنگ سفید ہے یا سُرخ ہے۔ مگر ملاؤں نے نہ مانا اور قافلہ سے ایک سو فیٹ کے فاصلہ پر اُسے ہٹا ہی دیا۔

دوسرے دن ہم کو شاک میں پہنچے۔ یہ مقام اُس خوفناک جگہ کے قریب ہے جسکی نسبت ہم نے بہت سی ہولناک کہانیاں سُنی تھیں۔ اِس موقعہ پر مرثیہ خوان دوست نے کہا کہ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں مجھے ایک نعت پڑھنی چاہیئے۔ تاکہ رسالت پناہ مہربان ہو کر ہماری حفاظت کریں۔ مگر دراصل اُس کا منشا یہ تھا کہ یہ زود اعتقاد لوگ اُس موقعہ پر کچھہ نہ کچھہ دے ہی نکلیں۔ اہل قافلہ نے فوراً اِس تجویز کو پسند کیا۔ ایرانی امام حسین کی شہادت کا حال سننے کے لیئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ چاہے وہ کتنے ہی خوش اور خرم ہوں۔ مگر جہاں امام حسین کا نام آیا اور اُنکی آنکھوں سے دریائے اشک جاری ہوا۔ بغدادی مرثیہ خوان نے فوراً ایک مرثیہ شروع کیا۔ اور ابھی بمشکل وہ چوتھے بند تک پہنچا تھا کہ تمام اہل قافلہ اِس طرح ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگے جیسے کہ اُنکا کوئی قریبی رشتہ دار ابھی مر گیا ہے۔ اور اُنکے روبرو مردہ پڑا ہوا ہے۔ مرثیہ خوانوں کا دستور ہے کہ جب ہنگام مرثیہ خوانی دیکھتے ہیں کہ اب حاضرین پر رقت طاری ہو نے والی ہے تو دفعتاً اپنی چھاتی برہنہ کر کے کہتے ہیں " محبان حسین اُس مظلوم کی پیاس یاد کرو اور یہ کہکر سینہ کوبی شروع کر دیتے ہیں یہ حال دیکھکر تمام حاضرین مرثیہ خوان کی تقلید کرتے ہیں۔ اور چاروں طرف سے

حسین حسین کی آوزیں آنے لگتی ہیں۔ اور عزادار اس زور سے سینہ کوبی کرتے ہیں کہ بلا مبالغہ اُس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سینہ پر مُکے نہیں مار رہے۔ بلکہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آرہی ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک جگہ ماتم ہو رہا تھا۔ میں بھی عزاداروں کے حلقہ میں کھڑا سینہ پر ہاتھ مار رہا تھا۔ ایک عزادار نے میرے پاس کھڑے ہوکر مجھے دیکھا اور بلند آواز سے کہا کہ اس کُتّے سُنّی کیطرف دیکھو کیسے آہستہ آہستہ ہاتھ چھاتی پر مارتا ہے۔ یہ غریب حسین کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اُسکے ماتم میں زور زور سے سینہ کوبی کرے یہ کہکر اُس نے زور سے مُکا اُٹھایا۔ اور چاہا کہ میرے سینہ پر دے مار کر مجھے بتائے کہ اس طرح سینہ کوبی کیا کرتے ہیں۔ مگر میری خوش قسمتی سے میرے رفیق مرثیہ خوان نے عین وقت پر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا ورنہ یقین تھا کہ اُس مُکے کی چاشنی مجھے تمام عمر یاد رہتی۔ اس رفیق نے مجھے اس مکّے سے جو بجائے خود ایک ہتھوڑا تھا بچایا۔ اور کہا "اس سُنّی کے معترض حال نہ ہو۔ اگر اس دنیا میں یہ اچھی طرح سینہ کوبی نہیں کرتا تو عزرائیل اگلے جہان میں قرار واقعی اسکی سینہ کوبی کردیگا"

ہم اس دشت پُرخطر سے مع الخیر نکل کر یزد خواست کیجانب روانہ ہوئے مینے اپنے ارد گرد نگاہ کی اور دیکھا کہ یہاں میدان پہلے سے زیادہ سپاٹ ہوگیا ہے۔ اور یہ دشت جسکے وسط میں شہر یزد واقع ہے۔ مشرق کی طرف دور تک چلا گیا ہے۔ میدان میں گھاس اُگی ہوتی ہے۔ لیکن گرمی کے باعث یہ گھاس سبز نہیں ہے۔ کہیں کہیں سے میدان ناہموار بھی ہے۔ میرے رفقا نے مجھے بتایا کہ یہاں شکار کثرت سے ملتا ہے۔ اور ایک قسم کا ہرن جسکو غزال کہتے ہیں بہت ہوتا ہے۔ ان رفقا کی بات سچ نکلی۔ میں نے جو ذرا غور سے دیکھا تو کچھ ہی فاصلے پر

ایک گلہ ہرنوں کا دور سے چرتا ہوا مجھے نظر پڑا۔ یہ غزال خوشبو سے معلوم کر لیتے ہیں کہ فلاں مقام پر قافلہ آرہا ہے۔ اور دور سے ہی قافلہ آتا دیکھکر اس طرح چوکڑیاں بھرتے ہوئے پرندوں کی طرح ہوا ہو جاتے ہیں۔ ان ہرنوں کا رنگ خشک گھاس سے بالکل ملتا جلتا تھا جب دور سے مینے انکو دیکھا تو پہلے میں نے نہ پہچانا کہ یہ ہرن ہیں میرے رفیق نے اشارہ سے مجھے بتایا کہ وہ دیکھو آہو آئے۔ اور پھر مینے انکو انکی پچھلی ٹانگوں سے جو سفید ہوتی ہیں پہچانا جس طرح ہم میں خرگوش ڈرپوک جانور ہے اسیطرح غزال مشرق میں ڈرپوک سمجھا جاتا ہے۔ جانور کے اڑنے کی آواز سے اور بسا اوقات پتوں کے ہلنے کی آواز سے سو سوا سو ہرنوں کا تمام گلہ جو چپ چاپ چر رہا ہوتا ہے چونک کر چوکڑیاں بھرتا ہوا فرار ہو جاتا ہے۔ جس وقت شکاری یا تازی کتا کسی ہرن کو آدباتا ہے تو یہ بیچارہ زمین پر لیٹ کر اپنی ٹانگیں آسمان کیطرف کر دیتا ہے۔ اور اس طرح خوبصورت مگر حسرت بھری آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ انسان کو خواہ مخواہ اس بیزبان پر رحم آجاتا ہے۔ اس وقت میں غزالوں کو چوکڑیاں بھرتے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں میری نگاہ جنوب مشرق کی طرف جا پڑی۔ اور میں نے ہوا میں چھلاوہ دیکھا۔ دشت ایران میں اس قسم کے نظارے کرۂ ہوا میں اکثر نظر آتے ہیں۔ اگرچہ یہ نظارے اس قدر شاندار نہیں ہوتے جس قدر کہ ترکستان کے بے آب و علف جنگلوں میں دکھائی دیتے ہیں پھر بھی انکو دیکھ کر مجھے خوشنما منگرین آلنفولڈ بستہ میں کا خوشنما منظر یاد آگیا۔ اس وقت میں ایک کنوئیں پر جو اس جنگل میں بنا ہوا تھا کھڑا ہو گیا۔ یہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ یہ جنگل اس قدر خشک تھا کہ اس کا تشنہ وار بیابان اور اضطراب اسے سمندر کے خواب دکھا رہا تھا۔ اس خشک

جنگل میں سُراب مجھے دکھائی دیا۔ اور اُسکو دیکھکر مجھے اپنا وطن یاد آیا۔ مگر اتنے میں ایک بگولہ گرد و غبار کا آیا۔ اور اُس نے یہ خوبصورت نظارہ میری آنکھوں کے سامنے سے معدوم کر دیا۔

صوبہ فارس جہاں کے باشندے ایرانیوں سے اسقدر مختلف ہیں جسقدر کہ نیپلز کے باشندے شمالی اٹلی کے باشندوں سے ہیں یزد خاست سے آگے شروع ہوتا ہے۔ صوبہ فارس کے باشندے زیادہ تر زندہ دل۔ تیز طبیعت اور ذہین ہوتے ہیں۔ اُنکا رنگ بہ نسبت ایرانیوں کے کسیقدر سانولا ہوتا ہے۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر اُن قافلوں کی بدولت جو یہاں سے گذرتے ہیں اپنی روٹی کماتے ہیں۔ جب ہم صوبۂ فارس میں داخل ہوئے تو ہمنے پہلا قیام شلغستان میں کیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں امام حسن العابدین کے فرزند کی قبر ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس خانقاہ میں چند چور بہ ارادہ فاسد داخل ہوئے۔ مگر یہاں آتے ہی اُنکی بصارت جاتی رہی۔ جب ہم وہاں گئے تو معدود الحدہ یہ ہمیں ایک اندھا فقیر ملا۔ میرے رفقا نے مجھے کہا کہ یہ فقیر اُنہیں قزاقوں میں سے ہے۔ جو یہاں چوری کرنے آئے تھے اور اندھے ہو گئے تھے۔ مینے اس فقیر سے اصل حال دریافت کیا۔ اور اُس نے میرے روبرو تسلیم کیا کہ نہ تو میں چور ہوں۔ نہ چوروں کا بھائی ہوں۔ یہ تمام پیٹ کے دھندے ہیں۔ اس حیلہ سے روٹی کماکھاتا ہوں۔ جو لوگ یہاں زیارت کو آتے ہیں وہ مجھے کچھ دیجاتے ہیں۔

جب ہم اُس مقام سے روانہ ہوئے تو راہ میں ہمیں ایک سوار ملا۔ جو ایک معزز آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اُسکے ساتھ کئی ملازم تھے۔ جب یہ ہمارے قافلہ کے پاس آیا تو ہم سب کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کا منشا وہ تھا

کہ کس شخص کو ہم میں سے رفیق راہ بنائے آخرکار وہ میری طرف آیا۔ اور نہایت تپاک سے علیک سلیک کی۔ یہ شخص شاہ ایران کے حکم سے فارس کو جارہا تھا۔ گورنر فارس کے ذمہ مبلغ پانچہزار ڈکٹ[1] بابت محاصل کار سر واجب الادا تھے۔ جو اس نے ابتک ادا نہیں کئے تھے۔ اس لئے بادشاہ سلامت نے اس شخص کو بھیجا تھا کہ تم جاکر روپیہ وصول کرلو۔ اگر گورنر روپیہ ادا نہ کرے۔ تو چند دن کے لیئے اسکو نظر بند رکھو۔ اور اگر اس سے بھی مطلب براری نہ ہو۔ تو اسکا قلیان (حقہ) بند کردو۔ روپیہ جمع کرنے کا یہ عجیب طریقہ ایران میں عام ہے۔ یہ سوار جو فی الحقیقت خان تھا۔ ایک مہذب اور تعلیم یافتہ بے تعصب شخص تھا۔ اسکے نزدیک سنی اور شیعہ برابر تھے۔ اس نے قافلہ میں مجھے تعلیم یافتہ دیکھکر منتخب کیا۔ مجھے بھی اسکے ملنے سے مسرت ہوئی۔ اور واقعی ہمارا راستہ بہت اچھا کٹ گیا۔ چنانچہ ہم دونوں دوسرے پڑاو پر اکٹھے اترے اور اکٹھا ہی ہم نے کھانا کھایا۔ اس دوسرے پڑاو کا نام آبادی تھا۔

آبادکی سے روانہ ہوکر ہم سرمہ نامی ایک مقام پر پہنچے۔ راہ میں ہمکو کئی چھوٹے چھوٹے قافلے حاجیوں کے ملے۔ انمیں سے بعض حاجی تو جانب

[1] زمانہ سابق میں ڈکٹ (Ducat) ایک سکہ چاندی اور سونے کا الگ الگ یورپ کے مختلف ممالک مثل اٹلی آسٹریا اور روس میں مروج تھا۔ چاندی کے سکہ کی اوسط قیمت تین سی چار شلنگ (یعنی سے لے رکم) اور سونے کے سکہ کی قریب نو شلنگ چار پنس (قریب سات روپے) کے ہوتی تھی۔ غالباً یہاں چاندی کے ڈکٹ سے ایرانی سکوں میں طومان ہندوستان کے پانچ روپیہ آٹھ آنہ کے قریب ہوتا ہے اور قران جسے قران بھی کہتے ہیں سو دس آنہ کے قریب ہوتا ہے اسلئے معلوم نہیں یہاں ڈکٹ سے کونسا ایرانی سکہ مراد ہے۔

مغرب کربلائے معلےٰ کی زیارت کو جا رہے تھے اور بعض بسوئے مشرق مشہد کیجانب عازم سفر تھے۔ ایران میں موسم بہار اور خزاں میں لاکھوں حاجی (زائر) دیکھنے میں آتے ہیں۔ غریب سے غریب ایرانی بھی ضرور حج کرتا ہے وہ بھوکا مرتا قبول کرتا ہے مگر اس عمل خیر سے باز نہیں رہتا۔ یہ قافلہ جو ہمکو راہ میں ملا بندر بوشہر سے آیا تھا۔ اور کربلا کی جانب جا رہا تھا یہ چار ماہ کا سفر ہوتا ہے۔ دو ماہ جانے میں اور دو ماہ آنے میں لگتے ہیں حاجیوں کی آمد و رفت سے ایران کے رستوں میں رونق رہتی ہے۔ ان قافلوں میں دس برس کے بچے اور اسی اسی سال کی عورتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ بعض اوقات دو قافلے جنمیں سے ایک کربلا کی طرف جا رہا ہوتا ہے اور دوسرا واپس آ رہا ہوتا ہے راہ میں دو چار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت آنے والے قافلے کے مسافر جانے والے قافلے کے مسافروں سے کہتے ہیں ہمارے لئے بھی دعا مانگنا۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ خدا تمہارا حج قبول کرے۔ یہ لوگ آپسمیں اکثر بغلگیر ہوتے ہیں۔ اور انکے مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوئے اشعار وقت شب سخت سے سخت دل پر بھی اثر کرتے ہیں اہل قافلہ نے مجھے اطلاع دی کہ ہماری دوسری جائے قیام مادر سلیمان میں۔ کئی کھنڈرات قدیم زمانہ کے موجود ہیں۔ اور سلیمانؑ کی والدہ کی قبر بھی اسی گاؤں میں ہے۔ یہ گاؤں جس کا نام مادر سلیمان ہے در اصل ایک میدان میں واقع ہے جسکو پسر گدا کہتے ہیں۔ اور اسی جگہ لوگوں کا خیال ہے کہ کیخسرو کا مزار ہے جب ہم پہاڑوں سے اترکر گھاٹی میں داخل ہوئے تو میں نے اپنے دست راست سڑک پر کئی بت پتھر کے دیکھے جو سورج کی کرنوں سے سنہری ہو رہے تھے۔ اس وقت قافلہ نہایت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اور میں صبر نہ کر سکا تھا مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں قافلہ سے آگے ہی اس مقبرہ میں پہنچا اور جب کچھ عرصہ کے بعد قافلہ بھی وہاں پہنچا تو میں اس مقبرہ کے سنگ مرمر کے زینہ پر پہلے سے ہی بیٹھا ہوا تھا۔

فصل چہاردہم

تخت جمشید

پسرگرد کے مقبرے کی نسبت مختلف روایات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس مقبرے میں مادر سلیمان کی قبر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ نہیں یہاں کیخسرو[1] دفن ہوا تھا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ نہ تو مادر سلیمان کا مزار ہے اور نہ کیخسرو کی تربت ہے۔ یہاں کوئی اور ہی ولی اللہ سو رہا ہے۔ یہ مقبرہ تمام و کمال سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اور اسکی کرسی میں چھ سیڑھیاں ہیں ہر ایک سیڑھی ایک بڑا بھاری تختہ سنگ مرمر کا ہے۔ جب سیڑھیوں سے چڑھ کر دیکھو تو معلوم ہوتا ہے ایک بڑا دالان خالص سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اس مقبرے کا فرش اور چھت ہر ایک صرف ایک لمبی چوڑی سنگ مرمر کی سِل ہے۔ اس کا تنگ دروازہ ہر وقت کھُلا رہتا ہے۔ مقبرے کے اندرونی حصہ میں مسلمان بیٹھکر عبادت کرتے ہیں۔ چنانچہ وہاں کئی قرآن شریف ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ میں بڑی مشکل سے اس تنگ دروازہ سے اُس مقبرے میں داخل ہوا اور مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے بڑے ٹکڑے سنگ مرمر کے کس طرح اُٹھا کر

[1] انگریزی میں Cyrus سائیرس لکھا ہے جسے بعض بعض کیخسرو کہتے ہیں اور بعض کیقباد اس سے مراد لیتے ہیں کیونکہ انگریزی مصنفین کیخسرو سائیرس اعظم سے مراد لیتے ہیں جو کیقباد کا پوتا تھا۔

یہاں لائے گئے ہونگے۔ میں ہرچند سوچتا تھا۔ مگر عقل کام نہ کرتی تھی اندر جاکر مینے دیکھا کہ بہت سے یورپین سیاح جو وقتاً فوقتاً یہاں آئے ہیں اپنے نام سنگ مرمر کے تختوں پر کندہ کرگئے ہیں۔ اِس مقبرے کی دیواروں پہ جابجا کتبے عربی اور فارسی زبان میں کندہ تھے۔ میں ایک جگہ کھڑا ہوا فارسی زبان کا ایک کتبہ پڑھ رہا تھا۔ کہ ایک خانہ بدوش کچھ لینے کے طمع سے میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔" حاجی صاحب اِس قسم کے ٹکڑے سنگ مرمر کے بغداد میں نہیں ہیں۔ میرے ساتھ تشریف لائیے۔ اودمیں آپکو اور بہت دکھاؤنگا۔ قدیم گونری کے کھنڈرات کا ملاحظہ فرمائیے۔ یہ شخص مجھے اُس مقام پر لیگیا جسے تخت سلیمان کہتے ہیں۔ یہاں مینے ایک بڑا بھاری محراب سنگ موسیٰ کا دیکھا۔ اگر کوئی شخص اس محراب کو دیکھکر متعجب ہو تو ایرانی اُسکو کہتے ہیں۔" بھائی صاحب کیا آپکو معلوم نہیں کہ جنات حضرت سلیمان کے تابع فرمان تھے۔ اُنکے ذرا سے اشارہ پر جن بڑے بڑے ٹکڑے پہاڑوں کے ہندوستان۔ چین ماچین۔ اور کوہ قاف سے اُٹھا لاتے تھے۔

اُس جگہ سے کئی گھنٹوں تک ہم نے درہ کوہ میں سفر کیا۔ اور سیوند نامی گانوں کیطرف بڑہے۔ ہم اُس گاؤں کے اندر نہیں گئے۔ کیونکہ اُن ایام میں گرمی کے باعث یہاں کے باشندے پہاڑ کی چوٹی پر جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ تقریباً ایک سو بیس جھونپڑیاں موجود ہیں۔ یہ تمام بستی دور سے ایک بازار معلوم ہوتی تھی۔ یہ جھونپڑیاں اس طرح پر بنی ہوئی تھیں کہ تین طرف سے تمام بند تھیں۔ اور چوتھی طرف سے تمام ہر وقت کھلی رہتی تھیں۔ اِس لیئے یہ تمام جھونپڑیاں ایک ہی مکان دکھائی دیتی تھیں۔ ایک سو بیس کنبے وہاں رہتے تھے۔ اور گو اُنمیں امیر اور غریب سب موجود تھے مگر

انہیں کبھی چوری کا ارتکاب نہیں ہوتا تھا۔ لوگوں نے مجھے کہا کہ یہ تمام گاؤں ایک ہی عورت کی اولاد ہے۔ اور اُنکا سردار اُنہیں کے کنبہ کا آدمی ہے جو اس گانوں کا قاضی اور نمبردار ہے۔ اور سب سے علیحدہ ایک سفید خیمہ میں رہتا ہے۔

اِس جگہ سے ہم اکتوبر کی دوسری تاریخ کو روانہ ہوئے۔ اور راستے ہم نے ایران کے اُس حصہ کیطرف رُخ کیا جو تمام ایران میں سب سے بڑھکر دلچسپ ہے۔ ہمارا قافلہ اب کنارے کے قریب آگیا تھا۔ جسکے قرب وجوار میں پرسی پولس کے مشہور کھنڈرات موجود ہیں۔ ہمارا قافلہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اور مجھے یہ انتظار نہایت گراں گذر رہا تھا۔ اس لیئے میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ کسی سے نہایت اقرب راستہ پوچھکر خود وہاں چلا جاؤں۔ جب ہمارا قافلہ بوقت نیم شب سبنیل سے روانہ ہوکر ماروشت کے قریب پہنچا تو میں قافلہ سے جُدا ہوکر جانب دست چپ روانہ ہوا۔ کچھ عرصہ تک قافلے کے جرس کی آواز آتی رہی میں چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا۔ پاؤ گھنٹہ کے بعد مجھے صبح کاذب کی روشنی میں بڑے بڑے ستون دکھائی دینے لگے۔ میرے چاروں طرف سناٹا تھا۔ وحشت برس رہی تھی۔ اس خاموشی میں میرے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز دور تک جاتی تھی۔ آخرکار میں ان سیڑھیوں کے پاس پہنچگیا۔ جو بہت سے لوگوں نے دیکھی ہیں۔ کیونکہ اُنپر میں نے بہت سے لوگوں کے نام کندہ دیکھے۔ یہاں میں اپنے گھوڑے سے اُتر پڑا۔ اور نہایت عقیدت اور دلی خلوص کے ساتھ اُس عظیم الشان دروازے سے گذر کر اُن بڑے بڑے ستونوں کی قطار کے قریب گیا۔ جہاں میں ایک پتھر کے چٹان پر بیٹھ گیا۔ اور میرے دل میں طرح طرح کے خیالات اُٹھنے لگے

مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اِن چار ہزار برس کے پُرانے کھنڈرات نے مجھکو بھی پتھر کا بت بنا دیا ہے۔ پرسی پولس کے قدیم اور عظیم الشان کھنڈر سیاح کے دل پر اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ دِن دہاڑے خواہ کسی طرف سے اُنکو پہلے پہل دیکھو انکی عظمت جی میں بیٹھ ہی جاتی ہے۔ اِس سے خیال کیا جا سکتا ہے کہ مجھ جیسے شخص پر جو ایک عرصے سے اُنکی سیر کیلیئے مضطرب تھا اور یکلخت مُنہ اندھیرے اُنکا سماں اُسپر نمودار ہو گیا۔ اُنہوں نے کیسا اثر کیا ہوگا۔ جس وقت کہ میں اِن بلند ستون کو بیٹھا گھور رہا تھا۔ وہ زبان حال سے ایک غریب مسافر کو جو یورپ سے راستہ بہولکر یہاں آگیا تھا۔ چالیس صدیوں کی کہانی سنا رہے تھے۔ اِن خیالات میں میں بڑی دیر تک غرقاب رہا۔ اور جب سورج اچھی طرح نکل آیا تو میں اِس خواب غفلت سے جاگا۔ اور میں نے دیکھا کہ رات کا نظارہ بالکل بدل گیا ہے وہ ستون جو رات کی تاریکی میں سیاہ فام نظر آرہے تھے۔ اُس وقت سورج کے دریائے نور میں غوطہ زن تھے اور اُنپر ایسی عجیب شان و شوکت برس رہی تھی کہ اُنکو دیکھکر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی کاریگر نے اپنی سنگ تراشی کا نمونہ دکھایا ہو صدیاں گذر گئی تھیں۔ مگر اللہ رے صنعت کہ یہ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ابھی حال میں بنائے گئے ہیں۔ اِن ستونوں پر عجیب عجیب نقش تھے۔ اور پتھر کو اِس طرح تراشا گیا تھا کہ سبحان اللہ۔ ایک جگہ پر ایک جلوس دکھایا گیا تھا جس میں لوگ قدم بقدم جا رہے تھے۔ ایک طرف چند قیدی جنکی گردنیں ایک زنجیر سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ تہیں۔ فتح نصیبوں کے روبرو گردن جہکائے جا رہے تھے۔ ایک طرف ایک پہلوان کسی دیو سے کشتی لڑتا دکھائی دیتا تھا اور پرلی طرف ایک بادشاہ آگ کے روبرو بڑی متانت کے ساتھ بیٹھا ہوا

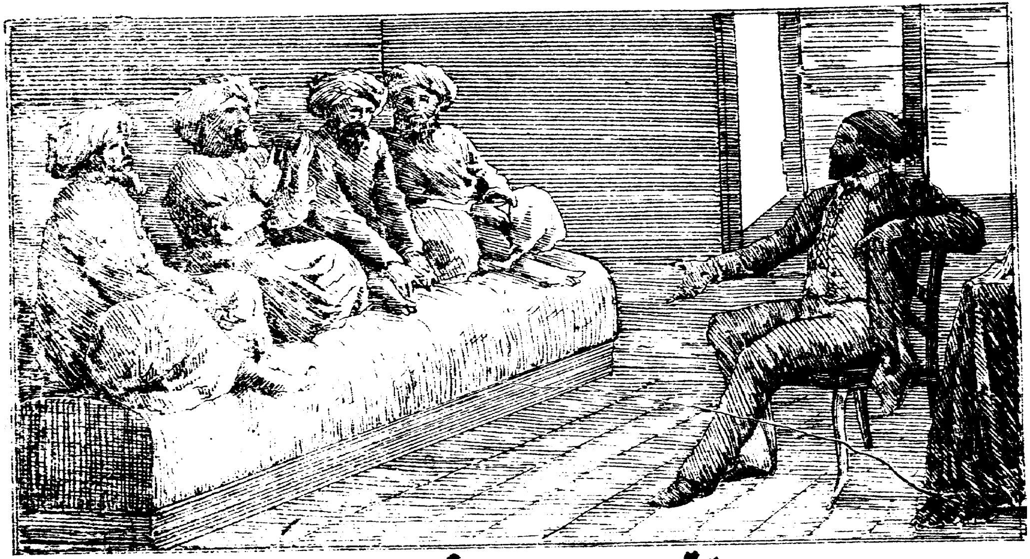

تاتاریوں سے دوستی گانٹھنا

دکھائی دیتا تھا۔ اور اُسکے پیچھے دو فد متگار کھڑے ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ایک لمبا عصا اور دوسرے کے ہاتھ میں چتر تھا۔ اِن تصویروں میں کمال یہ تھا کہ پوشاکیں اصل پوشاکوں سے ملتی تھیں اور چہرے اس قابلیت سے بنائے ہوئے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرو اور بیجان سنگ مرمر کی تصویر ابھی مُنہ سے بولا چاہتی ہے۔

اِس عجیب وغریب مقام میں میں نے تین دن تک قیام کیا۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں نہ صرف عام مسافروں کو تعجب آتا ہے بلکہ بڑے بڑے مشتاق اور تجربہ کار سیاح مثل تصویر حیران رہجاتے ہیں۔ انسان نہیں جانتا کہ کس کس چیز کی تعریف کرے۔ صنعت کو دیکھو تو لاثانی ہے۔ اور مذاق کو دیکھو تو بے نظیر۔ جو حال یہاں ہے وہی مصر میں ہے۔ کاریگروں نے چالیس چالیس اور پچاس پچاس فیٹ لمبے تختے سنگ مرمر کے اس خوش اسلوبی کے ساتھ پیوستہ کیئے ہیں کہ یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں جوڑ لگا ہے۔

اس مقام پہ مجھے چند خانہ بدوش تُرک ملے۔ جو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے غالباً اُنہوں نے مجھے بھی ترکی نژاد سمجھا ہوگا۔ فارس میں ترکی زبان بہت کم بولی جاتی ہے۔ جب میں نے اُنسے اُنکی مادری زبان میں گفتگو کی تو یہ بہت خوش ہوئے اور جبتک میں یہاں رہا اُنہوں نے میری خوب خاطر تواضع کی ہر روز مجھے دودھ اور روٹی کھلاتے رہے اور میرے گدھے کو بھی دانہ اور گھاس دیتے رہے۔ اِنمیں سے بعض نے مجھے کہا کہ اِن کھنڈرات میں رات کے وقت نہ رہنا۔ کیونکہ وہاں دیووں اور جنوں کی سکونت ہے یہ مقام تخت جمشید (جو پرسی پولیس کا ایرانی نام ہے) بقول اُنکے شاہ جمشید نے جنات کی امداد سے بنوایا تھا۔

کہتے ہیں کہ جمشید کے پاس ایک پیالہ تھا جس کا نام جام جمشید مشہور ہے۔ اُسکے مُنہ سے لگاتے ہی جو خواہش دلمیں ہوتی تھی پوری ہوجاتی تھی۔ پیالہ کو ہونٹوں سے لگاتے ہی مشرق سے پتھر اور مغرب سے کاریگر وہاں آجاتے تھے۔ بہت سے اشعار جو دیواروں پر لکھے ہوئے ہیں اُنسے واضح ہوتا ہے کہ ایرانی تخت جمشید کو مقدس سمجھتے ہیں۔ ایران میں یہہ روایت مشہور ہے کہ یہ تخت جمشید جب تک قایم رہا اور اصلی حالت میں رہا ایران نہایت آباد اور عمدہ حالت میں تھا۔ جب عربوں نے ایران پر قبضہ کیا تو ان عمارات کی وجہ سے اہل تشیع کے حاسد ہو گئے۔ اور لوٹ مار کرکے اس مکان کو مسمار کر گئے۔ اُنکے جانے کے بعد فرنگی بندر بوشہر کے راستے سے آئے اور نہ صرف اس جگہ کو لوٹا۔ بلکہ بہت سے جواہرات اور سونا لیگئے۔ فرنگی یہاں کے طلسماتی پتھر تک بھی طلسم سمجھکر لے گئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایران کا آفتاب اقبال غروب ہو گیا۔ اور اُس پر ادبار نازل ہونے لگا۔ پہلے شیراز میں زلزلہ آیا۔ پھر ہیضہ نمودار ہوا۔ اور آخرکار قحط نے جان کے لالے ڈالدیئے۔

یہ تو ایرانیوں کی کہانی ہے۔ لیکن ترکی خانہ بدوش جو قدیم سلجوقی افواج کی یادگار ہیں۔ ان کھنڈرات کو بالکل ناچیز سمجھتے ہیں۔ اُنکے نزدیک صنعت اور معماری کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ وہ تھوڑا سا سیسہ حاصل کرنے کے لیئے جس سے دو ٹکڑے پتھر کے باہم پیوستہ ہیں عمدہ سے عمدہ یادگار گرانے کو تیار ہیں۔ جب کبھی کوئی ستون گر پڑتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور پتھروں میں سے سیسہ نکال لیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ ترک بندوق کی گولیوں کے لیئے سیسہ بہم پہنچانے کے واسطے خوبان

بیش بہا یادگاروں کو گرا دیتے ہیں۔

میں نے اُن ناموں کو جو اِن پتھروں پر سیاح لکھ گئے تھے شوق سے پڑھنا شروع کیا۔ بعض پتھروں پر عبرانی زبان میں حروف لکھے ہوئے تھے یہ غالباً اُس زمانہ کے لکھے ہوئے تھے۔ جب پہلی دفعہ یہودی پکڑے گئے اور غالباً بدنصیب قیدیوں نے لکھے ہونگے۔ بہت سے نام مشہور سیاحان انگلستان کے تھے۔ اور اُنمیں بعض نام جرمنی کے سیاحوں کے تھے۔ مگر ہر چند میں نے دو دن تک تلاش کی۔ مجھے کوئی نام ہنگری کے کسی باشندے کا نظر نہ آیا آخر بڑی تلاش کے بعد ایک کھڑکی کے نیچے مجھے ایک نام ملا۔ یہ نام مارو تھی استو آن تھا۔ اور اس نام کے نیچے ۱۸۳۹ء لکھا ہوا تھا۔ میں اس سنگ کے ٹکڑے کو جس پر یہ نام کندہ تھا دیکھکر ایسا خوش ہوا جیسا کہ بچہ کھلونا دیکھکر خوش ہوتا ہے۔ اور اس اپنے وطنی کے نام کے نیچے میں نے اپنا نام لکھدیا اور اپنے نام کے عنوان پر لکھا۔ "ہنگری ہمیشہ آباد رہے"۔

گاؤں کے باہر ایک قافلہ ٹھیرا ہوا تھا۔ یہ قافلہ کربلے سے واپس آنے والے حاجیوں کا تھا۔ اور آدھی رات گذرنے کے تھوڑی دیر بعد یہ منزل مقصود کو روانہ ہونے والا تھا۔ میں اس قافلے سے جا ملا۔ اور جب مجھے صبح کو معلوم ہوا کہ یہہ قافلہ زر قوم کو جو شیراز کے متصل ہے جائیگا۔ تو میں بہت خوش ہوا۔ اہل قافلہ نے اس لیئے یہاں ڈیرہ لگایا تھا کہ اُنکے دوستوں اور رشتہ داروں کو معلوم ہوجائے کہ حاجی لوگ زیارت کربلا معلّے سے واپس آگئے ہیں۔ اور وہ اُنکے استقبال کے لیئے تیار ہوجائیں۔ صبح جب یہ قافلہ گاؤں کے قریب پہنچا تو جوق جوق لوگ گاؤں سے نکل آئے۔ یہ نظارہ بھی قابل دید تھا۔ کوئی مصافحہ کرتا تھا۔ کوئی بغلگیر ہوتا تھا۔ کوئی

پیشانی کو بوسہ دیتا تھا۔ یہاں سے ایک ایک حاجی اور اُسکے گدھے گویا لوگ ارد گرد جُھرمٹ ڈالے ہوئے اِس طرح لیگئے جسطرح گویا کسی فتحمند کو لئے جاتے ہیں۔ ایران والوں کا یہ خیال ہے کہ امام حسین کے مزار کی زیارت سے انسان پاک ہو جاتا ہے۔ اور جو زائر سے بغلگیر ہو وہ بھی اِس قدر ثواب حاصل کرلیتا ہے جسقدر کہ کربلا کا نصف راستہ طے کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ حاجی بڑے استقلال سے اپنے ہموطنوں کے متواضعانہ حرکت کو برداشت کر رہے تھے۔ بعض حاجی خاصکر وہ جو زیادہ مضبوط تھے ملتے ملتے پسینے پسینے ہوگئے تھے۔ مگر ثواب کا کام سمجھکر اُس سے خوش تھے۔

زرقوم سے میں ایک چارپادار اور اُسکے ملازمین کے ساتھ جو شیراز کے رہنے والے تھے شیراز کی طرف روانہ ہوا۔ یہ لوگ شیراز کے باشندے تھے اور ایک عرصے تک وہاں سے غائب رہنے کی وجہ سے وطن جانے کے نہایت مشتاق تھے۔ ہر ایک ایرانی اپنے شہر کی تعریف مبالغہ سے کرتا ہے۔ مگر اِن لوگوں نے تو شیراز کی تعریف میں غلو اور اغراق سے بھی کان کتر دیئے۔ مجھے حافظ کا ایک شعر یاد آیا ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رُکن آباد و گلگشت مُصلّےٰ را

مجھے بھی اِن مقامات کے دیکھنے کا از حد اشتیاق تھا۔ ہم نے نصف گھنٹہ باہم سفر کیا ہوگا کہ میرے ہمراہی چلا اُٹھے۔ وہ رکن آباد ہے وہ رکن آباد ہے۔ یہ سن کر میں گھوڑے سے اُتر پڑا۔ تاکہ دریا کو عبور کروں مگر مجھے پیچھے معلوم ہوا کہ میں نے ناحق اُترنے کی تکلیف کی تھی۔ دریا جس کی شعراء نے بہت تعریف کی ہے وہ اِسقدر خشک ہوکر ۲-۳ بالشت چوڑا

رہ گیا ہوا تھا۔

یہ حال دیکھکر مجھے شیراز کی طرف سے جو کچھ امید تھی اُس سے ایک گونہ مایوسی سی ہوگئی۔ اور جب میں نے اردگرد نظر ڈالی تو مجھے کوئی دلچسپ نظارہ نظر نہ آیا۔ ہر طرف پہاڑوں کے چٹان نظر آتے تھے۔ اور سبزی کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ میرے رفیقوں نے مجھے مایوس دیکھکر کہا گھبراؤ نہیں ہم شیراز کے پاس آپہنچے ہیں۔ آخرکار ہم ایک ایسے رستہ پر پہنچے جس کو ایرانی معنگہ اللہ اکبر کہتے ہیں۔ یہاں سے وہ وادی سامنے کو نظر آتی ہے۔ جس کے وسط میں شیراز کا شہر واقع ہے ؛

فصل پانزدہم

شیراز

جب مسافر بے آب و علف بیابانوں اور پہاڑ کے چٹانوں کے درمیان سے گذر کر شیراز کا شہر سرو کے درختوں کے درمیان چھپا ہوا دیکھتا ہے۔ تو یہہ نظارہ اُسکی درماندہ آنکھوں کو غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ ایرانی کہتے ہیں کہ ممکن نہیں کہ انسان شیراز کو دور سے دیکھے اور پھر اُسکے مُنہ سے بیساختہ کلمۂ اللہ اکبر نہ نکلے اور یہی تنگۂ اللہ اکبر کی وجہ تسمیہ ہے۔ جہانتک انسان کی نظر کام کرتی ہے سرو کے درختوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ باغوں میں بھی جا بجا سرو کے درخت ہیں۔ اور ان سیاہی مائل سبز درختوں کے نیچے سفید خیمے اس طرح معلوم ہوتے ہیں جیسے سبز کپڑے پر نقرئی نگینے رکھے ہوئے ہیں۔ فصیل شہر کے اندر اور باہر بڑے بڑے عالیشان عمارات نظر آتے ہیں۔ انہیں شاہ چراغ کی مسجد کا گنبد بہت بلند ہے۔ اس سے پرے اور اُسکی محاذ میں ایک کف دست میدان ہے جس کے ایک طرف سلسلہ کوہ ہے اور دوسری طرف خلیج فارس۔ چونکہ اس گھاٹی کے گرد قدرت نے پہاڑوں کی دیوار پناہ بنادی ہے۔ اس لئے شیراز کی آب و ہوا ایران کے تمام شہروں سے بہتر ہے۔

شیراز میں پانی کی افراط ہے۔ اس لئے ہر وقت کھیت سرسبز و شاداب نظر آتے ہیں اور ہر موسم میں گلاب اور دیگر اقسام کے پھول باغات میں دکھائی دیتے ہیں۔ ایران کے دوسرے شہروں میں بھیڑ کا گوشت سال بھر دو بار ملسکتا ہے۔ اور شیراز میں ہر وقت دستیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن اہل یورپ کی نگاہ میں جو بات قابل تعریف ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کی آب و ہوا نہائت صاف اور صحت بخش ہے۔ اس لحاظ سے نہ صرف یہ مشرق کے بلکہ شیراز تمام دنیا کے شہروں میں اپنی نظیر آپ ہے۔ ایران میں ایک ضرب المثل مشہور ہے۔ جسکے معنے یہ ہیں کہ اصفہان میں بیشک بہت سے علماء اور صناع (کاریگر) ہونگے۔ مگر رقاص۔ گوئیے اور شرابی صرف آپ کو شیراز میں ہی ملیں گے۔ کچھ شک نہیں کہ شیراز کے باشندے جس قدر زندہ دل ہیں ویسے کسی شہر کے نہیں۔ خواجہ حافظ کو جس بادہ گساری کی تعریف میں اشعار کہے ہیں انہیں ہوئے کئی صدیاں گذر گئی ہیں لیکن شیراز میں رہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک وہاں وہی زمانہ ہے جو خواجہ حافظ کے وقت میں تھا۔ اور لوگوں نے مطلق اپنی حالت کو نہیں بدلا۔ باوجودیکہ اہل اسلام کو شراب پینے کی سخت ممانعت ہے مگر یہاں کے باشندے کھلے دل سے شراب پیتے ہیں۔ مسافر۔ کاریگر۔ اہلکار اور مذہبی شام سے جوں بادہ گساری شروع کرتے ہیں۔ تو نصف شب تک اسی کام میں مشغول رہتے ہیں۔ میرا ارادہ شیراز میں کچھ عرصہ تک قیام کرنے کا تھا۔ اس لئے میں ایک مسجد میں فروکش ہوا۔ اور میں نے اپنا گدھا فروخت کر دیا۔ میرا کیسہ خالی ہو چلا تھا مگر مجھے اس بات کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ کیونکہ شیراز میں اشیاء خوردنی بہت سستی ہیں۔ میں یہاں درویشوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ رستے میں

بہت جلد یہاں میرے بہت سے دوست ہوگئے۔ اِسمیں شک نہیں کہ متعصب شیعہ مجھے سُنی سمجھکر اکثر میرے روبرو حضرت عمر کو سخت سُست کہتے تھے مگر جب اُنہوں نے دیکھا کہ میں بُرا نہیں مانتا تو وہ بہت خوش ہوئے اور میری بڑی خاطر کرنے لگے۔

ایک دن میں نے سُنا کہ اِس شہر میں ایک شخص جو سویڈن کا باشندہ ہی طبابت کرتا ہے۔ میں بوضع درویشانہ اُس حکیم کے پاس گیا اور اُسکے مکان پر جاکر ''یاہو یاحق'' کا نعرہ مارا۔ اور اُس نے مجھے دیکھکر جیب میں ہاتھ ڈالا اور چند درہم نکالکر مجھے دینے چاہے۔ میں نے کہا کہ مجھے تیرا پیسہ نہیں چاہئیے۔ میں شیخ بغداد کے پاس سے اِسلئے آیا ہوں کہ تجھے راہ راست پر لاؤں۔ اور مذہب اسلام تلقین کروں۔ یہ کوئی انوکھا سوال نہ تھا۔ اکثر درویش اس حکیم سے اِس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ میری گفتگو سُنکر یہ حکیم مسکرایا۔ اور کہنے لگا کہ بہتر ہے تم مجھے قائل کردو۔ مجھے کس طرح یقین آئے کہ تم کو شیخ بغداد نے بھیجا ہے۔ میں نے کہا کیا تم کو شک ہے؟ میرے مرشد کو اِس قدر طاقت حاصل ہے کہ ایک نگاہ میں وہ تمام علوم مشرق و مغرب سے انسان کو ماہر کرسکتا ہے۔ تو فرنگی ہے۔ اور غالباً کئی زبانوں سے ماہر ہے میرا امتحان کرلے۔

یہ گفتگو سُنکر حکیم نے میری طرف متعجب ہوکر دیکھا اور میں نے بڑی مشکل سے ہنسی کو روکا۔ پھر اُس نے سویڈن کی زبان میں مجھے مخاطب کیا۔

میں نے کہا کہ تم سویڈن کی زبان میں مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہو۔ یہ زبان جتنی تمہیں آتی ہے۔ اُتنی ہی مجھے بھی آتی ہے۔ یہ کہکر میں نے ٹگنیر کی تصنیف سے چند اشعار جو مجھے حفظ تھے اور اُس وقت برمحل یاد آگئے اُسکو

سُنائے۔ اور اُسے بیحد حیران اور متعجب کر دیا۔ پھر اُسنے جرمن زبان میں گفتگو کی۔ پھر انگریزی اور فرانسیسی بولی اور ان سب زبانوں میں مجھے طاق پایا۔ حکیم صاحب یہ حال دیکھکر اسقدر متحیر ہوئے کہ تمام عمر میں کبھی نہ ہوئے تھے۔ اخیر میں میں نے چند آیات قرآن اُسکی روح کی نجات کے لیئے پڑہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اُسکو گویا القا ہوا کہ میں یوروپ کا باشندہ ہوں میں اُسکے قیافہ سے تاڑ گیا کہ اُس کے دل میں شک پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور یہ الوداعی تقریر کی۔ میں تجھے کل صبح کے آٹھ بجے تک مہلت دیتا ہوں۔ اسقدر عرصہ میں یا تو تو مسلمان ہو جا یا تجھے معلوم ہو جائے گا کہ میرے مرشد میں کیا کچھ کرامت ہے۔

یہ کہکر میں اپنے مکان پر چلا آیا۔ علی الصباح ابھی میں بیدار بھی نہیں ہوا تھا کہ حکیم صاحب آموجود ہوئے۔ اُنکو ایک قسم کی بیچینی لگی ہوئی تھی۔ پہلے تو مینے آگے کی طرح اُس سے مذاق کیا۔ مگر پھر میں نے اپنا آپ ظاہر کر دیا۔ جب اُس کو معلوم ہوا کہ میں یورپین ہوں تو وہ اُٹھکر مجھسے بغلگیر ہوا۔ اور اُس نے مجھسے کہا کہ مجھے پہلے ہی خیال تھا۔ کہ آپ یورپین ہیں۔ مگر مجھے آپ کی فارسی گفتگو سے شک ہوتا تھا۔ آپ فارسی اس طرح بولتے ہیں کہ یوروپ کے باشندے اس طرح نہیں بول سکتے۔ پھر وہ زبردستی مجھے اپنے گھر لیگیا اور لوگوں سے مینے یہ بہانہ کیا کہ میں حکیم صاحب سے علم کیمیا سیکھتا ہوں۔ شیراز میں حکیم صاحب بالکل ایرانیوں کی طرح رہتے تھے اس لیئے اور بھی لوگوں نے میرے اُنکے ساتھ رہنے کا خیال نہیں کیا چھ ہفتہ تک میں اس مہمان نواز حکیم کے ہاں مقیم رہا۔ اور اس عرصہ میں مینے لوگوں کی عادات اور اطوار بخوبی دیکھے۔ یہاں کے باشندے ذراسی بات پر بگڑ جاتے

ہیں اور معمولی سی معمولی بات پر اُنکو اشتعال آجاتا ہے۔ ہر ایک شخص کے پاس خنجر دودم ہوتا ہے اور وقت ضرورت وہ اُسے کام میں لاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر سال بہت سی جانیں اِس شہر میں اِس طرح ضایع ہو جاتی ہیں۔ ایک دن کا ذکر میں آپکو سناؤں۔ میں ایک بازار میں سے گذر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک تنگ رستہ سے ایک ایرانی لباس فاخرہ پہنے ہوئے جا رہا ہے۔ دوسری طرف سے ایک اور ایرانی آ رہا تھا۔ یہ آخر الذکر جلدی میں تھا۔ اِس لیئے اول الذکر اُسکے سامنے آ گیا۔ اِس بات پر آخر الذکر جو غالباً اعلیٰ درجہ کا آدمی تھا۔ اِس قدر ناراض ہوا کہ اُس نے اپنا خنجر نکالکر اُس بیگناہ شخص کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ یہ واقعہ دن دہاڑے صدہا آدمیوں کے روبرو ہوا۔ اِس سے آپ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہاں کس قدر جرایم ہوتے ہیں۔ ہرچند کہ جرایم بہت ہوتے ہیں۔ مگر سزائیں بھی ایسی سخت دیجاتی ہیں کہ اُنکا ذکر کرتے ہوئے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اعضائے جسم کٹوا دیئے جاتے ہیں۔ اور مجرموں کو گھوڑوں کی ٹاپوں کے آگے ڈلوا دیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حاکم شیراز نے چار مجرموں کو ایک گڑھے میں زندہ دفن کروا کر گرم گرم چونا اوپر سے ڈلوا دیا تھا۔

ایک دن اپنے دوست حکیم صاحب کے ساتھ میں شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی تربت پر گیا۔ یہ ایک طرف گھاٹی میں ہے اور اُسے کریم خاں[1] نے ایک

سلہ سلاطین ایران کے خاندان ژند کا پہلا بادشاہ کریم خاں سنہ ۱۷۷۹ء میں گذرا ہے۔ اِس خاندان کے بعد خاندان قاجار حکمران ہوا۔ جو حال میں برسر حکومت ایران ہے۔ ۱۲

بڑا عالیشان مقبرہ بنوایا ہے۔ اس مقبرہ کے گرد ایک باغ ہے جو ہر وقت شاداب رہتا ہے۔ کئی سیڑھیاں چڑھکر اور کئی چھوٹے چھوٹے حجروں سے گذر کر ہم بڑے دالان میں پہنچے۔ جس میں شیخ سعدیؒ کا مزار ہے۔ یہ سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اور اس پر عربی زبان میں کتبہ لکھا ہوا ہے باغ میں ایک تالاب ہے۔ کہتے ہیں کہ اسمیں کسی زمانہ میں مچھلیاں رہتی تھیں۔ اور زائرین ان مچھلیوں کو سونے کی نتھیں پہناتے تھے ان مچھلیوں کو چرانا سخت جرم تھا۔ اس مقبرے کے قریب ایک چھوٹا سا گانوں ہے جس کو شیخ سعدی کی یادگار میں سعدیہ کہتے ہیں۔ شہر شیراز کا ایک دروازہ بھی شیخ سعدی کے نام سے "دروازۂ سعدی" مشہور ہے ایک پل بھی پل سعدی کہلاتا ہے۔ سعدی کی عظمت اور بزرگی نہ صرف اہل ایران کے دلمیں ہے بلکہ تمام ایشیا کے مسلمان اسکو ولی سمجھتے ہیں سعدی کی تصنیف گلستاں چین اور جنوبی افریقہ میں بھی یکساں اشتیاق سے پڑھی جاتی ہے۔ مدارس میں گلستاں کتب درسیہ میں داخل ہے۔ اور یورپ کے علما بھی گلستاں کی خوبیوں سے بے خبر نہیں ہیں۔ سعدی کے مقبرے میں ایک پیر مرد سفید ریش اُجلے کپڑے پہنے ہوئے مجھے ملا صرف اسکی کلاہ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ درویش ہے۔ یہ مجھے بڑے تپاک سے ملا۔ اثنائے ہنگام گفتگو معلوم ہوا کہ یہ ہندوستان سے دولت و حشمت چھوڑکر آیا ہوا ہے۔ اور مقبرے کے کونے میں درویشوں کی طرح رہتا ہے۔ یہ مشہور ہے کہ سعدی بھی درویش تھا۔ لیکن وہ ان درویشوں کی طرح نہ تھا۔ جو حرص دنیاوی کے لئے خرقۂ درویشی پہن لیتے ہیں۔ اُس نے اپنی زندگی میں بڑے سفر کئے۔ تو تیس سال سیر و سیاحت میں گذار دیئے۔ یہ نوکر ہوکر۔ غلام ہوکر

امیر ہوکر۔ عالم بنکر اور سمندر کا پو جاری بنکر مختلف ملکوں میں رہا۔ اُسکو دولت اور دنیاوی دکھاوے سے نفرت تھی۔ اور اپنی فصاحت و بلاغت اور لیاقت کو اپنا زیور سمجھتا تھا۔ یعنی" الماس روح سے تجربے کے جواہرات تراشتا اور فصاحت کی لڑی میں اُنکو پرو کے گلے کا ہار بناتا تھا" حافظ شیرازی کی قبر بھی سعدی کی قبر کے پاس ہی ایک بڑے قبرستان میں ہے۔ اسکی قبر کے گرد کریم خاں نے ایک کتبہ سنگ مرمر کا بھی بنوایا ہوا ہے اور اُسپر حافظ کے دیوان کا ایک شعر لکھا ہوا ہے۔ جسکا ماحصل یہ ہے۔ "میں حافظ کی قبر پہ کئی بار گیا۔ کبھی تو میں نے وہاں عابد اور زاہد معتکف دیکھے اور کبھی دنیا پرست شراب پیتے دیکھے" سعدی کو ہر قسم کے لوگ اپنا پیر سمجھتے ہیں۔ بعض تو ارباب نشاط کی زبانی حافظ کی غزلیات بوقت مے نوشی سنتے ہیں۔ اور بعض اُس کے دیوان کی کتاب مقدس کے برابر عزت کرتے ہیں۔ اکثر دیوان حافظ سے فال دیکھتے ہیں۔ فال دیکھنے سے پہلے منفصلہ ذیل فقرے کہتے ہیں۔

"اے حافظ شیرازی" "بر من نظر اندازی"
"من طالب یک فالم" "تو کاشف ہر رازی"

اسکے بعد فال دیکھتے ہیں اور دیوان کو کھولنے پر جو پہلا شعر نکلے اُسکو اپنے سوال کا جواب سمجھتے ہیں۔

میں شیراز میں تین مہینے رہا۔ میرا ارادہ ہو گیا کہ تمام جاڑے کا موسم ایسے خوشگوار شہر میں بسر کروں۔ اور موسم بہار میں یزد اور تیبس ہوتا ہوا خراسان چلا جاؤں۔ لیکن اتفاق سے ان ایام میں وہاں دو یوروپ کے سیاح آگئے اور میرا ارادہ یک قلم بدل گیا۔ ان میں

ایک تو کونٹ روخ کوارٹ تھا اور دوسرا مارکویس آف ڈوریا تھا کونٹ تو سفیر فرانس کے ساتھ ایران کی تجارتی حالت دیکھنے آیا تھا اور مارکوئیس اٹلی کی سفارت کے ساتھ علم نباتات وحیوانات کی تحقیقات کے لیئے گھر سے نکلا تھا۔ اِن معزز مہمانوں کی حکام کی طرف سے خوب خاطر اور تواضع ہوئی۔ پھر ایک دن ہم تینوں کی دعوت میرے دوست ڈاکٹر فیگر گرین نے کی۔ اور ہم تینوں کی صحت کا جام اُس نے نوش کیا۔ اِس نیک نہاد شخص کو کسی یوروپین سیاح کی ضیافت سے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اور خاصکر کے میری اُس نے اس قدر تواضع کی کہ میری تو اس سے دلی محبت ہو گئی۔ اور جب میں کونٹ کے ساتھ طہران کو واپس ہونے لگا تو مجھے اِس ڈاکٹر کی جدائی کا واقعی صدمہ ہوا۔ مارکوئیس شیراز کی بے نظیر آب و ہوا کا لُطف اُٹھانے کے لیئے وہیں رہ گیا۔ اور میں کونٹ کے ہمراہ طہران روانہ ہونے پر تیار ہو گیا۔ مجھے اِس فرانسیسی افسر کی تجویز سے انکار کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ کیونکہ میرے پاس اَب زادِراہ باقی نہیں رہا تھا۔ مارکوئیس کے ساتھ رہنے سے مجھے اُمید تھی کہ وہ میرا خرچ برداشت کرے گا۔ طہران سے میں درویشوں کے لباس میں شیراز آیا تھا۔ لیکن اَب مجھے یقین تھا کہ شہنشاہ فرانس کے اہلکار کے ساتھ یوروپین سیاح کی صورت میں مجھے یوروپ کو واپس جانا نصیب ہوگا۔ شیراز میں کونٹ مذکور تین دن اَور رہا۔ اِس کے بعد ہم دونوں دو منزلہ کوچ کرتے طہران میں جا پہونچے۔

جس وقت میں شیراز سے روانہ ہونے لگا میں آخری مرتبہ اپنے دوست ڈاکٹر کو ملنے اُسکے مکان پر گیا۔ وہ ابھی تک اپنی خوابگاہ میں تھا

میں اُسکو وہیں جا ملا- اور مینے اُسکو کہا کہ میں ترکستان جاؤنگا- اور دیکھیے پھر کبھی ملاقات ہو یا نہ ہو جب کبھی میں یہ جملہ کہتا تھا- اُسکی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے- ابھی میں اُس سے بغلگیر ہی ہوا تھا- اور آخری مصافحہ کر رہا تھا کہ یکلخت چھت ہلنی شروع ہوئی اور اُسکا رنگ زرد ہو گیا- اور اُس نے کہا کہ خدا کے لیئے جلد یہاں سے اُتر آؤ میں اپنی بیوی اور بچوں کو بلاتا ہوں- زلزلے کے آثار ہیں- ابھی زلزلہ آنے والا ہے- زلزلے شیراز میں خطرناک ہوتے ہیں خاصکر جبکہ صبح کے وقت شروع ہوں-

ڈاکٹر صاحب میں اور اُسکی بیوی بچے صحن مکان میں چلے گئے- چند سیکنڈ میں زمین کے نیچے ایسی آواز سنائی دی جیسے بادل گرج رہا ہو اور تمام مکانات ہلنے لگے- زلزلے کے آتے ہی تمام شہر میں غل مچ گیا- زلزلے کا دوسرا ہچکولہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا- اور لوگ اٹھے "یا اللہ یا" بہ آواز بلند کہنے لگا- شیراز کے زلزلے اکثر نہایت خوفناک ہوتے ہیں- اگرچہ جو بڑے بہادر ہیں وہ بھی ڈر کے مارے زرد ہو جاتے ہیں-

چند منٹ تک ہم خاموش کھڑے رہے- آخر کار میرا میزبان بولا کہ یہ بہت تنگ جگہ ہے- اگر مکان گر گیا تو ہم سب کے سب دب جاوینگے- تم میری بیوی اور بچوں کو کھلے میدان میں لیجاؤ- اور میں یہاں رہتا ہوں تاکہ مکان کو خالی پاکر کوئی چور یہاں نہ گھس آئے- یہاں زلزلے میں بھی چور چوری کر نہیں چوکتے- مینے اِسکی بات کا جواب دینا چاہا مگر ڈاکٹر نے میری طرف نہایت عاجزی سے دیکھا- جس کے یہ معنے تھے کہ جو میں کہوں وہ براہ مہربانی کر دیجیے مینے اُسکی بیوی بچوں کا ہاتھ پکڑ لیا- اور اُنکو وہاں سے لیگیا- ہم ایک تنگ گلی میں سے گذرے جہاں بہت سے لوگ کھڑے تھے- مگر سب کے چہرے خوف زدہ

ہوتے ہیں تھے۔ جب میں ڈاکٹر کے کنبہ کے ساتھ کھلے میدان میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ لوگ دیوانہ وار اِدہر اُدہر دوڑ رہے ہیں۔ جلدی میں جو کپڑا جسکے ہاتھ میں آتا ہے وہ ہی اُسے لپیٹ لیتا ہے۔ اور بعض تو نیم برہنہ یا بالکل ننگے پڑے ہیں۔ چند منٹ میں ہی تمام شہر گھبرا اُٹھا۔ اِس شور و غل کے درمیاں مُلّا لوگ یہی کہہ رہے تھے کہ چونکہ اِس شہر میں ناپاک فرنگی رہتے ہیں اس لئے اِس شہر پر یہ آفت نازل ہوئی ہے۔ مجھے اپنے دوست کا اُس وقت خیال آیا کہ مبادا لوگ اسکو کچھ گزند پہنچائیں۔ میں جلدی جلدی اُسکے مکان کیطرف گیا۔ آگے جا کر میں نے دیکھا کہ پرندے اپنے بازوؤں کو پھٹ پھٹا رہے ہیں۔ اور گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ علامت تھی کہ زلزلے کا دھکا لگ آنے والا ہے۔ چنانچہ اب کے جو دھکا آیا وہ اِس قدر سخت تھا کہ ہم اپنے پاؤں پر قائم نہ رہ سکے۔ اور زمین پر گر پڑے میرے گرتے ہی ایک طرف سے تڑاخ کی آواز آئی۔ اور مجھ پر پانی گرنے لگا۔ اُس وقت میں نے سمجھا کہ میری موت آگئی۔ دراصل ایک دیوار گر گئی تھی اور تالاب کا پانی جہاں ہم تھے وہاں بہ آیا تھا۔ اُس وقت میں کانپ رہا تھا۔ اور کانپتے کانپتے سقف مکان کی طرف دیکھا۔ اتنے میں میرے کانوں میں آواز آئی کہ یہاں ناپاک فرنگی ہیں۔ اِس آواز سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا کہ لوگ اِس گھر میں گھس آئینگے میرے دوست نے بھی یہ آواز سُنی اور کہا جلد اندر سے بندوقیں نکالو۔ ہر چند کہ یقین کامل نہ تھا کہ اِس مکان میں جسکے گرنے کا ہر لحظہ اندیشہ تھا یہ لوگ گھس آئینگے۔ مگر بخیال حفظ ماتقدم ہم نے بندوقیں اُٹھالیں اور مستعد ہو بیٹھے۔ ایک طرف تو ہمیں ان لوگوں کا ڈر تھا۔ دوسری طرف عناصر برسر پرخاش تھے۔

یہ ساعت مجھے کبھی نہیں بھولیگی۔ اس وقت ہم نے دفعتاً ایک سخت گرج سنی
اور ہمارے ہمسایہ میں ایک مکان گر پڑا۔ اُس مکان کے گرتے ہی تمام جمع منتشر
ہوگیا۔ اور چاروں طرف سے گرد وغبار اُڑنے لگا۔ پھر کوئی ہچکولہ نہ آیا۔ اور آدھی
گھنٹہ تک جب کوئی ہچکولہ محسوس نہ ہوا تو میری ہمت بندھ گئی اور میں اس گھر سے
باہر نکلا۔ یہ زلزلہ ایسا سخت تھا کہ اُس نے جنوبی پہاڑ کے پرخچے اڑا دیئے۔
اور بڑے بڑے چٹان کے ٹکڑے پہاڑ سے جُدا ہو کر اس طرح گرے جیسے کئی بجلیاں
یکبارگرتی ہیں۔

شہر کی ہولناک تباہی بیان سے باہر ہے۔ جب میں اُس مکان سے
نکلا تو راہ میں مجھے کونسٹ ملا۔ اُسکا چہرہ پژمردہ ہو رہا تھا۔ اُسنے مجھے بھی
صلاح دی کہ اب اِس شہر سے جلدی نکلو۔ سرِراہ دیواروں کے بڑے بڑے شگاف
دیکھکر ہمارے دل سہم جاتے تھے۔ اور جب میں لوگوں کو مضمحل دیکھتا تھا تو مجھے
بڑا رحم آتا تھا۔ جب میں شہر سے باہر نکلا۔ اور اُس جگہ کی طرف روانہ ہوا جو
میں نے اور میرے رفقا نے روانگی سے پہلے سب کے جمع ہونے کے لیئے مقرر کی
تھی تو میں نے دیکھا کہ ہزاروں آدمی جو جان بچا کر شہر سے باہر نکل آئے تھے۔
ابھی تک مضطرب کھڑے ہیں۔ اِن لوگوں کے رشتہ دار شہر میں رہگئے تھے
اِس لیئے اُنہوں نے جب ہمکو دیکھا تو حالانکہ یہ ہمارے ناآشنا تھے۔ گھبرا کر
ہم سے پوچھنے لگے کہ ہمارے رشتہ داروں کو تو کہیں نہیں دیکھا؟ وہ
خیریت سے تو ہیں؟ جس وقت میں تنگۂ اللہ اکبر کے پاس پر پہنچا تو
میں نے شکر خدا کیا۔ اِس زلزلے سے دس سال پہلے بھی ایک شدید زلزلہ شیراز میں آیا
تھا وہ اِس زلزلے سے بھی کئی درجہ زیادہ خوفناک اور بربادی بخش تھا۔ لوگوں میں یک
روایت مشہور ہے کہ جہاں آب شیراز کا شہر ہے وہاں کسی زمانہ میں "دریائے نمک" یعنی ایک جھیل آب شور کی

درویشوں کا کھانا

بہتی تھی۔ اور جب قیامت آئیگی تو پھر یہی جھیل نمودار ہو کر شیراز کو غرق کریگی۔ ہم اُسی رستہ سے جو اب سے تین ماہ پیشتر ہم نے آہستہ آہستہ طے کیا تھا ڈبل کوچ کر کے طہران کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں کونٹ کی گفتگو سے مجھے بڑا لطف آیا۔ اور کبھی کبھی ہم نے غزالوں کا شکار بھی کھیلا۔ ایرانی شکاری گھوڑوں پر سوار ہو کر ہرنوں کو بہت جلد دیکھ لیتے ہیں۔ جونہیں یہ گولی مارتے ہیں شکاری کتّے اوپر سے پہنچ جاتے ہیں۔ جب کبھی ہم راہ میں کسی شہر میں قیام کرتے تھے۔ حکام کی طرف سے ہماری پُر تکلف دعوت ہوتی تھی۔ اسی طرح دعوتیں اُڑاتے۔ ہم ماہ جنوری ۱۸۶۳ء کے وسط میں طہران واپس آ گئے۔

فصل شانزدہم

وسط ایشیا کے سفر کی تیاریاں

جب میں دوبارہ طہران میں گیا تو پھر پہلے اپنے مربیوں کی ملاقات کی۔ طہران میں آکر مجھے معلوم ہوا کہ ہرات میں لڑائی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اور اب اس دوسری مزاحمت کے رفع ہونے سے مطلع صاف ہے۔ سفیر روم ہمیشہ ان حاجیوں کی جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جاتے ہیں امداد کیا کرتا ہے اور اُن درویشوں کی بھی مدد کرتا ہے جو بخارا۔ خیوا۔ اور قوقند سے براہ ایران روم میں آتے ہیں۔ یہ مدد مسافروں کے لئے بڑی بات ہے۔ کیونکہ ایرانی جو شیعہ ہیں۔ اُنکو کوڑی تک دینے کے روادار نہیں ہوتے۔ اس قسم کے درویش اکثر فرودگاہ سفر پر آتے تھے۔ اور ان جنگلی تاتاریوں سے میں بہت کچھ حالات اُنکے وطن کے معلوم کر لیا کرتا تھا۔ میں اُن لوگوں سے اس طرح خاطر اور تواضع سے پیش آتا تھا کہ وہ میرا ہی کلمہ پڑھنے لگتے تھے۔ لیکن رشید افندی نے مجھ غریب کا (نام تھا) اس سے بھی بڑھکر ہے یہ درویشوں کو بھائیوں کے برابر سمجھتا ہے اور در پردہ خود بھی درویش ہے۔

جب میری یہ شہرت ہو گئی تو یہ درویش پہلے میرے پاس آتے تھے اور پھر سفیر کے پاس جاتے تھے۔ یہ سفیر ہر ایک درویش سے مل بھی نہ سکتا تھا

اس لیئے بسا اوقات میرے ذریعہ سے ان درویشوں کی ملاقات اس سے ہوتی تھی۔ اور میری سفارش پر انکو زاد راہ ملتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ۲۰ تاریخ ماہ مارچ کو چار حاجی میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم نے سفارت پناہ کی خدمت میں حاضر ہوکر استغاثہ دائر کرنا ہے۔ ایرانیوں نے ہم سے وہ جزیہ وصول کیا ہے۔ جو شیعہ سنیوں سے لیتے ہیں۔ حالانکہ سلطان معظم نے یہ ٹیکس منسوخ کر دیا ہے۔ اور شاہ ایران نے بھی اس بات کو منظور کر لیا ہے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ ہم بھیک مانگنے نہیں آئے۔ ہم اس لیئے آئے ہیں کہ یہ جزیہ معاف کرا کر اپنے اہل وطن کو فائدہ پہنچائیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ الفاظ میں ایک مشرق کے باشندے کی زبان سے سن رہا ہوں۔ واقعی ان الفاظ سے مطلق خودغرضی آشکارا نہ تھی۔ میں نے دوبارہ انسے جرح کی اور ہرچند انکا لباس پھٹا پرانا تھا پھر بھی انکی وضع سے ایک قسم کی شرافت ظاہر ہوتی تھی۔ انمیں جو سرغنہ تھا وہ تاتار کا رہنے والا حاجی تھا۔ اس نے پھٹے پرانے کپڑوں کے اوپر ایک سبز جبہ پہنا ہوا تھا۔ اور اسکے سر پر ایک سفید عمامہ بڑا بھاری تھا۔ اس شخص کی آنکھوں کے اندر ایک زندہ دل کا نور منور تھا۔ اور ہنگام گفتگو مجھے معلوم ہوا کہ یہ اپنے ہمراہیوں سے افضل تر ہے۔ اس شخص کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ وہ تاتار کے ایک صوبہ آقسو کا امام ہے۔ دوبار حج کر آیا ہے اور اسکے تین ہمراہی بھی اہل قافلہ میں معزز اور معتمد ہیں۔ اس شخص کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ انکے قافلہ میں چوبیس آدمی ہیں۔ جنمیں عالم جاہل۔ امیر۔ غریب۔ پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب قسم کے آدمی موجود ہیں مگر وہ آپسمیں بھائیوں کی طرح گذارہ کرتے ہیں۔ اس حاجی نے کہا ہم توقند

اور کاشغر کے رہنے والے ہیں (ان لفظوں کا مصداق کل چینی تاتار ہے) اور بخارا کا کوئی رہنے والا ہم میں نہیں ہے۔ کیونکہ بخارا کے لوگ افعی سمجھے جاتے ہیں ان سے میری گفتگو ایک گھنٹہ تک ہوتی رہی۔ اور انکی بے تکلف اور آزادانہ روش نے میری ہمدردی کو اور بھی قوی کر دیا۔ ہرچند انکا لباس غریبانہ تھا۔ اور ایک دور دراز کے سفر کی تکلیفوں نے انکی صورتوں کو وحشتناک بنا رکھا تھا۔ تاہم مینے دلمیں سوچا کہ ان سے بہتر مجھے کوئی راہ نما وسط ایشیا میں نہیں ملسکتا۔ چنانچہ میں نے انسے اپنا دلی منشا ظاہر کیا اور کہا کہ میرا ارادہ تمہارے قافلے کے ساتھ جانیکا ہے۔ جیسا کہ مجھے یقین تھا ویسا ہی ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا اس سفر سے مطلب کیا ہے۔ ان لوگوں کو یہ بتانا کہ میں علمی تحقیقات کے لئے گھر سے نکلا ہوں فضول تھا۔ چنانچہ میں نے ان کو بتایا کہ یہ حاجی بھی خوش ہوگئے۔ میں نے انسے کہا کہ ترکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں سچے مسلمان رہتے ہیں۔ مدت سے میری تمنا ہے کہ خیوا۔ سمرقند۔ اور بخارا کے اولیاؤں کی زیارت کروں۔ یہی تمنا مجھے روم سے لائی ہے۔ اور ایک سال سے میں ایران میں منتظر تھا۔ چنانچہ حسن اتفاق سے آپ جیسے بزرگوار ملگئے ہیں۔ جن سے بہتر رفیق طریق ملنے ناممکن ہیں۔

اس غیر معمولی بہانہ کے پیدا کرنے میں مجھے بڑی دماغ ریزی سے کام لینا پڑا تھا۔ لیکن جب یہ سمجھ میں آگیا تو پھر کسی اور حیلے کی ضرورت نہ پڑی اگر میں صاف صاف اصل حال ان کو بے کم و کاست کہدیتا تو یہ ہرگز یقین نہ کرتے کہ صرف علمی تحقیقات کے لئے یہ شخص اس قدر مصیبتیں جھیلنے کو تیار ہے۔ اس لئے نہایت بیدلی کے ساتھ میںنے بہانہ بنایا اور جس طرح مینے

کارنداغ پہاڑیاں

اپنی جسمانی اصلیت کو اُنسے چھپایا ہوا تھا۔ اُسی طرح دل کا ارادہ بھی اُنسے مخفی رکھا۔

جب اِن نیک تاتاریوں نے میری گفتگو سُنی تو اُنہوں نے مجکو اور نیز ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔ اور اُنکے متکلم نے جسکا نام حاجی بلال تھا۔ مجھے کہا کہ ہمکو مدّت سے خیال تھا کہ آپ دربردہ درویش ہیں۔ اب ہمارا خیال حق الیقین کو پہنچا۔ ہم ہر طرح سے حاضر ہیں۔ نہ صرف ہم آپ کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرینگے۔ بلکہ اپنے آپ کو آپکا خدمتگار سمجھیں گے۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ راہ پُرخطر ہے۔ ٹرکی اور ایران کی طرح پُر امن نہیں ہے۔ اکثر کئی ہفتے تک راہ میں مکان دکھائی نہیں دیتا۔ ہفتہ ہفتہ بے آب و نان رہنا پڑتا ہے۔ ہر وقت یہ ڈر رہتا ہے کہ اب مارے گئے۔ اب ریت کے طوفان میں دب گئے۔ اب کسی نے پکڑ کر اور غلام بنا کر بیچ ڈالا پس اے آفندی اس معاملے پر پہلے خوب غور کر لو ایسا نہ ہو کہ بعد میں تم کو پشیمان ہونا پڑے۔ قطع نظر اسکے ہمارے اہل وطن نہایت شکی آدمی ہیں۔ اُنکو ہمارے جیسا تجربہ نہیں ہے۔ وہ اجنبیوں پر ہر وقت شک اور شبہ کرتے رہتے ہیں۔ اسلئے تمہارا ہمارے بغیر تنہا واپس آنا بہت مشکل ہوگا۔ یہ تمام باتیں سوچ لو ایسا نہ ہو کہ پھر تم ہمکو کہو کہ ہم نے دوست بنکر تمسے دغا کی۔

میرے دل پر اِس گفتگو کا جو اثر ہوا۔ ناظرین اسکا خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ لیکن میں جو دل میں ارادہ کر چکا تھا اُسکو کسی طرح بدل نہیں سکتا تھا۔ مینے اُنسے کہا کہ میرا بھروسہ توکّل پر ہے۔ تکلیفوں سے میں نہیں ڈرتا۔ بلکہ دنیا دی راحتوں کو ہیچ سمجھتا ہوں۔ یہ جو لباس تم میرے جسم پر

دیکھتے ہو محض برائے ضرورت میں نے پہنا ہوا ہے۔ ورنہ مجھے اس سے نفرت ہے۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ دنیا پنجروزہ ہے۔ خدا جانے کل کیا ہوگا۔ میرے دوستو مجھے ضرور ساتھ لیچلو۔

میری اس تقریر نے ایسا اثر ان درویشوں کے دل میں کیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لیجانے پر راضی ہو گئے۔ پھر ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور ہم نے ایک دوسرے کی پیشانی کو بوسے دیئے۔ اگرچہ معانقہ کرتے وقت اُنکے کپڑوں اور پسینے کی بدبو سے میرا دماغ پراگندہ ہو گیا۔ مگر مطلب کے لیئے میں نے یہ تکلیف بھی گوارا کی۔ اس کے بعد میں نے اپنے مربی حیدر آفندی کو اپنے ارادہ سے آگاہ کیا۔ اور کہا کہ آپ میری سفارش ان حاجیوں سے کریں۔ حیدر آفندی نے کہا کہ تو ضرور دیوانہ ہے۔ ان لوگوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ چند درہموں کے لیئے انسان کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔ اور قطع نظر اسکے جتنے آدمی آجتک پہلے گئے ہیں کوئی بھی زندہ اس طرف سے واپس نہیں ہوا۔ مینے کہا کہ جو میری قسمت میں لکھا ہے وہ پیش آئے گا۔ جب حیدر آفندی نے دیکھا کہ میں کسی طرح باز نہیں آتا تو چار و ناچار اس نے میری امداد کی۔ ان حاجیوں سے اچھی طرح ملاقات کی۔ جو انکی خواہش تھی وہ اُنکے حسب مراد پوری کی۔ اور پھر میری طرف سے سفارش کی اور کہا کہ یہ سلطان المعظم کا عہدہ دار دیوانی ہے۔ اسکا نام رشید آفندی ہے۔ اسکو میں تمہارے سپرد کرتا ہوں بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ خلوت میں ان حاجیوں نے حیدر آفندی کو حلفاً کہا کہ ہم ہر طرح سے رشید آفندی کی نگہبانی کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اقرار کو مردانہ وار پورا کیا۔ اور حیدر آفندی میرے مربی نے تمام

اہل قافلہ کی ایک فہرست طلب کی۔ اور پندرہ اشرفیاں اُن لوگوں میں تقسیم کیں۔ یہ بیچارے نان شبینہ کو محتاج تھے۔ اس قدر روپیہ جب اُنکو ملا تو اُنکی باچھیں کھل گئیں۔ حاجی بلال اکثر مجھے ملنے آتا تھا۔ اور جب آتا تھا۔ کوئی نہ کوئی آدمی اپنے ساتھ میری ملاقات کے لیئے ضرور لاتا تھا۔ یہ لوگ جو اُس کے ساتھ آتے تھے اِس قماش کے ہوتے تھے کہ اُنکی صورت سے وہ قابل اعتبار معلوم نہ ہوتے تھے۔ اِن حرکات سے میں نے سمجھا کہ حاجی بلال مجھے موٹی مرغی سمجھکر میرا چمڑا اُتارنا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے اُس کو کہدیا کہ میں ساتھ کچھہ روپیہ وغیرہ نہیں لیجاؤں گا۔ اور نہ یہاں میرے پاس روپیہ ہے۔ اور ساتھ ہی اُس سے پوچھا کہ جس قسم کا لباس تم کہو اُس قسم کا بنوا لوں۔ وہ میری درخواست سُن کر بہت خوش ہوا۔ اور اُس نے مجھے کہا کہ آپ تمام سر منڈوا لیجے۔ اور ترکی لباس اُتار کر اہل بخارا کا لباس زیب تن کیجیے۔ اور یہ بستر وغیرہ سامان آسایش یہیں چھوڑ جائیے۔ میں نے اِسکی ہدایت کے بموجب عمل کیا۔ اور روز روانگی سے تین دن پہلے میں اِس خوفناک سفر کے لیئے تیار ہوگیا۔ روانگی سے پہلے ایک دن ملاقات بازدید کے لیئے میں کاروان سرائے میں گیا۔ جہاں یہ اہل قافلہ ٹھیرے ہوئے تھے۔ اِن لوگوں کی غلاظت کا حال کچھ نہ پوچھیئے۔ اُنکی تکلیف مجھے عمر بھر نہ بھولے گی۔ چودہ آدمی ایک کوٹھڑی میں اور دس ایک میں رہتے تھے۔ صرف اُنمیں چند ایسے تھے جو اپنے خرچ سے سفر کرتے تھے۔ باقی سب کا گذارہ خیرات اور گداگری پر تھا۔ جب میں اُنکی کوٹھڑی میں گیا تو اُنمیں سے بعض اپنا جسم صاف کر رہے تھے۔ میں ناظرین کا دل اُس صفائی کا ذکر کرکے بُرا کرنا نہیں چاہتا۔ مگر افسوس ہے کہ ایک دن ایسا آیا کہ مجھے بھی

اس غلیظ طرز پر اپنا جسم صاف کرنا پڑا۔

مجھے دیکھکر یہ بڑی خاطر سے پیش آئے۔ انہوں نے فوراً سبز چائے بلا مصری کے میرے لیئے تیار کی۔ اور بڑی مشکل سے میں نے ایک پیالی اس چائے کی پی۔ انہوں نے مجھے دوسری پیالی دینی چاہی۔ مگر میرے معدے نے مجھے سمجھا دیا کہ اگر دوسری پیالی پی تو ابھی استفراغ ہو جائیگا چنانچہ میں نے نہائت شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ چائے نوشی کے بعد پھر ہر ایک سے میں نے معانقہ کیا۔ اور بعد اسکے ہر ایک کے ساتھ روٹی کھائی۔ اور سب نے مجھے برادر کے خطاب سے مخاطب کیا۔

بعد از فراغت طعام ہم سب بیٹھ گئے۔ اور صلاح کرنے لگے کہ کونسے رستہ سے جانا چاہیئے۔ رستے دو تھے۔ اور دونوں ترکمانوں کے ملک کے درمیان سے گذرتے تھے۔ ایک رستہ جو براہ مشہد اور ہرو اور بخارا تھا چنداں بے آب و علف نہ تھا۔ مگر یہ تکی ترکمانوں کے ملک کے درمیان سے جاتا تھا۔ اور یہ لوگ اس قماش کے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی پیغمبر بھی انکے ہاتھ لگ جائے تو اس کو بھی نہیں چھوڑتے۔ بلکہ فوراً غلام بنا کر بیچ ڈالتے ہیں۔ دوسرا رستہ یموت ترکمانوں کے ملک کے درمیان سے جاتا تھا۔ یہ لوگ دیانتدار اور مہمان نواز ہیں۔ مگر اس رستہ میں ایک لق و دق دشت آتا تھا جس میں منزل تک راہ میں کہیں پانی کا قطرہ نہیں ملتا۔ ہم نے دونوں رستوں کی نسبت بحث کر کے آخرکار یہ نتیجہ نکالا کہ رستہ کی تنگی منظور ہے۔ مگر ترکمانوں کی شرارت سے پرہیز کرنا چاہیئے غرض سب کی یہی صلاح ہوئی کہ دوسرا رستہ بہتر ہے۔ یہ سن کر حاجی بلال نے دعا مانگی۔ اور سب حاضرین نے اپنی ڈاڑھی ہاتھ میں لیکر آمین کہی

اس دعا کے بعد ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ صبح ہم کو سفر کرنا تھا۔ اس لیئے میں شام کو فرودگاہ سفارت میں آیا۔ میرے دوستوں نے پھر دوبارہ مجھے اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا۔ اور کہا کہ جو حال کونلی۔ سٹارڈٹ اور مورکرافٹ کا ہوا ہے۔ وہ تمکو معلوم ہے۔ پھر اُنہوں نے مجھے کہا کہ تمکو معلوم ہے کہ بلاک ویل جب قید ہوا تھا تو دس ہزار درہم دیکر بمشکل اُس کا چھٹکارا غلامی سے ہوا تھا۔ جو کچھ میرے دوست کہتے تھے وہ سب سچ تھا۔ مگر میرا ارادہ پتھر کی لکیر اور قسمت کی تحریر تھا۔

شام کو میں اپنے دوستوں سے رخصت ہوا۔ صرف دو آدمیوں کو معلوم تھا کہ میں کہاں جاتا ہوں۔ باقی تمام یہ سمجھے ہوئے تھے کہ میں مشہد چلا ہوں۔

فصل ہفتدہم

طہران سے ترکمانوں کے ملک تک

حسب قرارداد ۲۸ مارچ ۱۸۶۳ء کو میں کاروان سرائے میں گیا بعض اشخاص جن کو خچریں یا گدھے کرایہ پر لینے کی توفیق تھی۔ پوست پہنے اور بکلس لٹکائے تیار تھے۔ باقی جو غریب تھے وہ بھی اپنی لاٹھیاں ہاتھوں میں سنبھال کر روانگی کے منتظر کھڑے تھے۔ ان لوگوں نے اس وقت جو کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ پہلے لباس سے بھی ہزار درجہ بدتر تھے۔ کپڑے کیا تھے چیتھڑے تھے۔ جو رسیوں سے اور ڈوروں سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ لباس دیکھ کر میں نے سمجھا کہ اگلے پھٹے پرانے کپڑے گویا اُنکے اچھے کپڑے تھے جو ہر روز نہیں پہنے جاتے۔ اور جو اُنہوں نے اب اُتار کر رکھدیئے ہیں کل میں اپنی نئی پوشاک میں فقیر معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس وقت اس لاغرانی لباس میں میں ان فقیروں کا بادشاہ دکھائی دیتا تھا۔

روانگی سے پہلے دعا کے لئے حاجی بلال نے ہاتھ اُٹھائے اور ابھی ہم سب نے ڈاڑھیاں پکڑ کر آمین نہیں کہی تھی۔ کہ ہمارے قافلے کے غریب مسافر جنہوں نے پاپیادہ چلنا تھا دروازہ سے باہر نکل کھڑے ہوئے تاکہ اُن سے جو سوار ہوکر سفر کرینگے آگے رہیں۔

آفتاب ایک نیزہ کے قریب بلندی پر نکلا ہوگا کہ ہم طہران سے روانہ ہوئے۔ راہ میں میرے ہمراہی مقدس اشعار پڑھتے جاتے تھے اور میں خاموش تھا۔ وہ میرے اس عجیب راگ میں شریک نہ ہونے پر ناراض نہ ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ساکنان استنبول ایسی قیود مذہبی کو چنداں مدنظر نہیں رکھتے۔ لیکن اُنکو امید تھی کہ انکی رفاقت میں رفتہ رفتہ میں سب کچھ سیکھ جاؤں گا۔

اس قافلہ میں میرے علاوہ تیئیس آدمی اور تھے۔ یہ تمام خوقند اور مشرقی ترکستان کے رہنے والے تھے۔ اور زیادہ کاشغر تاشقند اور آقسو کے رہنے والے تھے۔ اُنکے سرداروں کے نام یہ تھے۔ حاجی بلال۔ جنکا میں پہلے ذکر کرچکا ہوں۔ حاجی شیخ سلطان محمود۔ یہ ایک متعصب نوجوان تاتاری تھا۔ جو اپنے آپ کو کسی مشہور والی کی نسل سے بتاتا تھا۔ حاجی صالح خلیفہ یہ ایک نیم مُلّا تھا۔ اور عالیشان (شیخ) کا لقب حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان تینوں نے مجھے اپنا دوست بنالیا اور ہم چاروں اس قافلہ کے سالار سمجھے جانے لگے۔ اس وقت تک میرا نام رشید آفندی تھا۔ اب میرا نام حاجی رشید ہوا۔

ہم سلسلۂ کوہ البرز کی بلندیوں کو طے کرتے ہوئے کیمرو تک بخیریت تمام پہونچ گئے۔ پہلا مقام ہمکو کیمرو میں کرنا تھا۔ راہ میں کوئی جائے پناہ بجز ایک ویران جھونپڑی کے نہ تھی۔ یہ جھونپڑی جنگل کے درمیان بنی ہوئی تھی۔ اس کی دیواریں جو مٹی کی تھیں گرنے والی ہو رہی تہیں۔ اور یہی ڈر رہتا تھا کہ اب گریں یا اب گریں۔ اس وقت بارش ہو رہی تھی۔ اور چھت کے سوراخوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

اس جھونپڑی میں بالشت بھر جگہ نہ تھی کہ انسان بیٹھ سکتا۔ جب ہم شام کو کاروان سرائے میں پہونچے تو میرے دوست حاجی بلال نے پلاؤ پکا لیکن چونکہ گھی دستیاب نہ ہوا تھا۔ اُس نے چربی کی تھیاں گرم کر کے چاول میں ڈال دیں۔ اور مجھے کہا کہ آؤ کھانا کھاؤ۔ میرے دل نے گواہی نہ دی کہ یہ لذیذ کھانا کھاؤں۔ اس لیے میں نے کہا کہ مجھے بھوک نہیں ہے اور اُٹھکر میں فقیروں اور خچر والوں کے درمیان جا بیٹھا۔ اُس وقت نہایت زور سے آندھی چل رہی تھی۔ اور باہر سے بارش کی آواز آ رہی تھی۔ اُس وقت میں نے اپنی موجودہ حالت کا گذشتہ حالت سے مقابلہ کیا۔ شب گذشتہ سفیر کے ہاں میری پُر تکلف دعوت تھی۔ طرح طرح کے کھانے میز پر چُنے گئے تھے۔ نفیس شراب کثرت سے موجود تھی۔ اور یہاں اب مجھے لیٹنے کو جگہہ نہ ملتی تھی۔ میرے اردگرد میرے رفیق بدبودار کپڑے پہنے خراٹے لے رہے تھے۔ ایک خچر والے کو وجع المفاصل کا مرض تھا۔ اُسنے تمام رات مجھے سونے نہ دیا۔ میرے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ اور میں سردی سے کانپ رہا تھا۔ تمام رات میں ایک لمحہ نہ سویا اور جب صبح کو ہم روانہ ہوئے تو مجھہ میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ زین پر اچھی طرح سے بیٹھ سکوں۔

دوسری رات ہمکو شلار نامی گاؤں میں آئی۔ یہاں ہمیں قدرے آرام ملا۔ میں اور حاجی بلال اور اُسکے دونوں رفیق ایک کسان کی کوٹھڑی میں فروکش ہوئے۔ ابکے پھر مجھے حاجی موصوف نے بلایا کہ آؤ کھانا کھاؤ۔ ہرچند کہ میرا دل نہ چاہتا تھا۔ مگر بھوک بڑی بلا ہوتی ہے۔ میری انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ عالم مجبوری میں میں اُٹھا اور اپنے رفیقوں

کے ساتھ جا بیٹھا۔ جو سب ایک غلیظ رکابی کے گرد بیٹھے ہوئے بڑے بڑے لقمے اپنے گندے ہاتھوں سے مُنہ میں ڈال رہے تھے۔ اِس کابی سے میں نے آتش گرسنگی کو فرو کیا۔ اور سو گیا۔ دوسرے دن جب میری آنکھ کُھلی تو میری حالت آگے سے اچھی تھی۔

جب ہمارا گذر دیہات میں سے ہوا تو چند دیہاتی ایرانی مجھے پہچان گئے اور مجھے کہنے لگے کہ نہ تو تو تاتاری ہے اور نہ تُرک ہے۔ بلکہ تو تو فرنگی ہے۔ اور درویشوں کے لباس میں وسط ایشیا میں اس لئے جاتا ہے تاکہ وہاں کے حالات دریافت کرے۔ کیونکہ وہاں فرنگیوں کو گھسنا نہیں ملتا۔ مگر شکر ہے اُنہوں نے یہ معاملہ میرے ہمراہیوں کو نہ بتایا۔ نہ بتانے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ شیعہ ہیں۔ اور تاتاری سُنی ہیں۔ اور چونکہ شیعہ لوگ عموماً سُنیوں کو دوست نہیں رکھتے۔ اِس لیے سنیوں کی ذلت میں خوش ہوتے ہیں۔ پس یہ لوگ خوش تھے کہ فرنگی اُنکے ملک میں جاکر اُنکی تمام شیخی نکال دے۔ اور اُنکے دعوے کو باطل کرے۔

چوتھے دن میں فیروز کوہ کے قصبہ میں جو اُس کوہ میں واقعہ ہے پہنچا۔ اِس حصّہ کی اور اُسکے قرب و جوار کی خوبصورتی دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ یہاں کے مکانات نہائت صاف سُتھرے اور خوبصورت بنے ہوئے ہیں۔ اور ایک گہرا چشمہ پانی کا یہاں تین طرف بہتا ہے۔ بڑے بڑے قافلہ یہاں سے نارنگیاں۔ نیشکر تربوز وغیرہ بحر خزر کی پیداوار لاد کر شاہرود اور طہران کو لیجاتے ہیں۔ اور وہاں سے اناج لاد کر لاتے ہیں۔ جو یہاں بالکل پیدا نہیں ہوتا۔

فیروز کوہ سے ہم ایسے رستے پر روانہ ہوئے جو گھنے اور دو رعد از

میں جسکا نام یعقوب تھا روانہ ہوئے۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا اور اُسکے چہرہ سے تہوّر اور شجاعت کے آثار نمودار تھے۔ یہ ہم سے باری باری بغلگیر ہوا۔ اور اُس نے کہا کہ میں تمہاری خاطر ایک دن اور ٹھہرنے کو تیار ہوں۔ تاکہ تم ضروریات روزمرہ خرید لو۔ اس جگہ سے ہم نے آرد چاول اور دیگر اشیاء خوردنی اس قدر خریدیں جو خیوا تک ہمارے کام آسکیں حاجی بلال۔ حاجی صالح اور میں جب اس نوجوان ترکمان سے رخصت ہونے لگے تو اُس نے مجھے کہا کہ آپ چند منٹ کے لیئے ٹھہر جائیں۔ میں ٹھہر گیا تو اُس نے مجھے کہا کہ میں ایک عاشق ہوں۔ اور میرے عشق کا علاج ایک یہودی نے جو قراتیپ میں تھا سوچا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کہیں سے مکہ کا تیس قطرہ تازہ عطر گلاب ہاتھ آئے تو ایسا نسخہ لکھوں گا کہ کام بنجائے گا۔ تم چونکہ ان حاجیوں میں نوجوان ہو ضرور اپنے ساتھ عطر گلاب لائے ہوگے۔ برائے مہربانی مجھے تھوڑا سا عطر دو تاکہ میرا دلی مقصد حاصل ہو جائے۔ میرے ہمراہی واقعی عطر گلاب اپنے ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ ہم نے اسکو عطر گلاب دیا اور وہ بہت ممنون ہوا۔

علی الصباح ہم تمام سمندر کے کنارے پر جمع ہوئے۔ ہمارے پاس فقیرانہ جھول کے سوا ایک ایک تھیلا آٹے کا تھا۔ جہاز ساحل سے ایک میل پر کھڑا تھا۔ اور کنارے کے پاس پانی بہت پایاب تھا۔ اس لیئے بڑی دیر کے بعد ہم کشتی میں سوار ہو کر جہاز میں پہنچے۔ یہ ایک مستول والا اور ایک بادبانی جہاز تھا۔ اور اُسمیں جزیرہ شرقین سے نمک اور روغن نفط وغیرہ آیا تھا۔ اور اب یہاں کی پیداوار اُس طرف لیجا رہا تھا۔ ترکمان یعقوب نے ہمیں دو قطاروں میں بٹھایا۔ تاکہ وہ ہمارے درمیان گذر سکے۔

دن کو تو خیر مگر رات بڑی بے آرامی سے گذرتی تھی۔ ایک حاجی بڑے زور سے خراٹے لیتا تھا۔ میں کبھی کبھی دو حاجیوں کے درمیان آ جاتا تھا۔ مجھے اپنا تکیہ بناتے تھے۔ میری مجال نہ تھی کہ انکو جگاؤں۔ اور کہوں کہ سنبھل کر بیٹھو۔ کیونکہ سوتے کو جگانا بڑا گناہ ہے۔ چونکہ ۱۰ اپریل کی پچھوا ہوا ہمارے موافق چل رہی تھی۔ ہم نے بخیریت تمام سفر کیا۔ اور پھر کنارے کے پاس ہم نے جہاز کا لنگر کیا۔ اور باری باری چائے تیار کر کے پینے لگے۔ دوسرے دن ہم اشور دہ میں پہنچے۔ یہ مقام روس کے ایشیائی مقبوضات کی جنوبی انتہا ہے۔ یہاں بندرگاہ میں ایک یا دو جنگی جہاز روس کے ہمیشہ موجود رہتے ہیں کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ باوجود روسی [illegible] کی بڑی کوشش کے کئی بیکس ایرانی اور روسی ملاح بھی گرفتار ہو کر گوشہ تیپ میں بطور غلام فروخت کئے گئے ہیں۔ روسی جہاز ہر وقت سمندر میں ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں اور جو ترکمانی جہاز آتا ہے جب تک وہ پروانہ راہداری حاصل نہ کرے یہاں سے گذرنے نہیں پاتا۔ اس موقعہ پر جہاز کی اکثر تلاشی بھی لی جاتی ہے۔ تاکہ بارود اسلحہ اور غلام وغیرہ نہ ہوں۔

یعقوب کے پاس پروانہ راہداری موجود تھا۔ اُس نے روسی افسر کے پیش کیا۔ لیکن چونکہ شام ہو گئی تھی۔ اس لئے روسی افسر نے کہلا بھیجا کہ میں کل جہاز پر آؤں گا۔ ہم نے کنارے کے پاس لنگر کیا۔ لیکن رات بھر میں یہیں رہا کہ کہیں روسی مجھے پہچان نہ لیں اور مجھے جانے سے روکیں اور میرا راز افشا ہو جائے۔ دوسرے دن گرجا کے گھنٹے کی آواز سے میں جاگا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ آج اتوار ہے۔ ایک جنگی جہاز پر تمام جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ملاح جنہوں نے وردیاں پہنی ہوئی

میں جسکا نام یعقوب تھا روانہ ہوئے۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا اور اُسکے چہرہ سے تہوّر اور شجاعت کے آثار نمودار تھے۔ یہ ہم سے باری باری بغلگیر ہوا۔ اور اُس نے کہا کہ میں تمہاری خاطر ایک دن اور ٹھہرنے کو تیار ہوں۔ تاکہ تم ضروریات روزمرہ خرید لو۔ اس جگہ سے ہم نے آرد چاول اور دیگر اشیاء خوردنی اس قدر خریدیں جو خیوا تک ہمارے کام آسکیں۔ حاجی بلال حاجی صالح اور میں جب اس نوجوان ترکمان سے رخصت ہونے لگے تو اُس نے مجھے کہا کہ آپ چند منٹ کے لئے ٹھہر جائیں۔ میں ٹھہر گیا تو اُس نے مجھے کہا کہ میں ایک عاشق ہوں۔ اور میرے عشق کا علاج ایک یہودی نے جو قرا تیپ میں تھا سوچا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کہیں سے مکہ کا تیس قطرہ تازہ عطر گلاب ہاتھ آئے تو ایسا نسخہ لکھوں گا کہ کام بنجائے گا۔ تم چونکہ ان حاجیوں میں نوجوان ہو ضرور اپنے ساتھ عطر گلاب لائے ہوگے۔ برائے مہربانی مجھے تھوڑا سا عطر دو تاکہ میرا دلی مقصد حاصل ہوجائے۔ میرے ہمراہی واقعی عطر گلاب اپنے ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ ہم نے اسکو عطر گلاب دیا اور وہ بہت ممنون ہوا۔

علی الصباح ہم تمام سمندر کے کنارے پر جمع ہوئے۔ ہمارے پاس فقیرانہ جھول کے سوا ایک ایک تھیلا آٹے کا تھا۔ جہاز ساحل سے ایک میل پر کھڑا تھا۔ اور کنارے کے پاس پانی بہت پایاب تھا۔ اس لئے بڑی دیر کے بعد ہم کشتی میں سوار ہوکر جہاز میں پہنچے۔ یہ ایک مستول والا اور ایک بادبانی جہاز تھا۔ اور اُسمیں جزیرہ شرقین سے نمک اور روغن نفط وغیرہ آیا تھا۔ اور اب یہاں کی پیداوار اُس طرف لیجا رہا تھا۔ ترکمان یعقوب نے ہمیں دو قطاروں میں بٹھایا۔ تاکہ وہ ہمارے درمیان سے گذر سکے۔

دن کو تو خیر مگر رات بڑی بے آرامی سے گذرتی تھی۔ ایک حاجی بڑے زور سے خرآ ٹے لیتا تھا۔ میں کبھی کبھی دو حاجیوں کے درمیان آجاتا تھا۔ مجھے اپنا تکیہ بناتے تھے۔ میری مجال نہ تھی کہ انکو جگاؤں۔ اور کہوں کہ سنبھل کر بیٹھو۔ کیونکہ سوتے کو جگانا بڑا گناہ ہے۔ چونکہ ۱۱ اپریل کی پچھوا ہوا ہمارے موافق چل رہی تھی۔ ہم نے بخیریت تمام سفر کیا۔ اور پھر کنارے کے پاس ہم نے جہاز کا لنگر کیا۔ اور باری باری چائے تیار کر کے پینے لگے۔ دوسرے دن ہم اشور دہ میں پہنچے۔ یہ مقام روس کے ایشیائی مقبوضات کی جنوبی انتہا ہے۔ یہاں بندرگاہ میں ایک یا دو جنگی جہاز روس کے ہمیشہ موجود رہتے ہیں کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ باوجود روس[illegible] ز کی بڑی کوشش کے کئی ہکیں ایرانی اور روسی ملاح بھی گرفتار ہو کر گومش تیپ میں بطور غلام فروخت کیے گئے ہیں۔ روسی جہاز ہر وقت سمندر میں ادہر اُدہر پھرتے رہتے ہیں اور جو ترکمانی جہاز آتا ہے جب تک وہ پروانہ راہداری حاصل نہ کرلے یہاں سے گذرنے نہیں پاتا۔ اِس موقعہ پر جہاز کی اکثر تلاشی بھی لی جاتی ہے۔ تاکہ بارود اسلحہ اور غلام وغیرہ نہ ہوں۔

یعقوب کے پاس پروانہ راہداری موجود تھا۔ اُس نے روسی افسر کے پیش کیا۔ لیکن چونکہ شام ہوگئی تھی۔ اِس لیئے روسی افسر نے کہلا بھیجا کہ میں کل جہاز پر آؤں گا۔ ہم نے کنارے کے پاس لنگر کیا۔ لیکن رات بھر میں بیچین رہا کہ کہیں روسی مجھے پہچان نہ لیں اور مجھے جانے سے روکیں اور میرا راز افشا ہو جائے۔ دوسرے دن گرجا کے گھنٹے کی آواز سے میں جاگا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ آج اتوار ہے۔ ایک جنگی جہاز پر تمام جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ملاح جنہوں نے وردیاں پہنی ہوئی

تھیں۔ وہ نبالہ کشتی پر آئے۔ اور ہم کو کہا کہ روسی جہاز کے قریب چلو
میں۔ نے اپنے جہاز پر سے دیکھا کہ کئی خوبصورت افسر وہاں کھڑے ہیں میرا
دل اُس وقت دھڑک رہا تھا۔ چونکہ اتوار کا دن تھا۔ جلدی جلدی
تلاشی لیگئی۔ یہ افسر اُن لوگوں کو دیکھ کر مذاق اُڑاتے تھے ایک نے
میری طرف دیکھکر کہا۔ دیکھنا اِس حاجی کا رنگ کیسا گورا ہے۔ جب تلاشی
ہوچکی تو یعقوب کو اجازت ہوگئی کہ ہاں جہاز لیجاؤ۔ اور ہم منزل مقصود
کی طرف روانہ ہوئے۔ گارگھن کے دہانہ کے قریب ڈیڑھ میل کے فاصلہ سے
مجھے گومش تپہ کے خیمے نظر آئے۔ یہ دور سے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے
شہد کی مکھیوں کے چھتے ایک پاس پاس رکھے ہوں۔

فصل ہاشردہم

گومش تیپ

کچھ عرصہ تک ہمیں سمندر میں رہنا پڑا۔ پہلے یعقوب کنارہ پر گیا۔ اور اسنے جاکر کشتیاں بھیجیں۔ اور ہم میں سے تھوڑے آدمی کشتیوں پر بیٹھکر خشکی پر پہنچے۔ سب سے اخیر حاجی بلال اور میں کشتی میں سوار ہوکر کنارے پر آئے جب ہم نے خشکی میں قدم رکھا تو ہمیں معلوم ہوا کہ یعقوب نے گومش تیپ کے سردار خان جان کو پہلے ہی ہمارے آنے کی خبر کردی ہے۔ اور وہ ہمارے استقبال کے لیئے آرہا ہے۔ اس وقت وہ سردار ہم سے کچھ فاصلہ پر نماز ظہر میں مشغول تھا۔ نماز سے فارغ ہوکر وہ قدم برداشتہ ہماری طرف آیا۔ یہ ایک دراز قامت دُبلا پتلا جوان تھا۔ اُس کا لباس سادہ تھا۔ اِسکی عمر چالیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اور اِسکی دراز ریش چھاتی تک لٹکتی تھی۔ سب سے پہلے اِس نے مجھ سے معانقہ کیا۔ پھر حاجی بلال سے اور پھر حاجی صالح سے بغلگیر ہوا۔ اور مجھے میرا نام لیکر خوش آمدید کہا۔ یہ سردار ہمارے تمام قافلہ کو خیمہ میں لیگیا۔ ہمارے آنیکی خبر ہر طرف پھیل گئی۔ اور عورتیں بچے اور کتے بلا تمیز خیموں سے نکلکر ہماری طرف دوڑے۔ اِن لوگوں کو ملاؤں نے یہ سمجھایا ہوا تھا کہ حاجیوں کا دیکھنا یا اُنسے

معانقہ کرنا خدا کی رحمت کا باعث ہوتا ہے۔ اور حج کے ثواب کا حصہ دار بناتا ہے۔ یہ نظارہ عجیب وغریب تھا۔ اور میں نہیں جانتا تھا کہ پہلے کس طرف دیکھوں۔ سفید سفید خیمے عجیب طرح کے بنے ہوئے تھے۔ اور عورتیں ریشمی لباس پہنے ہوئے تھیں جو انکی ایڑیوں تک پہنچتے تھے۔ اس موقعہ پر میں نے سینکڑوں بندگان خدا سے مصافحہ کیا۔ مرد۔ عورتیں اور بچے دوڑے آرہے تھے کہ حاجیوں کی زیارت کریں۔ اور اُنکے لباس کو ہاتھ لگائیں۔ اُنکا یہ خیال تھا کہ مکہ اور مدینہ کی خاک ابھی تک اُنکے لباس کو لگی ہوئی ہے۔ آخر کار ہم اِن لوگوں کی ملاقات سے تھک کر اُن کے سردار کے خیمہ کے آگے جا کھڑے ہوئے اور منتظر ہوئے کہ کوئی خیمہ ہمیں قیام کرنے کے لیئے سپرد کیا جائے۔ اَب لطف دیکھیئے کہ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ حاجی اُسکے مہمان ہوں۔ عورتیں اِس بارہ میں آپسمیں خاصکر کے شور وغل کر رہی بلکہ لڑ رہی تھیں۔ اور ہر ایک کو حاجیوں کی میزبانی کا اشتیاق تھا۔ میں نے اِن خانہ بدوشوں کی مہمان نوازی کا حال سُنا ہوا تھا۔ مگر یہاں آکر میری آنکھیں کھُل گئیں اور میں نے جو کچھ سُنا تھا اُس سے کئی درجہ انکو زیادہ پایا۔ آخر کار جب لوگوں میں تکرار زیادہ ہونے لگی تو خان جان نے دخل دیا۔ اور ہم سب کو مختلف لوگوں میں بطور مہمان تقسیم کر دیا۔ حاجی بلال کو مجھے اور ہمارے شرکا کو اُس نے اپنا مہمان کیا۔ یہ خیمے دریائے گارگن کے دونوں طرف نصب تھے۔ اور خان جان کا خیمہ سب کے پرے تھا اِسلیئے ہم سب خیموں کے درمیان سے گذر کر اُسکے خیمہ میں پہنچے۔ اِس دریا میں مچھلی اِس کثرت سے ہوتی ہے کہ پانی گندہ ہو جاتا ہے۔ اور گرما میں پینے کے قابل نہیں رہتا۔ دو بار میں نے اُس دریا میں غسل کیا۔ اور غسل کے بعد مجھے معلوم ہوا

کہ میرے بدن سے مچھلی کی بدبو آنے لگی ہے۔ جب ہم خان جان کے خیمہ میں پہنچے تو شام ہوگئی تھی اور ہم تھک کر چور ہو گئے تھے۔ یہاں کا دستور ہے کہ خیمہ میں داخل ہونے کے وقت پہلے تین بار خیمہ کا طواف کیا جاتا ہے اور پھر اس کے چاروں کونوں پر تھوکا جاتا ہے۔ ہمیں اُمید تھی کہ خیمہ میں جا کر ہم آرام کریں گے۔ مگر ہمارا خیال غلط نکلا۔ ابھی ہم خیمہ میں داخل ہی ہوئے تھے کہ ہزاروں آدمی ہمیں ملنے کو آ گئے۔ اور اُنہوں نے ہم سے اس قسم کے مختلف سوالات کیے کہ ہم جواب دیتے دیتے تھک گئے یہ لوگ بڑی دیر تک ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ آخرکار ہمارے میزبان کو ہمارے حال پر رحم آیا۔ اور اُسنے اُن لوگوں کو کہا کہ اب مہمانوں کو آرام کرنے دو۔ خان جان کا دوازدہ سالہ بیٹا جس کا نام باجان تھا ہمارے لیئے کھانا لایا۔ ایک غلام مچھلی اور کھٹے دودھ کا ایک بڑا اغوان سر پہ لیئے ہوئے باجان کے ساتھ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک بڑی بھاری زنجیر اس غلام کے پاؤں میں پڑی ہوئی تھی۔ باجان نے رکابیاں ہمارے روبرو رکھدیں۔ ہم بھوکے تو تھے ہی۔ خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ خان جان ہمیں نہائت رغبت سے کھانا کھاتے دیکھکر بہت خوش ہوا۔ بعد از فراغت دُعا مانگی گئی۔ حاجی بلال نے حسب معمول ہاتھ اُٹھایا اور سب نے اُسکی پیروی کی۔ اور پھر سب نے آخر میں ڈاڑھیوں پر ہاتھ پھیر کر بسم اللہ واللہ اکبر کہا۔ حاضرین نے خان جان کو مہمانوں کی آمد کی مبارکباد دی اور چلے گئے

دوسرے دن ۱۳۔ اپریل تھی اور جب میں صبح کو بیدار ہوا تو رات بھر کی بیخبر نیند سے از سر نو میری طبیعت تر و تازہ ہو گئی تھی۔ حاجی بلال میرا منتظر چارپائی کے پاس کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے کہا کہ آؤ سیر کر آئیں

میں اُسکے ساتھ ہو لیا- راہ میں اُس نے مجھے نصیحت کی کہ آپ اپنے عہدہ کو
خیرباد کہو اور بالکل درویش بن جاؤ- اُس نے کہا آپنے دیکھا ہوگا کہ میرے
ساتھیوں نے بلالحاظ عمر کے لوگوں پر فاتحہ پڑھ کر پھونکی ہے- اگرچہ میں جانتا
ہوں کہ روم میں یہ دستور نہیں ہے- لیکن یہاں اِس کا عام رواج ہے-
پھر آپکو چاہیئے کہ جب لوگ آپکے پاس آئیں تو اُنکے حق میں دعا کرو- جب
کوئی بیمار آپکے پاس آئے تو کچھ پڑھکر اِس پر دم کرو- یہ باتیں درویشوں
کے لئے ضروری ہیں اور یہ بھی واضح رہے کہ اگر کوئی کچھ دے تو انکار نکرو-
خیرات لینا درویشوں کے لیئے عیب کی بات نہیں- بلکہ اِن لوگوں کا عام خیال
یہ ہے کہ ہم درویشوں کا گذارہ اِسی پر ہے- حاجی بلال نے یہ بھی کہا کہ آپ
مجھے معاف کریں کہ میں نے یہ نصیحت آپکو اِس لیئے کی ہے کہ اِسمیں سراسر
آپکا ہی فائدہ ہے مینے اِسکی نصیحت کو گوش ہوش سے سُنا حاجی بلال نے مجھے
اِس بات سے بھی مطلع کیا کہ خان جان اور دیگر ترکمان تمہاری نسبت
مجھ سے ایسے ایسے سوالات کرتے تھے- جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اُنکے دلمیں
تمہاری نسبت شک ہے- مینے بڑی مشکل سے اُنکو یقین دلا دیا ہے کہ اُن کا
خیال خیام ہے- اور تم سرکاری اہلکار نہیں ہو- ترکمانوں کا خیال تھا کہ میں
بخارا اور خیوا میں سلطان کی طرف سے روسیوں کے برخلاف کوئی پیغام
لیکر جا رہا ہوں- حاجی بلال کو معلوم تھا کہ اِن لوگوں کے دلوں میں سلطان
کی بہت عظمت ہے اِسلیئے اُس نے علانیہ اُنکے خیال کی تردید نہ کی- تاکہ
میری اِن لوگوں کی نگاہوں میں اور زیادہ وقعت ہو جائے-

جب میں اور حاجی بلال خیمے میں واپس آئے تو خان جان اور
اُنکے دیگر اقارب اور دوست ہمارے منتظر تھے- جب ہم واپس آئے تو خان جان

اپنی زوجہ اور ضعیف العمر والدہ کو دُعا کے لیئے ہمراہ لائے۔ پھر ہمارے میزبان نے ہمیں کہا کہ ترکمانوں کے رواج کے بموجب مہمان عزیزوں سے بڑھکر ہوتے ہیں۔ اس لیئے نہ صرف قوم کلنے میں جا سکتے ہیں۔ بلکہ یموتوں کے درمیان بھی جا سکتے ہیں۔ جہاں اِن چاہے تشریف لیجائیں۔ اگر آپکا کہیں بال تک بینکا ہوا تو میں ذمہ وار ہوں۔ ابھی آپ ہمارے پاس دو ہفتہ مہمان رہیں۔ اس اثنا میں آپ اِن خیموں کی سیر کریں۔ جب کوئی قافلہ خیوا کو جاتا ہوا ادہر سے گذرے گا تو آپ کو اُسکے ساتھ بھیجدیں گے۔ یہ ترکمان مہمان نواز آدمی ہوتے ہیں۔ اور آپکو خالی ہاتھ نہیں جانے دیں گے۔ یہاں سے اپنے خرجیوں کو زاد راہ سے بہرنے میں آپ کا فائدہ ہی ہے کیونکہ خیوا اور بخارا تک آپ کو بڑی بھاری مسافت طے کرنی پڑیگی؛

ہم نے خان جان کی صلاح بخوشی منظور کی۔ پہلے دنیں خان جان اُسکے بھائی اور کنبہ کے ساتھ مختلف خیموں میں گیا۔ اور پھر حاجی بلال کے ساتھ جانے لگا۔ حاجی صالح کو حکمت میں بھی دخل تھا۔ اس لیئے ہمارے پاس کثرت سے مریض آتے تھے۔ لوگ مجھے حاجی روم کہتے تھے۔ اور یا تو اس لیئے کہ ان کو میرے علاج سے فائدہ ہوتا تھا یا اسلیئے کہ روم کے حاجی کو دیکھیں وہ جوق جوق میرے پاس آتے تھے۔ میں کسی کے حق میں دعا کرتا تھا۔ کیکو دم کرکے ٹالدیتا تھا۔ کسی کے لیئے تعویذ لکھتا تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ بعض بعض شکی آدمی مجھ پر شبہ کرتے تھے۔ کہ یہ اصلی درویش نہیں۔ مگر میں اُنکی مطلق پروا نہ کرتا تھا۔ یہاں ہر روز میری ملاقات بڑہتی گئی۔ قزل آخوند کی دوستی جسکا اصل نام ملا مراد تھا میرے بہت کام آئی۔ یہ شخص بڑا فاضل تھا اور اُسکی عام طور پر عزت کیجاتی تھی۔ اُسکی سفارش سے تمام راستے میرے لیئے

کھل گئے۔ اس شخص کے پاس ایک کتاب فقہ کی عثمانی ترکی زبان میں تھی یہ اُسنے اُن ایام میں خریدی تھی۔ جبکہ وہ بخارا میں تعلیم پاتا تھا۔ بیچارہ اس کتاب کو اچھی طرح سمجھ نہ سکتا تھا۔ میں نے اُسکو بتادیا کہ اس طرح سمجھ جاؤگے اس بات سے یہ اسقدر خوش ہوا کہ لوگوں کے سامنے میری فضیلت کی اُسنے بڑی تعریف کی۔ اور کہا کہ یہ شخص دینیات کا بڑا عالم ہے۔ اس اثنا میں میں نے ایک اور فاضل شلنغ اخوا ند تک رسائی حاصل کرلی۔ جب میں پہلی مرتبہ اُس سے ملا تو اُس نے دو نفل شکرانے کے پڑھے کہ خدا نے روم کا ایک سچا مسلمان اُسکے پاس بھیجا ہے۔ جب لوگ اُس شخص کے سامنے میرے سفید رنگ کا ذکر کرتے تھے۔ تو وہ کہا کرتا تھا کہ یہ نور اسلام ہے جو صرف مغربی مسلمانوں کی قسمت میں لکھا ہے۔ اِن وحشی لوگوں میں مُلّانوں اور علما کا بہت رسوخ تھا۔ اسلیئے قاضی کلاں ملّا درویش سے بھی مینے ملاقات کی۔ اور دوستی پیدا کرلی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ ملا ہی اِن وحشی لوگوں کی طبیعت پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ چنانچہ اُنکے ملنے سے یہاں کے لوگ مجھے بھی فاضلوں میں شمار کرنے لگے۔ اسکی تائید میں میں ایک واقعہ لکھتا ہوں۔

گومش تیپ میں قدیم زمانہ کے کھنڈرات بھی ہیں جنکی دیواریں ابتک موجود تھیں۔ غالباً یہ سکندر اعظم کی عمارت تھی۔ بجز اس عمارت کے اور کوئی عمارت اس مقام میں دکھائی نہیں دیتی۔ چونکہ اِن کھنڈرات میں اینٹیں اور دیگر مصالحہ کثرت سے تھا۔ یہاں کے باشندوں نے اِس سے فائدہ اُٹھاکر ایک مسجد بنالی۔ جب میں یہاں گیا تو قاضی کلاں نے مجھے بہت بڑا فاضل سمجھ کر کہا کہ آپ براہ مہربانی یہ دیکھ دیں کہ کعبہ کس طرف ہے تاکہ سجدہ کرنے میں مغالطہ نہ ہو۔ میں فوراً اُس جگہ گیا اور قاضی کلاں کے

ارشاد کو بجا لایا۔

اس قاضی کلاں کے ساتھ مینے یموتوں کی ایک قوم کی جو مشرق کی طرف رہتی تھی ۴ دن تک سیر کی۔ اور گوکلن ترکمانوں میں بھی گیا۔ ہمارا ایک رفیق، حاجی قلندری مسعود ایک خیمہ میں تھا جو بطور مسجد استعمال ہوتا تھا رہتا تھا۔ جب میں واپس آیا تو مینے سُنا کہ اُسکی چند اشیا چورائی گئی ہیں۔ ہرچند چور کی تلاش کی گئی۔ مگر کچھ پتہ نہ ملا۔ آخرکار شیخ نے اعلان کیا کہ اگر چور خود بخود یہ اشیا نہ لا یا تو اُسکے حق میں بد دعا کی جائے گی۔ واقعی اس دہمکی سے چور ایسا ڈرا کہ ابھی چوبیس گھنٹے نہ گذرنے پائے تھے کہ وہ نہ صرف مال مسروقہ واپس لے آیا۔ بلکہ بطور جرمانہ اپنے پاس سے بھی کئی چیزیں بطور نذرانہ لایا۔ انہیں ایام میں ہمنے خوشخبری سُنی کہ خان خیوا کو طبیبوں نے کہا تھا کہ تم بیمار رہتے ہو۔ اس لیئے بھینس کا دودھ پیو۔ چونکہ خیوا میں بھینس نہیں ہوتی۔ خان موصوف نے اپنے کاروان باشی کو حکم دیا تھا کہ دو بھینسیں استرآباد سے خرید لاؤ چنانچہ کاروان باشی بھینسیں خرید کر خیوا کو واپس جا رہا تھا۔ اور قافلہ گومش تیپے سے گذرنے لگا۔ اس کاروان باشی سے بہتر ہمیں کون رہنما مل سکتا تھا۔ یہ تمام بیابان کے حالات سے بخوبی واقف تھا۔

اگرچہ ہمارے رفقا کی یہاں نہائت درجہ تک خاطر اور تواضع ہوتی تھی۔ مگر ان میں کئی ایسے تھے کہ جو یہی چاہتے تھے کہ جلد ہی یہاں سے چلیں۔ مینے اُنسے دریافت کیا کہ وہ دل برداشتہ کیوں ہیں تو اُنہوں نے جواب دیا

کہ یہاں جو ظلم ان ایرانی غلاموں پر ہوتا ہے وہ ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ درحقیقت ترکمان غلاموں پر سخت ظلم کرتے ہیں ناظرین خیال کر سکتے ہیں کہ جن غلاموں کی حالت پر تاتاری بھی چیختے ہیں فی الواقعہ غلامی کا

دستور نہیں رحم کھایا ہے۔ وہ کیسی مصیبت میں مبتلا ہونگے۔ ترکمان رات کے وقت عموماً شبخون مار کر اُن غلاموں کو مجروح اور خستہ حال اُنکے کنبوں سے جُدا کر کے لے آتے ہیں۔ اور پھر اچھا لباس نہیں پہننے دیتے۔ اور انھیں ہر وقت پابہ زنجیر رکھتے ہیں۔ ان بیڑیوں کے باعث چلنے پھرنے کے وقت بیچاروں کو ہر قدم پر بہت تکلیف اور درد اُٹھانے پڑتے ہیں۔ غذا جو اُنکو دیجاتی ہے وہ نہایت سادی ہوتی ہے۔ رات کے وقت انکے گلے میں لوہے کا طوق ڈالکر اُنکو بند کر دیتے ہیں۔ تاکہ یہ بھاگ نہ جائیں۔ اس طوق کے باعث اگر یہ ذرا بھی ہلتے جلتے ہیں تو آواز ہوتی ہے۔ غلام اس حالت میں مُدت تک رہتے ہیں۔ اور بیچاروں کو اُس وقت خلاصی ہوتی ہے کہ جب یا تو اُنکے رشتہ دار بہت سا روپیہ داخل کر کے اُنکو آزاد کرالیں یا وہ خیوا اور بخارا میں لیجا کر بیچے جائیں۔

ہر ایک معزز ترکمان کے پاس غلاموں کا ہونا ضروری ہے۔ خان جان کے ہاں بھی مینے دو غلام دیکھے۔ یہ اٹھارہ یا بیس بیس سال کی عمر کے نوجوان مسلسل بہ طوق و زنجیر تھے۔ اور انکی تکلیف دیکھکر اکثر میرا دل دُکھتا تھا۔ بڑی شامت یہ تھی کہ مجھے اپنی مرضی کے خلاف صرف دکھاوے کے لیے ان غلاموں کو بُرا بھلا کہنا پڑتا تھا۔ یہ میں اس لیے کرتا تھا کہ میں انکی زبان سے واقف تھا۔ اور یہ اکثر مجھ سے گفتگو کرتے تھے۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں لوگوں کو میری طرف سے شک نہ ہو۔ ان دو غلاموں میں سے چھوٹے لڑکے نے ایک دن مجھے کہا کہ برائے خدا میری طرف سے ایک خط میرے والد کے نام ایران میں لکھو کہ وہ اپنا مکان اور بھیڑیں بیچ ڈالے۔ اور مجھے اس عذاب سے نجات دلوائے۔ یہ ایک خوبصورت ژولیدہ مو نوجوان تھا

میں نے اِسکے کہنے کے بموجب خط لکھدیا - ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اور یہ خیمہ میں تنہا تھے - مینے رحم کھاکر ایک پیالہ چائے کا اُسکو دیدیا - ابھی اُسنے پیالہ ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ کوئی خیمہ میں آگیا - ناچار میں نے اُٹھکر اُسکے ہاتھ سے پیالہ چھین لیا - اور دو چار تھپڑ اُسکو مارے - گویا میں اِس غلام سے مذاق کرتا تھا - اور دراصل میرا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ چائے پیئے - جبتک میں گومش تپے میں رہا ہرات ہندو قوں کی آواز مجھے سنائی دیتی تھی - جسکے یہ معنے تھے کہ کوئی بردہ فروش آیا ہے -

ترکمان ہمیشہ نذر و نیاز دیتے رہتے ہیں - اور اِس موقعہ پر کل حاجیوں کو شریک جلسہ ہونا پڑتا ہے - ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے نیاز دی میںنے شریک ہونے سے معافی چاہی - مگر جس شخص کے ہاں نیاز تھی وہ میری پسلیوں میں اُنگلیاں چبھوتا ہوا جبراً مجھکو اپنے ساتھ لے گیا - ترکمانی اخلاق میں یہ عام قاعدہ ہے کہ جس قدر زیادہ تشدد کیا جائے اُسیقدر زیادہ اُسکو تواضع خیال کرتے ہیں - اِن نیازوں میں ہمیشہ حاجیوں کو عزت کے ساتھ بلاتے ہیں - جس گھر میں نیاز ہوتی ہے اُسکے باہر چند کپڑے بچھا دیتے ہیں - پھر چھ چھ آدمی ایک ایک سینی کے گرد حلقہ باندھکر بیٹھ جاتے ہیں - سینی کا کھانا کھانے والوں کی عمر اور تعداد کے لحاظ سے کم و بیش ہوتا ہے اور ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر یہ لوگ کھاتے جاتے ہیں - ایسے موقعوں پر اونٹ اور گھوڑوں کا گوشت کثرت سے استعمال ہوتا ہے -

خان جان نے بھی ہمیں ایک دعوت اپنے بیٹے کی نسبت کی تقریب میں دی - اِس لڑکے کی عمر بارہ سال کی تھی اور منسوبہ دس برس کی لڑکی تھی - یہ منگنی موسم خزاں میں ہوتی تھی - مگر اُس نے مناسب سمجھا کہ مصداق

ہم خرما و ہم ثواب حاجیوں کی موجودگی میں یہ رسم بھی ادا ہو جائے۔ ایک اور شخص گرگنش نامی نے بھی ہماری دعوت کی۔ اس شخص نے پا پیادہ اور تنہا تین ایرانیوں کو قید کر لیا تھا۔ اور آٹھ میل تک اُنکو اپنے ساتھ گرفتہ و بستہ لے آیا تھا۔ اس غنیمت میں دسواں حصّہ ہمارا حق تھا۔ اس لیئے اس نے ہم سے ہر ایک کو دو دو قران دیئے۔ اور جب ہم نے اسکے حق میں دعا کی تو وہ باغ باغ ہو گیا۔

گومش تپے میں تین ہفتے کے قیام کے بعد ہم نے روانگی کا سامان کیا۔ پہلے تو ہمارا ارادہ تھا کہ اونٹ لیئے جائیں مگر چونکہ اس مطلب کے لیئے بہت روپیہ درکار تھا۔ ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ دو دو آدمی ملکر ایک اونٹ کرایہ کرلیں اور اس اونٹ پر دو آدمیوں کا آذوقہ (پانی اور آٹا) لاد دیا جائے۔ اس تجویز کو پورا کرنے میں بھی ہمیں بڑی دقت ہوتی۔ مگر ایک شخص نے جسکا نام الیاس بیگ تھا۔ ہماری بہت مدد کی۔ یہ شخص ہمارے مطلب کا تھا۔ یہ پرلے درجہ کا مہمان نواز تھا۔ مگر اسمیں اور اوروں میں یہ فرق تھا کہ اُسکے نزدیک حاجی چنداں قابل وقعت نہ تھے۔ یہ قوم یموت کا ایک ترکمان اور خیوا کا رہنے والا تھا۔ ہر سال یہ ایکبار کاروبار تجارت کے لیئے اُس جگہہ آیا کرتا تھا یہ شخص خان جان کا دوست تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اسکی سلامتی بھی یہاں اور اجنبیوں کی طرح معرض خطر میں تھی۔ اس کا یہ دستور تھا کہ ہر سال خزاں کے موسم میں بیس تیس اونٹ لیکر جنمیں سے بعض پر اسکا اپنا اسباب ہوتا تھا اور بعض پر اوروں کا واپس جاتا تھا۔ اس سال اُسکا ارادہ زیادہ اونٹ ہمراہ لیجانے کا تھا۔ اس بات کی اُسکو پروا نہ تھی۔ کہ اونٹوں پر اسباب ہے یا خالی ہیں۔ اُسکا یہاں ہونا ہمارے لیئے غنیمت ہوا۔ خان جان نے ہمیں اس کے

سپرد کیا۔ اور کہا کہ الیاس اگر انکو تکلیف ہوئی تو تیری خیر نہیں۔ الیاس بیگ نے زمین کی طرف نگاہ کر کے جیسا کہ ان خانہ بدوشوں کا دستور ہے کہا "تم مجھے خوب جانتے ہو" ہمنے الیاس بیگ سے یہ تصفیہ کیا کہ سواری کے اونٹ کے لیئے فی کس دو اشرفیاں اُسکو دیں۔ لیکن پانی اور آٹا وہ ہمارا مفت لیجائے۔

میں نے کچھہ تو نقد اپنے کپڑوں میں جا بجا سیا ہوا تھا۔ یہ اور وہ جو اُس جگہ دم اور تعویذوں کی برکت سے وصول ہوا تھا۔ اس مطلب کے لیئے کافی تھا کہ میں اپنے لیئے علیحدہ ایک اونٹ کرایہ پر لے لیتا۔ مگر میرے دوست حاجی بلال نے مجھے منع کیا اور کہا کہ اگر ان لوگوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو تو ہمیشہ اپنے آپ کو خستہ حال ظاہر کرو۔ اگر ان لوگوں کو یہ جتایا جائے کہ ہم آسودہ حال ہیں تو فوراً اُنکے دہان آز میں پانی بھر آتا ہے۔ ہمارے کئی رفیق جو اس وقت پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں دراصل مالدار ہیں۔ مگر اُنہوں نے دانستہ یہ حالت مصلحتاً بنائی ہوئی ہے۔ مینے اُسکی نصیحت کو قبول کیا اور ایک رفیق کے ساتھ ملکر ایک اونٹ لیا مگر شرط یہ کی کہ اس پر دو کجاوے ہوں۔ کیونکہ میں ٹانگ کے قصور کے باعث چالیس منزل تک ایک ہی ٹوکرے میں دوسرے آدمیوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا تھا پہلے تو الیاس بیگ نے اس بات کو منظور نہ کیا اور کہا کہ اس سے اونٹ پر زیادہ بوجھ ہو جاویگا۔ مگر پھر خان جان کے کہنے سے وہ مان گیا۔ میری خوش نصیبی سے میرا شریک اس موقع پر حاجی بلال ہوا۔ جسکا دم میرے لیئے ازبس ضروری تھا۔

جب یہ تصفیہ ہو گیا تو ہم نے حسب رواج الیاس بیگ کو کرایہ پیشگی دیدیا

پھر حاجی بلال نے فاتحہ کے لیئے ہاتھ اُٹھائے۔ اور جب ایاس بیگ نے اپنی ڈاڑھی کے چند بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا "آمین" تو ہم کو اطمینان ہوا۔ ہم نے ایاس بیگ کو کہا کہ جلدی چلنا چاہیئے مگر اُس نے کہا کہ میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ روانگی کارواں باشی پر منحصر ہے۔ جو بھینسیں لیکر آگے گئے ہونگے اتیراق جو اسی نام کے ایک دریا پر واقع ہے وہ مقام ہے جس کو پہلا اسٹیشن کہنا چاہیئے۔ اس جگہ ہمیں کولک خاں کے ہاں جو قزاقوں کا پیری نز اسفیدلیش سرغنہ تھا جہاں رہنا تھا۔ یہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ مگر اُس کے چہرے سے شرارت اور جلاد کتاپن ظاہر تھا۔ جب اُس کو معلوم ہوا کہ مجھے بھی اتیراق میں جانا ہے تو اُس نے غور سے میری صورت دیکھی۔ اور آہستہ آہستہ خان جان سے کچھ گفتگو کی۔ اُس کے سر ہلانے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا خان جان سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ شخص روس سے ہو آیا تھا۔ اور طرابلس میں بھی رہ چکا تھا۔ اُس نے کہا کہ اُسکی شکل رومیوں سے نہیں ملتی۔ جو ترکمانوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ اس موقعہ پہ حاجی بلال بہت کام آیا۔ اُس نے کہا کہ تمہاری سراسر غلط فہمی ہے۔ میں تو خود روم میں رہ آیا ہوں۔ تمام رومی ترکمانوں سے مشابہ نہیں ہوتے۔ حاجی بلال کی بات سُن کر اُس شخص کی تسلی ہوگئی۔ اُس کا بیٹا جس کا نام کولمان تھا ہم بلاش میں گیا ہوا تھا۔ اور یہ اب اُس کا منتظر تھا۔ اُس نے کہا کہ کل میں اتیراق آجاؤں گا۔ تیار رہنا۔ اگرچہ یہ مقام یہاں سے فقط بارہ میل کے فاصلے پہ ہے لیکن ہم بغیر کولمان کے وہاں نہیں جاسکتے۔ یہ قزاق ہمیں سمندر کے کنارے پر لے گیا۔ جہاں بہت سے اور آدمی کولمان اور اُسکی پارٹی کے منتظر کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمیں سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے

آٹھ سوار دکھائی دیئے۔ انکے ساتھ دس گھوڑے خالی بھی تھے۔ ہر شخص ٹکٹکی لگائے اُن نوجوانوں کی حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ اُنہوں نے چشم زدن میں گارگن دریا کو عبور کر لیا۔ ادہر کنارہ پر آکر بڑی متانت کے ساتھ اپنے دوستوں سے مصافحہ کرنے لگے۔ اگرچہ مجھے ان جوانوں کے پیشے سے نہایت نفرت تھی۔ مگر میں اُنکی شہسواری۔ اُنکے خوبصورت چہرے۔ اُنکے چُست لباس مردانہ وضع اور لمبے لمبے بال جو شانوں تک لٹکتے تھے دیکھکر اپنی حیرت کو روک نہ سکا۔ کولک خاں بھی جو ہر وقت جلا بھنا رہتا تھا۔ تھوڑی سی دیر کیلئے ان جوانوں کو دیکھکر خوش ہوگیا۔ حاجی بلال نے کولک خاں کے نوزعین کے حق میں دعائے خیر کی۔ اور اسکے بعد ہم اپنے اپنے قیامگاہ کی طرف روانہ ہوئے۔

فصل نوزدہم

گومش تپہ سے کنارہ بیابان تک

دوسرے دن دوپہر کے وقت ہم گومش تپہ سے روانہ ہوگئے۔ خان جان اور دیگر اصحاب ہمارے ساتھ ہولیے۔ ہرچند میں نے کئی مرتبہ اُن صاحبان کو کہا کہ آپ واپس تشریف لیجائیں۔ مگر وہ ایک گھنٹہ برابر میرے ساتھ رہے۔ اور کہنے لگے کہ ہم قواعد مہماں نوازی کی خلاف ورزی نہیں کرسکتے جب مفارقت کا وقت آیا تو میرا دل واقعی بھر آیا مجھے فی الحقیقت اس مہماں نواز نیک باطن اور فیاض شخص سے محبت ہوگئی تھی۔ مدت تک اُس نے مجھکو اور پانچ اور اصحاب کو اپنے ہاں مہمان رکھا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں کسی طرح اُس دوست کی مہربانیوں کا معاوضہ نہیں دیسکتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ مجھے اس بات کا قلق تھا کہ میں ایسے دوست کے روبرو بھی اپنی اصلیت نہیں ظاہر کرسکتا تھا۔ اور بمقتضائے ضرورت مجھے اُسکو بھی دھوکا دینا پڑا۔

ہم ایک وسیع اور کف دست میدان میں سے شمال مشرق کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہمارے قافلہ میں الباس کے شتر اور پلید گھوڑے تھے کوتلک خاں نے مجھے یہ کہدیا تھا کہ راہ میں کئی قزاق ایسے ہیں جو میرا حکم

نہیں مانتے۔ اُنہوں نے اگر اپنی جماعت کو طاقت ور پایا تو ضرور تم پر حملہ کرینگے
کولک خاں نے الیاس کو ایک گھوڑا بھی دیدیا تھا۔ تاکہ اتیراق تک مجھے
اونٹ کی سواری کی تکلیف نہ ہو۔ جہاں کہیں راہ میں نالہ آجاتا تھا تو میرا
رفیق بھی میرے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ جاتا تھا۔ اور اِس زور سے میری کمر کو
پکڑ لیتا تھا کہ میں بمشکل زین پر قایم رہ سکتا تھا۔ ایک موقع پر ہمارا گذر
ایک دلدل میں سے ہوا۔ یہاں بہت سے جنگلی سور دلدل کے سرکنڈوں
میں چھپے ہوئے تھے۔ یہاں چلتے چلتے یکایک میرے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی
اور میں اور گھوڑا دونوں گر پڑے۔ ہمارے رفیق ہمیں اس حال میں
دیکھکر ہنسنے لگے۔ مگر میں نے لپٹ پیچھے عجیب قسم کی آواز سنی۔ اصل معاملہ
یہ تھا۔ کہ ایک مادہ خوک اپنے بچوں کو لیئے بیٹھی تھی۔ اُسکے جسم کے اوپر سے
گھوڑا گر پڑا۔ اور اس کے بچے چلانے لگے۔ مادہ خوک کو غصہ آگیا۔ اور وہ
دانت نکال کر مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ بھلے کو شیر جان برادر الیاس بیگ
نے نیزہ اُٹھالیا۔ اور اُس مادہ خوک کو ڈرا دیا۔ ورنہ سخت خرابی ہوتی۔
کولک خاں کا پسر دوڑ کر میرا گھوڑا پکڑ لایا۔ اور کہنے لگا شکر کرو کہ جان بچ گئی
ورنہ خنزیر بڑا ناپاک جانور ہے۔ جس شخص کو یہ جانور مار ڈالے۔ وہ اگلے
جہان میں پانچ سو برس دوزخ میں رہتا ہے۔ اور پھر کہیں اُسکے جسم سے
ناپاکی دور ہوتی ہے۔

رات کے وقت کولک خاں کے چچازاد بھائی کے خیموں میں مقیم ہوئے
میرے رفیق بہت تھک گئے تھے۔ جب دور سے اُنھوں نے دھواں خیموں سے
نکلتا دیکھا تو اُنکے چہروں پر رونق سی آگئی۔ میں اور باقی حاجی اللہ نذر کے
ایک تنگ خیمے میں اُتارے گئے۔ جس کو ہمارے آنے کی پہلے ہی سے خبر تھی۔

یہ بوڑھا ترکمان مفلس اور نادار تھا۔ مگر مہمانوں کے آنے سے باغ باغ ہوگیا اُسکی کل کائنات صرف ایک بکری تھی۔ یہ بھی اُس نے مہمانوں کی خاطر ذبح کردی۔ اللہ اکبر۔ دوسرے دن اُس نے ہمارے لیئے کچھ روٹی جو خود کئی ہفتوں سے اُس نے نہ دیکھی تھی مہیا کی۔ ہمارا میزبان اور اُس کا بڈھا ساتھی ہم کو بڑی رغبت سے کھانا کھاتا دیکھکر بہت خوش ہوئے۔ بلکہ مارے خوشی کے رونے لگے۔ اِس مہمان نواز اللہ بندے نے کوئی حصہ بکری کا اپنے پاس نہ رکھا۔ بکری کے سُم اور سینگ بھی کہ جنکی راکھ اونٹ کے زخم پر لگائی جاتی ہے اُس نے الیاس بیگ کو دیدیئے۔ اِس بکری کا چمڑہ اُس نے مجھے دیدیا۔ پہلے اِس چمڑہ کو نمک ملکر اُس نے صاف کیا۔ پھر دھوپ میں رکھکر اُسے خشک کیا۔ یہ چمڑہ اثنائے سفر میں میرا مشکیزہ بنا رہا۔

دوسرے دن جب ہم روانہ ہوئے تو میرے دوست حاجی بلال نے مجھے کہا کہ میں تنہا ایک محمل میں بیٹھکر آرام طلب نہیں ہونا چاہتا۔ چنانچہ میں نے اپنے مقابل میں اپنا اسباب رکھ لیا۔ چھ گھنٹے نہ گذرے ہونگے کہ سرسبز کھیتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ایک بنجر بیابان جس سے شورے کی تیز بو آتی تھی آیا۔ جب ہم اِس بیابان میں داخل ہوئے تو جوں جوں ہم کوہ سیاہ کے قریب ہوتے جاتے تھے ہمارے پاؤں کے نیچے مٹی چکنی آتی جاتی تھی۔ آخرکار یہانتک نوبت پہنچ گئی کہ ہم کیچڑ میں پھنس گئے۔ ہر لحظہ ہمیں یہی خیال تھا کہ اب اونٹ کا پاؤں پھسلا اور سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہوئیں۔ اِس موقعہ پر میں نے اونٹ سے اُتر کر پیادہ چلنا مناسب سمجھا۔ آخر بڑی دقت کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ تک ایڑیاں رگڑکر ہم پہاڑ پر چڑھے اور کوکاف خان کے خیمہ میں داخل ہوئے۔

جب ہم یہاں پہنچے تو کوکلک خاں فوراً مجھے اپنے خیمہ میں لیگیا۔ اور کہنے لگا کہ جب تک میں نہ کہوں آپ یہیں بیٹھے رہیں۔ مجھے اس سے بڑی حیرت ہوئی پھر میں نے سنا کہ وہ اپنی بیوی پر خفا ہو رہا تھا۔ اور کہتا تھا کہ جب مجھے کسی چیز کی تلاش ہوتی ہے اُسی وقت وہ مجھے نہیں ملتی۔ وہ زنجیریں کہاں ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد زنجیروں کے کھٹکنے کی آواز مجھے سُنائی دی۔ اور طرفہ یہ کہ حاجی بلال بھی بڑی دیر سے میرے پاس نہ آیا تھا۔ یہ حال دیکھ کر میں سخت گھبرایا اور مضطرب ہوا۔ اور سمجھا کہ دال میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔ اس عرصے میں کوکلک خان کئی مرتبہ میرے خیمے میں پژمردہ صورت بنائے ہوئے آیا اور چلا گیا۔ لیکن مجھسے ایک بات تک نہیں کی۔ مگر بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ میرا ڈر بیفائدہ تھا۔ یہ زنجیریں اُن غلاموں کے لیئے آئی تھیں جنکو کوکلک خاں کا بیٹا قید کرکے لایا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد صاحب خانہ نے ہمارے لیئے چاء بنوائی۔ اور جب ہم چاء نوشی سے فارغ ہوئے تو وہ مجھے اُس خیمہ میں لیگیا جو خاص میرے لیئے اُسنے نصب کرایا تھا۔ اور یہ وجہ مجھے مذکورہ بالا خیمے میں بٹھائے رکھنے کی تھی۔

اس بات سے مجھے انکار نہیں ہے کہ مجھے ترکمانوں میں کوئی لحظہ بھی ایسا نہ گذرتا تھا کہ جس وقت یہ ڈر نہ ہو کہ اب یہ بگڑے حالانکہ انمیں بڑے بڑے اور عزیز دوست بھی تھے مجھے کبھی اُنکی طرف سے اطمینان نہیں ہوا۔ اور اگر کوئی بڑی تسلّی میرے دل کو تھی تو وہ میرا لنگڑا پن تھا کیونکہ اس صفت کیوجہ سے میں غلامی کے قابل نہ تھا غرض تھوڑی دیر کے بعد میری طبیعت پھر شگفتہ ہوگئی اور میں اپنے دوستوں کے درمیان چہلنے لگا۔ میرے لطائف سُنکر نہ فقط میرے ہمراہی بلکہ خود ترکمان ہنستے تھے اور کہا کرتے تھے کہ حاجی مرد بڑا زندہ دل ہے۔ اور مسخرے کا کام بہت اچھا دیسکتا ہے ؎

فصل بستم

بیابان

جس سڑک پر ہم اُس وقت جا رہے تھے۔ اُس پر نہ تو کوئی نشان انسان کے پاؤں کا تھا نہ اونٹ کے پاؤں کا۔ دِن کو آفتاب اور رات کو قطبی ستارے ہمارے راہ نما تھے۔ ہم شمال کیطرف جا رہے تھے۔ قطب شمالی کو ترکمان اُسکے بظاہر غیر متحرک ہونے کی وجہ سے تیمور کزک یعنے لوہے کی میخ کہتے ہیں۔ اونٹوں کی مہاریں ایک دوسرے کی دُم سے باندھی ہوئی تھیں اور ساتھ ساتھ اُنکے ساربان تھے۔ اِس بیابان کی زمین بڑی ریتیلی تھی۔ یہ ریت رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ اور آخر ٹھوس اور ہموار زمین آ گئی۔ ہم نے تمام دِن رات میں کل ۴۴ میل سفر کیا۔ بڑی خرابی کی یہ بات تھی کہ بھینسیں بہت آہستہ آہستہ چلتی تھیں اور اُنکی خاطر ہم سب کو بھی آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے پڑتے تھے۔ جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو ہم ٹھہر گئے اور آٹھ بجے تک ہم نے قیام کیا۔ اِس اثناء میں ہم سب نے اپنا کھانا تیار کر لیا۔ اور اونٹ اُس جنگل کے کانٹے اور جھاڑیاں کھانے لگے۔ ہمارے پاس پانی اور آٹے کا ذخیرہ کافی تھا۔ اِس لیئے اُس وقت ہم نے بہت اچھی طرح ناشتہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ کارواں باشی

اس وقت حاجی صالح اور الیاس بیگ سے کچھ گفتگو کر رہے ہے اور بار بار
نظر اٹھا کر میری طرف دیکھتا ہے۔ پہلے تو میں جلدی جلدی قرآن شریف
کی ورق گردانی کرتا رہا۔ پھر اٹھکر اُنکی طرف گیا۔ مجھے اس طرف آتا دیکھکر
الیاس اور حاجی صالح مجھے راہ میں آملے۔ اور کہنے لگے کہ کاروان باشی
کو آپ پر شبہ ہے۔ اور اُس نے ارادہ کرلیا ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ خیوا
میں نہ لیجائے۔ اس کو خان خیوا کے عتاب کا ڈر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک
دفعہ ایک فرنگی کو اپنے ساتھ بطور ایلچی لیگیا تھا۔ اُس کمبخت نے تمام رستہ
کا ایسا صحیح نقشہ اُتار لیا کہ ایک کنواں تک باقی نہ چھوڑا۔ اس بات سے
خان خیوا کو ایسا غصہ آیا کہ اُس نے دو شخصوں کو جنہوں نے اس فرنگی کو
حالات بتائے تھے مروا ڈالا۔ اور میری جان صرف بڑی سعی سفارش سے
بچی۔ پھر مجھے حاجی صالح نے کہا کہ بڑی خوشامد کے بعد وہ اس بات پر راضی
ہوا ہے کہ پہلے تم تلاشی دو تاکہ تسلی ہو جائے۔ کہ تمہارے پاس کوئی سامان
نقشہ کشی یا مشتبہ شئے تو نہیں ہے۔ اور نیز یہ بھی شرط کرتا ہے کہ تم کو ستور
اور پہاڑوں کی کوئی خفیہ یادداشت لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ حاجی
صالح کی گفتگو میں چُپ چاپ سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوا۔ تو میں نے
ایسی شکل بنالی جیسے میں غصہ میں کانپ رہا ہوں اور بلند آواز سے جو
کاروان باشی تک پہنچگئی۔ میں نے کہا حاجی صاحب تم نے مجھے طہران
میں دیکھا ہے اور تم خوب جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ امان وردی کو
کہہ دو کہ دیانتدار آدمی بے نمازوں کی بات کا یقین نہیں کیا کرتے وہ اس
بے نماز افغان کے بہکانے سے مجھ پر شک کرتا ہے۔ اور ایک مسلمان کو
کافر فرنگی بتاتا ہے۔ اگر پھر دوبارہ اُس نے مجھے کافر کہا تو میں خیوا میں پہنچکر

بتا دوں گا کہ میں کون ہوں" یہ آخری الفاظ میں نے اس قدر بلند آواز سے کہے کہ تمام اہل قافلہ نے سُنے۔ اور میرے رفیق درویش اس قدر ناراض ہوئے کہ اگر میں اُنکو منع نہ کرتا تو وہ ضرور اس افیونی افغان کی جو میری مخالفت پر کمربستہ تھا تکا بوٹی کر ڈالتے۔ کاروان باشی اس گفتگو سے سب سے زیادہ بدمزہ ہوا۔ اور جو شخص اُسکے پاس جاکر یہ پوچھتا تھا کہ کیوں صاحب کیا معاملہ ہے تو وہ یہی کہتا تھا کہ خدا معلوم کاروان باشی بُرا آدمی نہ تھا۔ دل کا نرم اور بڑا سمجھدار تھا۔ مگر ٹھیٹ مشرقی باشندوں کی طرح ذرا سی بات پر اُسکے دل میں شک پیدا ہو جاتا تھا۔ اُسکو خراب اسی افغان نے کیا تھا جس کا نام میر محمد تھا۔ اور جو قندہار سے سر ہنری رالنسن کے زمانہ میں بھاگ کر آیا تھا۔ میر محمد کو انگریزوں سے سخت عداوت تھی۔ اور مجھے بھی انگریز سمجھکر میری تخریب کے درپے تھا۔ میری گفتگو سے اور نیز اس وجہ سے کہ کہ یہ کاروان باشی گومش تیپ میں مجھ سے کئی شرعی مسائل حل کر چکا تھا اُس وقت تو یہ بات ٹل گئی۔ لیکن میرے دلمیں خدشہ پیدا ہو گیا۔ کہ ضرور لوگوں کو مجھ پر شبہ ہے۔ اور اس خدشہ کے باعث یادداشت رکھنی تو درکنار میں مختلف مقاموں کے نام بھی گول مول طرز پر اُنسے دریافت کرتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر ہم نے اپنا سفر شروع کیا۔ دو گھنٹہ کے بعد ہمارا قافلہ چند ٹیلوں کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔ اور دو ترکمان اونٹوں سے اُتر کر چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کو دیکھتے ہوئے اِدھر اُدھر پھرنے لگے جب اس قیام کا سبب دریافت کیا تو مجھے میرے رفقا نے بتایا کہ عید محمد جو ہمارے رفقا میں سے تھا۔ اپنے بھائی کی قبر تلاش کر رہا ہے۔ اس کا بھائی

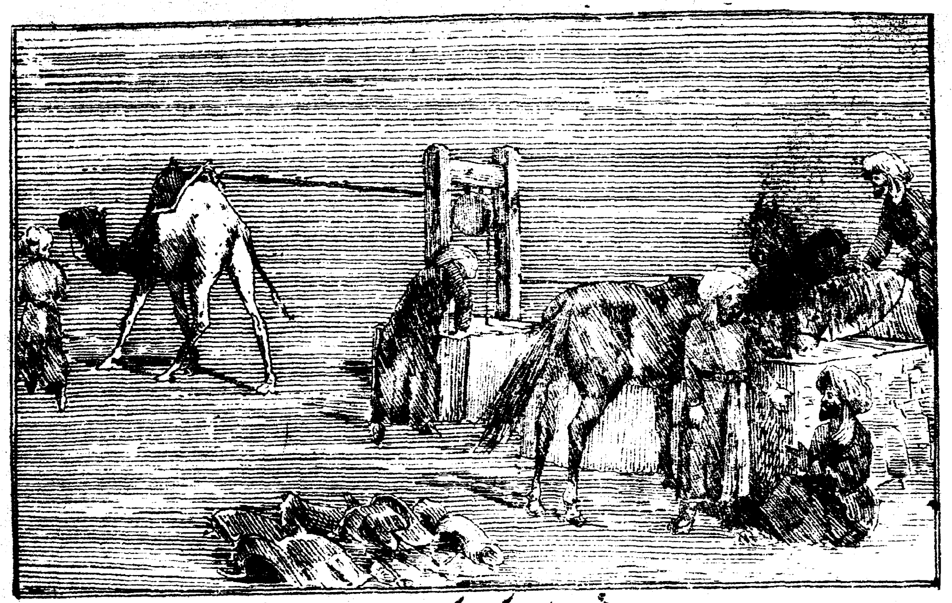

دشت میں ایک کنواں

بدمعاشوں کے ہاتھ سے بڑی بہادری سے مقابلہ کرکے اس جگہ قتل ہوا تھا
عید محمد اب تابوت لیکر آیا ہے۔ اور اُسکی ہڈیاں خیوا کو لیجانا چاہتا ہے
دو بجے دن کے بڑی تلاش کے بعد قبر ملگئی اور کھودی گئی۔ قرآن خوانی
کے بعد جس میں مَیں نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا نیم بوسیدہ لاش قبر سے
نکالی گئی۔ اور کفن میں لپیٹ کر تابوت میں رکھدی گئی۔ رسوم جنازہ کے
بعد عید محمد نے اُس مقام پر روٹی پکائی۔ اور ہم سب میں تقسیم کی۔ کھانا
کھا کر ہم پھر جانب شمال روانہ ہوئے۔

کارواں باشی نے حکم دیا کہ چونکہ ہم کو اس جگہ بہت دیر لگی ہے اس
وقت کو پورا کرو۔ اور تمام رات سفر کرو۔ موسم خوشگوار تھا۔ میں کمبل لپیٹکر
اونٹ پر بیٹھ گیا۔ اور ستاروں کی طرف دیکھنے لگا۔ جو ہمیشہ بیابان میں
آسمان پر بہت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ ہرچند میں نے چاہا کہ ابھی جاگوں
مگر نیند بُری بلا ہے جو جھٹ مجھ پر غالب آگئی۔ ابھی مجھے سوئے ایک گھنٹہ
نہ ہوا تھا کہ میرے ہمراہی چلانے لگے۔ حاجی صاحب اُٹھو۔ اور قبلہ نما لیکر
دیکھو۔ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ میں نے فوراً اُٹھکر چقماق سے آگ جھاڑی
اور اُسکی روشنی میں قبلہ نما دیکھکر معلوم کیا کہ بجائے شمال کی طرف جانے
کے ہم جانب مشرق جا رہے ہیں۔ یہ سُنکر کارواں باشی ڈر گیا۔ مشرق
کی طرف وہ خوفناک دلدلیں تھیں جن سے آجتک کوئی نہیں بچا۔ بارے
شکر ہے کہ وقت پر ہم خبردار ہوگئے۔ اور ہم نے ارادہ کرلیا کہ جب تک
دن نہ چڑھے یہیں قیام رہے۔ صبح کو آدھ گھنٹہ کی جستجو کے بعد ہمیں سیدھا
راستہ مل گیا۔ جو شب گذشتہ کو اسکے باعث ہم بھول گئے تھے۔ باوجود
اس تاخیر کے ہم تے یہہ منزل ٹھیک وقت پر طے کی اور قیام گاہ پر

پہنچکر اونٹوں کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔

۱۵ مئی کو ہم ایسے مقام پر پہونچے۔ جہاں جابجا راہ میں نالے آتے تھے۔ اس راستے میں بیچارے اونٹوں کو جن کی مہاریں ایک دوسرے کی دُم سے بندھی ہوئی تھیں۔ بہت تکلیف ہوئی۔ اکثر اُنکو سخت جھٹکے لگتے تھے۔ اور ہمیں غریب اونٹوں کو آرام دینے کے لئے ریگستان میں بار بار نیچے اُترنا پڑتا تھا۔

یہاں سے آگے تین رستے ہو جاتے تھے۔ اور ابھی تک ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ کارواں باشی کونسے رستہ سے گذریگا۔ چونکہ راہ میں ہر وقت لٹیروں کا ڈر ہوتا ہے۔ اس لئے مصلحت یہی سمجھی جاتی ہے کہ کسی کو نہ بتایا جاوے کہ فلاں راستے سے قافلہ جائے گا۔ ہماری خوش قسمتی سے راستہ میں صرف دو مرتبہ اونٹوں کی مُہار ٹوٹی۔ جس وقت یہ رسی ٹوٹ جاتی ہے اُس وقت کچھ اونٹ قطار سے پیچھے رہجاتے ہیں۔ اور تاریکی میں اُس کا پھر قطار کے ساتھ ملانا مشکل ہوتا ہے۔ اس موقعہ پر جو آدمی گم شدہ اونٹوں کی تلاش میں جاتا ہے وہ بلند آواز سے شور مچاتا رہتا ہے۔ دوسرا اُس کا جواب قافلہ میں سے دیتا رہتا ہے۔ اگر باد مخالف کے چلنے کی وجہ سے یہ آواز ڈھونڈنے والے تک نہ پہونچے تو وہ آوارہ ہو کر مر جاتا ہے۔ ۱۶ مئی کو تیسرے پہر ہم شمال و مشرق کی طرف سلسلہ کوہ کرندگ کے قریب پہونچے۔ اتیراک میں ہمیں کہا گیا تھا کہ یہاں یوموت ترکمانوں کے ڈیرے ہیں۔ تاہم ہمیں شبہ تھا۔ اس لئے ہم نے ایک بہادر ترکمان کو تحقیقات کے لئے بھیجا۔ اور جب معلوم ہوا کہ وہ دوست ہیں تو ہم تمام دن اُنکے پاس رہے۔

کرندگ پہاڑ کے قریب ہم نے چند کھنڈرات دیکھے۔ ایکی نسبت

یہ روایت مشہور ہے کہ خدا تعالیٰ نے ترکمانوں کی خاطر پہلے یہاں کعبہ بنانا چاہا تھا۔ لیکن گاکلن نے جو ایک لنگڑا دیو تھا اُسکو گرا دیا۔ اس پر خدا نے کعبہ مکہ میں جا بنایا۔ اسی وجہ سے ترکمان گاکلن کی اولاد سے سخت عداوت رکھتے ہیں۔

خانہ بدوش جو یہاں رہتے تھے قافلہ کی آمد آمد سُنکر وہاں دوڑے آئے۔ شام کے وقت جبکہ ہم چلنے کو تیار تھے تو ایک گاڈمیش نے بچہ دیا۔ اور کاروان باشی بہت خوش ہوا۔ چونکہ یہ بچہ کمزور تھا کاروان باشی نے ہمیں کہا کہ آپ میں سے ایک شخص اُسکو اپنی جگہ دیدے حاجی بلال جو میرے مقابل بیٹھا ہوا تھا یہ سُنکر اُتر بیٹھا۔ اور کہنے لگا۔ حاجی رشید کا پاؤں کمزور ہے۔ میں اسکی خاطر اپنی جگہ خالی کرتا ہوں غرض اُسکی جگہ میرے مقابل میں بھینس کا بچہ رکھدیا گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ حاجی بلال مجھسے اچھا رہا۔ اس بچے سے ایسی سخت بدبو آ رہی تھی۔ کہ مجھے غشیان کی نوبت پہنچگئی۔ یہ رات میں نے بڑی مصیبت سے کاٹی۔ صبح آفتاب کی روشنی میں یہ بدبو اور بھی زیادہ ہوگئی۔ مگر یہ بلا جلد دفع ہوگئی۔ کیونکہ تیسرے دن بھینس کا بچہ مرگیا۔

جس مقام سے ہم ۱۰ مئی کو روانہ ہوئے وہاں سے حساب لگایا گیا تو بلقان کلاں دو یوم اور خیرا بارہ یوم کے سفر کے فاصلہ پر تھا۔ ہمارے راہ نما نے ہمیں یقین دلایا کہ آگے چلکر ہمیں بارش کا پانی ملجائے گا۔ اسوقت تک جس قسم کے پانی سے ہم نے اپنے مشکیزے بھرے ہوئے تھے اُسمیں نصف کے قریب کیچڑ تھا۔ اور ایک قسم کی بدبو بھی آتی تھی۔ یہ پانی ہم نے گردنک کے زرد بوسیدہ نالابوں سے بھرا تھا۔ اس کا ذائقہ بھی خراب تھا ہم اس کو بڑی

کفایت سے خرچ کرتے تھے۔ کیونکہ بلقان سے پہلے ہمیں کہیں پانی ملنے کی امید نہ تھی۔ یہاں سے ہمارا سفر باقاعدہ شروع ہوا۔ ہم ہر روز ہنگام سفر میں تین بار ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹوں کا قیام کرتے تھے۔ پہلا قیام قبل از طلوع آفتاب ہوتا تھا۔ اس قیام میں ہم تمام دن کا کھانا پکا کر تیار کر لیتے تھے۔ دوسرا قیام دوپہر کے وقت اس لئے ہوتا تھا کہ آدمی اور جانور آرام کر سکیں اور تیسرا قبل از غروب آفتاب ہوتا تھا۔ اس قیام میں ہم کچھ کھا پی لیتے تھے۔ یہ سرزمین تمازت آفتاب سے جلی ہوئی تھی۔ اور اس پر کہیں کہیں سوائے خشک گھاس کے اور کوئی سبزی دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس بیابان کے سفر میں مسافر کو جب کئی کئی دن تک آبادی کی صورت نظر نہیں آتی تو جو اسکے دل پر گذرتی ہے وہی بہتر جان سکتا ہے۔

دوسرے دن دوپہر کے قریب ہم کوہ بلقان خورد کے پاس پہنچے۔ ترکمانوں نے میرے روبرو اس پہاڑ کی وسعت اور خوشنمائی کی بہت تعریف کی۔ اور کہا کہ اس میں معدنیات کثرت سے ہیں۔ کارواں باشی جو ہر وقت بیدار رہتا تھا۔ شام کے وقت بد خوابی سے مجبور ہو کر سو گیا اور اور قافلہ کو اس نے ایک اور شخص کے سپرد کر دیا۔ اس جگہ بہت سی شورہ کی دلدلیں تھیں جن پر شور سفید اس طرح جما ہوا تھا کہ یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے نیچے دلدل ہے۔ اس قسم کی ایک دلدل میں کارواں باشی کا قائم مقام ہمیں لے گیا۔ یہاں اونٹوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور میں نے اتر کر دیکھا کہ میرے قدموں کے نیچے زمین مثل گہوارہ کے ہل رہی ہے۔ اور پاؤں دھنسا جاتا ہے۔ یہ حال دیکھکر تمام اہل قافلہ ڈر گئے۔ اور کارواں باشی نے آواز دی کہ جہاں جو ہے وہیں ٹھہرا رہے۔ دن کے وقت یہاں سے نکلنے کی سبیل

گورخروں کی فوج

کی جائے گی تین گھنٹہ تک ہم اِس دلدل میں کہ جہاں سمجی کی بو ہمارے دماغ پراگندہ کر رہی تھی۔ ہم چپ چاپ کھڑے رہے۔ آخر صبح صادق نمودار ہوئی۔ اور بڑی تکلیف کے بعد ہم نے اپنے آپ کو اُس دلدل سے نکالا۔ اگر دس پندرہ قدم ہم اور آگے بڑھ جاتے تو اگر سب نہیں تو ایک حصّہ قافلے کا ضرور برباد جاتا۔

۲۰ مئی کو ہم بلقان خورد پر جو جنوب مشرق سے شمال مغرب تک پھیلا ہوا ہے جا پہنچے۔ اِس مقام پر کارواں باشی نے کہا کہ اصل جنگل تو اب شروع ہوا ہے جب یہاں سے ہم روانہ ہوئے تو دریائے جیحون کا قدیم گذرگاہ ہمیں طے کرنا پڑا۔ اور رفتہ رفتہ **کوہ بلقان** ہماری نظروں سے غائب ہونے لگا۔ اِس جنگل کو دیکھکر قدرت خدا یاد آتی ہے۔ اَب تک میرا یہ خیال تھا کہ بھلا جنگل میں کیا خوبصورتی ہو سکتی ہے۔ مگر جس وقت میں نے اُس جنگل کو دیکھا تو میری عقل دنگ رہ گئی۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ میں غلطی پر تھا۔

مینی سیری کے قریب ۲۲ مئی کو ہم نے خیمہ لگایا۔ اِس جگہ کسی زمانہ میں سات کنوئیں تھے۔ اَب اکثر اُنمیں سے خشک ہو گئے تھے اور جو ایک دو میں پانی تھا وہ تعفن کے باعث پینے کے قابل نہ تھا۔ کارواں باشی نے ہمیں تسلی دی کہ شام کے قریب ہمیں بارش کا پانی ملجائے گا۔ مگر میں نے اِس گدلے پانی کو جو مشکیزہ میں تھا۔ اور اسمیں آدھی دلدل کی مٹی تھی نہ پھینکا۔ اور کہا کہ دیکھا جائے گا۔ اِس جگہ ہم نے مویشیوں کو پانی پلایا۔ اور چند ساعت غروب سے بڑی سرگرمی سے پانی کی طرف بڑھنے میں جانوروں کا مقابلہ کیا کچھ دیر آرام کر کے ہم پھر روانہ ہوئے۔ راہ میں ہمیں دو محمل ایک ریت کے تودے پر پڑے ہوئے ملے میرے رفقا نے کہا کہ یہ اُن لوگوں کے ہیں جو یہاں رہ گئی ہیں

ترکمان اُن چیزوں کی بڑی عزت کرتے ہیں جو کبھی انسان کے قبضہ میں رہچکی ہوں۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ ترکمان بھی عجیب لوگ ہیں کہ لوگوں کو تو غلام بناکر بیچڈالتے ہیں۔ اور اُنکے محلوں کی اس قدر عزت کرتے ہیں۔

شام کے وقت کاروان باشی اور دو ترکمانوں کے ساتھ ہم ادہر اُدہر پانی کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ دفعتاً ہمنے ریت پر انسانی نقش قدم دیکھے۔ ہم ان قدموں کو دیکھتے بھالتے ایک غار میں پہنچے۔ اور جب ہم اُسمیں کچھہ تامل کے بعد داخل ہوئے تو ہم نے ایک انسان بالکل وحشیوں کی صورت کا وہاں دیکھا۔ اسکی ڈاڑہی اور سر کے بال بڑہے ہوئے تھے۔ اُسکے ناخن بڑے بڑے ہوگئے تھے۔ اور اُس نے اپنے بدن کو پہاڑی بکرے کے چمڑے سے ڈہانپا ہوا تھا۔ یہ ہمیں دیکھکر گھبرا گیا۔ اور پھر نیزہ لیکر ہماری طرف جھپٹا۔ میں تو دو چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن میرا رفیق بڑی متانت کے ساتھ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ اور نیزے کو پکڑکر آہستہ سے یہ کہا "امان بول" (السلام علیکم) اور وہاں سے چلا آیا۔ مجھے کاروان باشی سے بہت سوالات کرنے کی جرات نہ تھی۔ اس لیئے میں نے ڈرتے ڈرتے اُس سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ قانلیدر (خون آلودہ) ہے۔ اُس نے کوئی خون کیا ہے اس لیئے جان کے خوف سے اب جنگل میں رہتا ہے۔ ہم نے ہرچند پانی کی تلاش کی مگر کہیں ایک قطرہ پانی بھی اُسکو نہ ملا۔ اس موقعہ پر وہ گدلا پانی جو میرے مشکیزہ میں تھا کام آیا۔ مینے اُسکو گرم کیا۔ کیونکہ مینے سُنا تھا کہ گرم کرنے سے پانی کی تلخی جاتی رہتی ہے۔ اور اسمیں روٹی ڈبو کر کھائی۔ میں بمقابلہ اپنے رفیقوں کے تندرست تھا۔ اُنہوں نے چونکہ آب شور پیا تھا۔ بیمار ہوگئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ بعضے ترکمانوں کے پاس بچا کھچا آب شیریں ہے جو اُنہوں نے چھپایا ہوا ہے۔

کو بھلا ہے آب و علف جنگل میں کون کھیکر پانی دیتا ہے - اُس وقت میرا حلق
خشک ہو گیا - اور روٹی کے ایک دو ٹکڑوں کا نگلنا بھی مجھے دشوار ہو گیا
میں بیتاب ہو کر زمین پر گر پڑا - اتنے میں میرے کان میں پانی کی آواز
آئی - اور میں نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ تمام اہل قافلہ کارواں باشی کی طرف
جا رہے ہیں - چند ساتھیوں نے مجھے بھی اشارہ کیا کہ اپنا مشکیزہ لے کر چلو -
میں پانی کا نام سُن کر اُٹھا - اور اُس طرف دوڑا - اور میں نے دیکھا کہ وہ قریب
دو دو گلاس کے میٹھا پانی اہل قافلہ میں تقسیم کر رہے ہے - اُس بہادر ترکمان
نے ہمیں بتلایا کہ سالہا سال سے اُسکی عادت ہے کہ وہ پانی خفیہ جگہوں میں
چھپا رکھتا ہے - تاکہ وقت ضرورت وہ پیاسوں کے کام آئے - ترکمانوں میں
ایک ضرب المثل ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ "پیاسے کو ایک قطرہ پانی کا جنگل
میں دینا دینے والے کے سو سال کے گناہوں کو یک قلم دھو ڈالتا ہے" اس بات
کو ترکمان بڑا بھاری ثواب سمجھتے ہیں - جسقدر مُلکی اس ہمدردی کی تعریف
مشکل ہے اُسیقدر اِس لطف کا اندازہ بھی محال ہے - جو مسافروں کو اس پانی
کے پینے سے حاصل ہوتا ہے - میری بھوک زائل ہو چکی تھی - اِس لئے میں
بغیر کھائے پیئے تین دن تک رہ سکتا تھا - جب میں نے پانی پیا تو مجھے ہوش
آیا - میری لکڑیاں بھی ختم ہو گئی تھیں - اور مجھے یقین تھا کہ اُپلوں سے کام
چل جائیگا - مگر وہ بھی میرے پاس نہ رہے - آخر میں نے جلدی میں جنگل سے
کچھ لکڑیاں چُنیں - مگر چنتے چنتے شام ہو گئی - اور جب شام کو میں نے آگ
جلائی تو کارواں باشی نے کہا کہ کیا تم دھواں کرکے ہمیں قزاقوں کے حوالہ
کرنا چاہتے ہو؟ یہ سُن کر میں نے آگ بجھا دی - اور کچی روٹی اُٹھا کر باندھ لی
۲۲ مئی کو سورج کی کرنوں سے ہمارے سر کی کھوپریاں اور ہاتھ پاؤں جلنے

لگے۔ تمازت آفتاب اس قدر تھی کہ ان جفاکش لوگوں نے بھی جن کو ننگے پاؤں چلنے کی عادت تھی۔ پاؤں پر چمڑے لپیٹ لیئے۔ اس زمانے سے دس سال کے بعد روسی فوج زیر کمان کرنیل مارکساف یہاں سے گزری۔ اور مجھے اُنسے معلوم ہوا کہ ماہ مئی کی گرمی میں یہاں تھرمامیٹر کا پارہ (۱۵۲) درجہ پر پہونچ جاتا ہے! اس گرمی میں اُس پانی کا اثر جو میں نے کل پیا تھا بہت جلد جاتا رہا۔ اور پھر شدت پیاس سے میری حالت غیر ہوگئی۔ یہاں ہمیں کاروان باشی نے آگاہ کیا کہ ہم قہرمان عطا کے قریب آگئے ہیں۔ یہ ایک مقدس مقام تھا اس لیئے ہم تمام پاپیادہ ہوکے اور ۲ میل راستہ طے کرکے اُس ولی کی قبر پر فاتحہ کے لیئے گئے۔ ناظرین میری حالت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ پیاسا اور گرمی سے بیتاب میں بھی اوروں کے ساتھ اُس قبر پر گیا۔ یہاں اہل قافلہ خشک گلوں کو پھاڑ پھاڑ کر بلند آواز سے آیات قرآن پڑھنے لگے۔ میں نے دلمیں کہا کہ اے بیرحم ولی تو ایسے بے آب وعلف مقام میں کیوں دفن ہوا۔ تیرے دلمیں یہ خیال نہ آیا کہ بیچارے مسافروں کا کیا حال ہوگا۔ یہ قبر تیس فیٹ کے قریب لمبی تھی۔ اور اُس پر سینڈھے کے سینگ جو وسط ایشیا میں بزرگی کی علامت میں بچھے ہوئے تھے۔ میں اُس قبر کے پاس بیتاب ہوکر بیٹھ گیا۔ پھر کارواں باشی نے ہمارے روبرو بیان کیا کہ یہہ ولی جو یہاں دفن ہے ایک دیو تھا۔ اور اُسکا قد اتنا لمبا تھا جتنی اُسکی قبر ہے شیطان چاہتے تھے کہ تمام کنوئیں پتھروں سے بھردیں۔ مگر جب تک یہ زندہ رہا چاہات کو اُن شیاطین کی گزند سے بچاتا رہا۔ اُس ولی کی قبر کے ارد گرد بہت سی قبریں اُن لوگوں کی تھیں جو یا تو لٹیروں کے ہاتھ سے یہاں قتل ہوئے تھے یا پہلے کے پیاسے یہاں مر گئے تھے۔

کاروان باشی کی زبان سے یہ کلمہ سنکر کہ یہ دلی محافظ جاہات تحلیہ دل کو خوشی حاصل ہوئی۔ اور مجھے اُمید ہوئی کہ ضرور اس قبر کے پاس پانی ہوگا۔ میں اُس طرف گیا۔ جہاں پانی کا ہونا بیان کیا جاتا تھا۔ وہاں جاکر مجھے ایک چشمہ نظر آیا۔ جسکا پانی گدلا سا تھا۔ جب اُس پانی کو پینے ہاتھ میں لئے۔ تو بہ برف کی طرح سرد تھا۔ مگر جو ہیں میں اسکو مُنہ کے قریب لیگیا تو بغیر پئے پھینکنا پڑا۔ یہ نہایت کڑوا اور خراب تھا یہ حال دیکھکر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اور میرے اوسان خطا ہو گئے۔

خدا جانے ہماری کیا حالت ہوتی۔ مگر خوش قسمتی سے رات کو طوفان آیا۔ اور بارش ہوئی۔ اور صُبح سے پہلے ہم اُس ریتلے جنگل کے خاتمہ کے قریب پہنچگئے۔ اُس کے طے کرنے میں تین روز کا عرصہ صرف ہوا۔ اِس مقام پر کاروان باشی نے گدہوں اور غزالوں کے سموں کے نشان دیکھے۔ اور گو وہ سمجھ گیا کہ پانی قریب ہے مگر مُنہ سے وہ کچھ نہ بولا۔ صرف یہی کہے گیا کہ بڑھے چلو۔ تھوڑی دیر کے بعد اُسکی دوربین آنکھوں نے دور سے پانی دیکھ لیا۔ اُس وقت ہر ایک کی زبان پر "صُو صُو" یعنے پانی۔ پانی۔ کی آواز جاری تھی۔ دوپہر کے قریب ہم اُن گڑہوں کے قریب پہنچگئے۔ جو بارش کے آب زلال سے بھرے ہوئے تھے سب سے پہلے میں وہاں پہنچا۔ اور میں نے پانی نیچے پیا۔ پہلے اپنا مشکیزہ اور برتن پانی سے بھر لیئے۔ تاکہ اور مسافر ہاتھ ڈالکر اُسے گدلا نہ کردیں۔ پاؤ گھنٹہ کے بعد ہم سبنے ملکر خوشی خوشی کھانا کھایا۔

اِس جگہ سے خیوا تک راہ میں کسی بات کی تکلیف نہ ہوئی ضرورت سے بڑھکر ہمیں راہ میں میٹھا پانی ملتا گیا۔ گذشتہ تکلیف کے مقابلہ میں یہ سفر جو آگے ہمیں خیوا تک پیش آیا ایک سیر معلوم ہوتا

تھا۔ شام کے وقت ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ہر طرف موسم بہار کا لطف آ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی جھیلوں کے ارد گرد سبزہ زار ایسے خوشنما معلوم ہوتے تھے جیسے تصویر کے گرد چوکھٹا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کسی کسی وقت تو مجھے بھی گمان ہوتا تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں میرے رفیق ترکمانوں نے مجھے کہا کہ یہ حاجیوں کے قدم کی برکت ہے کہ اس قدر وافر پانی ہمیں ملگیا ہے ہم نے اپنے مشکیزے دوبارہ میٹھے پانی سے بھر لیئے اور خوشی خوشی آگے روانہ ہوئے ✦

فصل بست و یکم

خیوا

شام کے قریب ہم اِس گھاٹی میں پہنچے جس کے پرے قفلان کبیر نامی میدان واقعہ ہے۔ اِس کو انگریزی زبان میں ٹائیگر لینڈ یعنی شیروں کا میدان کہتے ہیں۔ یہ بلند میدان سو فیٹ کی چڑھائی پر واقع ہے اسلیئے کیا انسان اور کیا حیوان سب تھک گئے۔ ترکمان کہتے ہیں کہ یہ میدان دریائے آکسس[1] کی دو شاخوں کے درمیان ایک جزیرہ تھا۔ اِسمیں شک نہیں کہ سرسبزی شادابی اور مختلف قسم کے حیوانات کے لحاظ سے جو یہاں دیکھے جاتے ہیں یہ میدان گرد و نواح کے میدانوں سے بہت مختلف ہے راہ میں کہیں کہیں شاذ و نادر ہرن یا گدھے نظر آ جاتے تھے یہاں ہم نے اُنکے گلّے چرتے دیکھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم نے اپنے سامنے ایک بڑا گرد و غبار دیکھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑا لشکر سواروں کا ہماری طرف بڑھا آ رہا ہے۔ یہ حال دیکھکر ہم سب گھبرا گئے کاروان باشی اور ترکمانوں نے ہتھیار سنبھال لیئے۔ جب دامن گرد کو مقراض باد نے چاک کیا تو پچاس قدم

[1] یعنی آمو دریا جو پامیر سے پیدا ہو کر افغانستان اور ترکستان کے درمیان سے بہتا ہوا شمالی ترکستان سے گذر کر بحیرہ ارال میں جا گرتا ہے۔

کے فاصلے پر ہم نے دیکھا کہ قریباً پانچ چھ سو جنگلی گدہے دوڑتے ہوئے ہماری طرف آرہے ہیں جو چند سیکنڈ تک تو ہماری طرف غور سے دیکھتے رہے۔ پھر بگولہ کی طرح مغرب کی طرف بھاگ گئے۔

۲۸ مئی کو ہم شور گول[۱] کے قریب پہنچے۔ یہ ایک نمکین جھیل قفلان کبیر کے میدان میں ہے۔ اِس جگہ ہم نے وضو کیا۔ اُس وقت تک قلت آب تیمم پر گذارہ تھا۔ اِس موقعہ پر میرے رفقا نے اپنے بقچے کھولے اور ایک ایک زائد کرتا جو سب کے پاس تھا نکالا۔ سب کے پاس زائد کرتا تھا۔ مگر میرے پاس نہ تھا۔ حاجی بلال نے مجھے ایک کرتا عاریتاً دینا چاہا مگر میں نے لینا منظور نہ کیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہی غریبی میری محافظ اور رفیق ہے اُس وقت میرے چہرے پر بلا مبالغہ ایک ایک انچہ گرد جمی ہوئی تھی۔ میں نے کئی بار جنگل میں اِس گرد کو دھونے کا ارادہ کیا۔ مگر پھر اُسے یہیں جما رہنے دیا۔ اور دھوپ کے بچاؤ کے لیئے اِس گرد کو اپنے چہرے کا بہت اچھا غلاف سمجھا۔ ایک میرے ہی چہرے کا یہہ حال نہ تھا۔ بلکہ تیمم کے باعث جملہ اہل قافلہ کے چہرے بدلے ہوئے تھے۔ اور سب کی قلب ماہئیت ہوگئی تھی۔ اِس وقت تمام حاجی نہا رہے اور کپڑے بدل رہے تھے اور میں بیچارہ کھڑا اُنکا مُنہ دیکھ رہا تھا۔ اُس وقت وہ نواب معلوم ہوتے تھے اور میں گدا نظر آتا تھا۔ ان میں چند رفقا نے مجھے عاریتاً کپڑے دینے چاہے مگر میں نے شکریہ کے ساتھ اِس مہربانی کو منظور نہ کیا۔ اور کہا کہ میں کپڑے اُس وقت بدلوں گا جب خان خیوا مجھے نئے کپڑے دیگا۔

چار دن تک ہم اِس میدان میں جد وجہد کرتے رہے۔ پانچویں دن

[۱] گول ترکی زبان میں جھیل کو کہتے ہیں اور شور گول سے نمکین جھیل مراد ہے ۱۲

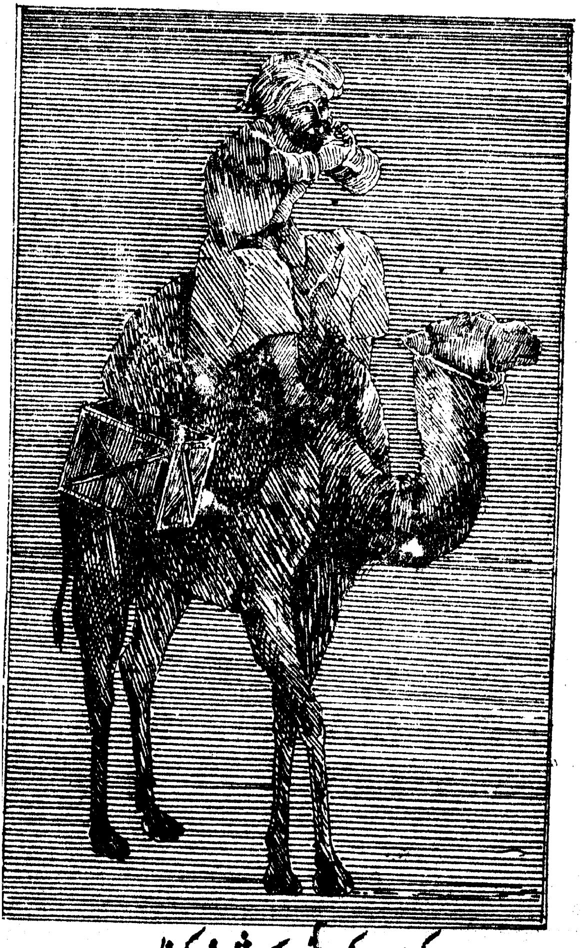

کمپاس کے لئے روشنی کرنا

کے فاصلے پر ہم نے دیکھا کہ قریباً پانچ چھ سو جنگلی گدہے دوڑتے ہوئے ہماری طرف آرہے ہیں جو چند سیکنڈ تک تو ہماری طرف غور سے دیکھتے رہے۔ پھر بگولہ کی طرح مغرب کی طرف بھاگ گئے۔

۲۸ مئی کو ہم شور گول کے قریب پہنچے۔ یہ ایک نمکین جھیل قفلان کمیر کے میدان میں ہے۔ اِس جگہ ہم نے وضو کیا۔ اُس وقت تک قلت آب تیمم پر گذارہ تھا۔ اِس موقعہ پر میرے رفقانے اپنے بقچے کھولے اور ایک ایک زائد کرتا جو سبکے پاس تھا نکالا۔ سب کے پاس زائد کرتا تھا۔ مگر میرے پاس نہ تھا۔ حاجی بلال نے مجھے ایک کرتا عاریتاً دینا چاہا مگر میں نے لینا منظور نہ کیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہی غریبی میری محافظ اور رفیق ہے اُس وقت میرے چہرے پر بلا مبالغہ ایک ایک انچہ گرد جمی ہوئی تھی۔ میں نے کئی بار جنگل میں اِس گرد کو دہونے کا ارادہ کیا۔ مگر پھر اُسے یہیں جما رہنے دیا۔ اور دہوپ کے بچاؤ کے لیئے اِس گرد کو اپنے چہرے کا بہت اچھا غلاف سمجھا۔ ایک میرے ہی چہرے کا یہہ حال نہ تھا۔ بلکہ تیمم کے باعث جملہ اہل قافلہ کے چہرے بدلے ہوئے تھے۔ اور سب کی قلب ماہئیت ہوگئی تھی۔ اس وقت تمام حاجی نہا رہے اور کپڑے بدل رہے تھے اور میں بیچارہ کھڑا اُنکا مُنہ دیکھ رہا تھا۔ اُس وقت وہ تو اب معلوم ہوتے تھے اور میں گدا نظر آتا تھا۔ ان میں چند رفقانے مجھے عاریتاً کپڑے دینے چاہے مگر میں نے شکریہ کے ساتھ اِس مہربانی کو منظور نہ کیا۔ اور کہا کہ میں کپڑے اُس وقت بدلونگا جب خان خیوا مجھے نئے کپڑے دیگا۔

چار دن تک ہم اِس میدان میں جد و جہد کرتے رہے۔ پانچویں دن

سلہ گول ترکی زبان میں جھیل کو کہتے ہیں اور شور گول سے نمکین جھیل مراد ہے ۱۲

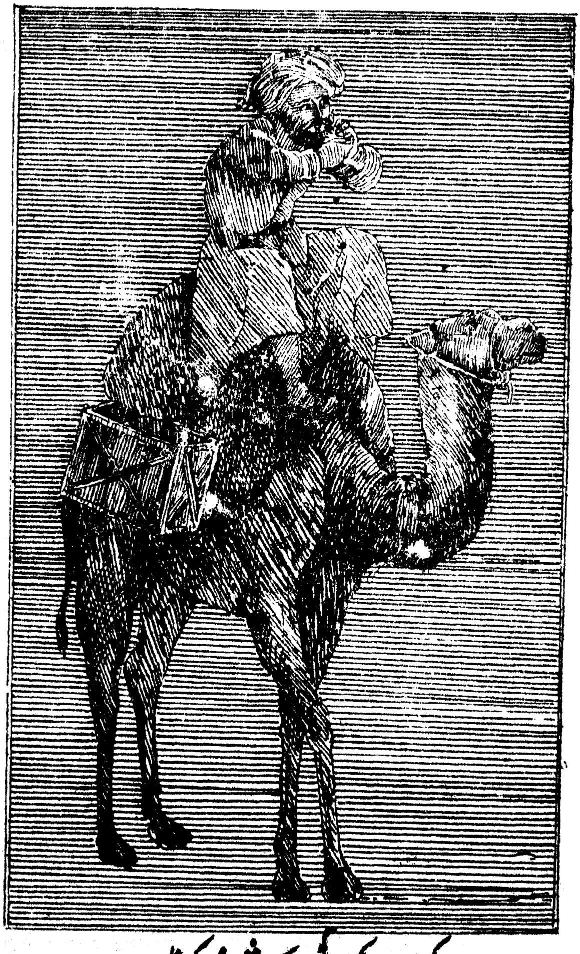

کمپاس کے لئے روشنی کرنا

بوقت صبح ہم ایسے مقام پر پہنچے جہاں ہمیں بیشمار خیمے چپ و راست نظر آئے
ان خیموں کے رہنے والے ہمیں دیکھکر دوڑے آئے اور "امان گلدینز" (خوش
آمدید) کے نعرے مارنے لگے۔ ایمن الیاس بیگ کے کئی دوست تھے۔ وہ
فوراً انکے پاس سے عید قربان کے تحفے (یہ لوگ آجکل اس عید کا جشن منا رہے
تھے) گرما گرم روٹیاں۔ گوشت اور قمص (یہ ایک قسم کی خزنی ہوتی ہے جو
گھوڑی کے دودھ کی دہی سے بنائی جاتی ہے) لے آئے اور سب میں تقسیم کیا
پھر ان خانہ بدوشوں نے جو کسی قدر فاصلے پر رہتے تھے جوق در جوق
ہم سے آکر مصافحے کئے اور اونٹ گھوڑے اور بھیڑیں ذبح کیں اور ہماری
دعوت دھوم دھام سے کی۔

۳۰ مئی کی شام کو ہم چائے تیار کر رہے تھے کہ دفعتاً ہمارے اونٹ
چلانے لگے۔ اور ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ ہم اس بارہ میں تحقیق نہ کرنے پائے
تھے کہ اتنے میں پانچ سوار سرپٹ گھوڑے دوڑاتے اور ہماری طرف آتے
دکھائی دیئے۔ ہمنے بھی اپنے ہتھیار سنبھال لئے۔ مگر پیچھے معلوم ہوا کہ وہ دشمن
نہیں ہیں بلکہ اس قافلہ کے ساتھ سفر کریں گے۔

دوسرے دن صبح کے وقت ہم ازبکوں کے گاؤں میں پہنچے جو ایک ب
(نہر سفید) کے متعلق ہے۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ ازبک میری نظر سے گذرے۔
ازبک ہم سے بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ اس مقام سے گومش تپہ اور
خیوا کے درمیان کا حصہ بالکل پیچھے رہجاتا ہے۔ یہاں بھی ہم نے جابجا
فاتحہ خوانی کی۔ اور کافی ذخیرہ خوراک کا جمع کیا۔ ہم نے حسب معمول کل
گھروں کی سیر کی۔ اور ہمارا ارادہ الیاس کے گھر بھی اسی روز جانے کا تھا
مگر وہ اپنے آپ کو کچھ چیز سمجھتا تھا۔ اور اس نے یہ منظور نہ کیا کہ ہم اچانک

اُسکے گہر جا پہنچیں۔ چنانچہ ہم الیاس بیگ کے گہر سے دو گہنٹے کی مسافت پر اُس کے ایک دولتمند چچا کے گہر جا کر ٹہرے اور اُس نے بڑے تکلف سے ہماری دعوت کی۔ اِس اثناء میں الیاس بیگ نے اپنی اہلیہ کو پیغام بہیجدیا کہ ہم آگئے ہیں۔ اور دوسرے دن ہم یکم جون کو دکیاب کے گاؤں میں داخل ہوئے۔ الیاس کے بیشمار دوست اور رشتہ دار ہمارے استقبال کے لیئے آئے۔ اور ہم سے نہائت تپاک سے ملے۔ الیاس نے مجھے ایک خوبصورت خیمہ میں اُتارنا چاہا۔ مگر میری آنکھیں سبزی کے لیئے ترستی تھیں۔ اِس لیئے میں نے اُسکے باغ میں اُترنا پسند کیا۔ یہاں ہم تہوڑی دیر ٹھہرے۔ اور پھر دارالخلافہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اور بخیریت تمام وہاں جا پہنچے۔ دارالخلافہ کو جب دور سے دیکھا جاوے تو اُسکے گرد کے باغات اُس کے گنبد اور مینار دل پر عجیب اثر پیدا کرتے ہیں۔ جس وقت میں اُس شہر میں بڑے دروازے سے داخل ہونے لگا تو میرے دل میں خیال آیا کہ خان خیوا کی بیرحمی اور ظلم تمام تاتاریوں میں مشہور ہے۔ دیکھیئے یہہ مجھسے کیسا سلوک کرتا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ یہ خان ہر ایک مشتبہ اجنبی کو اپنا غلام بنا لیتا ہے۔ چنانچہ حال میں اُسنے ایسا ہی سلوک ایک ہند وشہزادے سے کیا تھا۔ یہ تمام باتیں نہایت ڈرانے والی تھیں۔ مگر میں نے خدا پر بہروسہ کیا ہوا تھا۔ اور ہر ایک قسم کی مصیبت سہنے کے لیئے تیار رہتا تھا۔ میں نے اپنے اوسان خطا ہونے دیئے۔ اور دلمیں حکمتیں سوچتا رہا۔ جنکے ذریعے میں سمجھ سکتا تھا کہ اِس متعصب ظالم کی آنکھوں میں میں خاک ڈال دونگا۔ مینے خیوا کے تمام اُن مشہور دیویوں کا حال معلوم کر لیا تھا۔ جو وقتاً فوقتاً استنبول آتے رہتے تھے۔ انمیں شکر اللہ جو دس سال تک قسطنطنیہ میں بحیثیت سفیر رہا تھا۔ بہت مشہور تھا۔ مجھے

یوں ہی سا یاد تھا کہ ترکی وزیر کے یہاں مینے اُس شخص کو دیکھا تھا۔ میں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ میں یہی کہوں گا کہ میں آپ کا واقف ہوں اور استنبول میں آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ چاہے یہ شخص مجھے پہچانے یا نہ پہچانے میں یہی کہے جاؤں گا کہ جب آپ خان خیوا کے سفیر تھے تو آپ مجھ سے استنبول میں ملے تھے۔

جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو بہت سے آدمی دروازے پر ہمارے انتظار میں آگے ہی کھڑے تھے۔ اُنکے پاس روٹیاں اور خشک میوے تھے جو یہ ہمارے لیئے لائے تھے۔ کئی سال سے یہاں حاجی نہیں آئے تھے۔ اسلیئے لوگوں کو اُنکا بہت انتظار تھا۔ جب ہم وارد ہوئے تو ہر طرف سے "امان سن گلا نیزر" (خوش آمدید) کی صدا آنے لگی۔ بعض لوگ ہمیں دیکھکر "باشہباز م" (اہا میرے باز) "ہا رار سلانم" (اہا میرے شیرا) کے نعرے مارنے لگے۔ اِس موقعہ پر حاجی بلال نے تلقین اور نعت خوانی شروع کر دی۔ اور چونکہ میری آواز سب سے بلند تھی لوگ میرے ہاتھوں اور پاؤں اور پھٹے پُرانے کپڑوں کو اِس طرح بوسے دیتے تھے کہ گویا میں اوّل درجہ کا ولی تھا۔ اور ابھی ابھی آسمان سے اُترا تھا۔ ہم سب حسب رواج ملک کارواں سرائے میں جو چُنگی خانہ بھی ہے ٹھہرے۔ اور وہاں سے میں شکراللہ بے کی تلاش میں نکلا۔ مجھے خبر ملی تھی کہ اب وہ بیکار ہے اور مدرسہ محمد امین کی ایک کوٹھری ملی جو خیوا میں تمام عمارات سے عمدہ عمارت ہے رہتا ہے۔ میں اُس مدرسہ میں گیا۔ اور اُسکے خدمتگار کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ آپکو ایک آفندی جو آپکا واقف ہے استنبول سے ملنے آیا ہے۔ یہ سُنکر وہ متعجب ہوا۔ اور مدرسہ سے باہر نکل آیا۔ اور مجھے خستہ حال دیکھکر اور بھی زیادہ متعجب ہوا۔ بہر حال وہ مجھے

اندر رہ گیا - اور جب میں نے ترکی زبان میں ترکوں کی طرح اس سے گفتگو کی تو وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا - اور اپنے تمام دوستوں کا حال نام بنام مجھ سے پوچھا - میں نے اُسکے سوالات کے جواب باصواب دیئے آخیر میں اُس نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ بہشت چھوڑ کر ایسے خوفناک ممالک میں کیسے آگئے - میں نے اُسکو کہا کہ میں نقشبندی درویش ہوں - میرے پیر کا حکم تھا کہ تم نے ضرور سفر کرنا - اور آپ جانتے ہیں کہ مرید کا کام پیر کا حکم بجالانا ہے - اِس بات سے اُسکی تسلی ہو گئی - اور کہنے لگا تو معلوم ہوا کہ آپ بخارا کو جاوینگے - میں نے کہا کہ انشاء اللہ تعالیٰ - پھر اُس نے مجھے کہا کہ تم میرے مکان میں اُترو - مگر میں نے معافی مانگ لی اور کہا کہ میرے رفیق کاروان سرائے میں ہیں - اور اُنکے پاس ہی رہنا مناسب ہے - تھوڑی دیر کے بعد میں اُس سے رخصت ہوا - اور بوقت رخصت نے وعدہ کیا کہ میں پھر بھی حاضر ہونگا -

دوسرے دن ایک اہلکار دربار تحائف لیکر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ خان خیوا آپکو یاد کرتے ہیں - آپ شام کو فاتحہ خوانی کے لیئے تشریف لائیے میں نے کہا بہت اچھا - شام کو میں شکر اللہ بے کے ہاں گیا - وہ بھی ملاقات کے وقت موجود رہنا چاہتا تھا - اُسکے ساتھ میں دربار میں حاضر ہوا - راہ میں اُس نے قواعد اور آداب دربار سے مجھے کماحقہ آگاہ کر دیا - شکر اللہ بے نے مجھے بھی کہدیا کہ یہاں کا وزیر جسکو مہتر کہتے ہیں میرا دشمن ہے - اور مجھے اپنا رقیب سمجھتا ہے - اِسلیئے میری سفارش بجائے فایدے کے کیا عجب ہے کہ تم کو نقصان پہنچائے - حسب رواج پہلے میں نے مہتر کی ملاقات کی - اس وقت مہتر کے گھر میں بھیڑ لگی ہوئی تھی - جب ہم گئے تو لوگوں نے مودب ہو کر ہمارے لیئے رستہ چھوڑ دیا

چند عورتیں بھی وہاں موجود تھیں۔ اُنہوں نے مجھے دیکھکر میری طرف اشارہ کیا۔ اور کہا یہ درویش قسطنطنیہ سے آیا ہے۔ یہ ہمارے خان کے حق میں دعا کریگا۔ خداوند تعالیٰ اُسکی دعا قبول کرے۔

مہتر اُس وقت ایک مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اُسکی ہر بات پر تمام لوگ جو اُس کے اردگرد بیٹھے تھے مسکراتے تھے۔ اُسکے رنگ اور لمبی ڈاڑھی سے جو سینہ تک پہنچتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایرانی ہے۔ جب اُس نے مجھے آتے دیکھا تو کچھ اپنے خدام سے کہا۔ میں مردانہ وار سیدھا اُسکی طرف چلا گیا۔ اور ایک اعلےٰ جگہ پر جو درویشوں کے لئے مقرر تھی بیٹھ گیا۔ معمولی دعا کے بعد جس پر ہر ایک شخص نے جو وہاں موجود تھا ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا میں نے آمین کہی۔ جب معمولی گفتگو اور علیک سلیک ہو چکی تو اُس نے مجھے کہا کہ "حضرت" (حضرت سے مراد خان تھی) (حضرت کے لفظ کا اُس کے منہ سے نکلنا تھا کہ تمام حاضرین مودبانہ سر و قد کھڑے ہو گئے) "آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ بہت خوش ہونگے۔ اگر آپ دو سطریں سفیر ایران یا سلطان روم کے پیش کر سکیں۔ میں نے کہا کہ میں دنیاوی مطلب یا کسی سے کچھ مانگنے نہیں آیا۔ لیکن بہ نظر احتیاط یہ فرمان جس پر طغرا یعنے مہر سلطانی ہے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ یہ پروانہ راہداری میں نے اُس کے حوالہ کیا۔ اُسنے مہر کو سر پر رکھا۔ اور کہا کہ یہ دستاویز میں خان کو دیدونگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا اور کہنے لگا کہ خان آپکی ملاقات کے لئے تیار ہیں۔ شکر اللہ بے پہلے وہاں گیا۔ اور مجھے تھوڑی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ کیونکہ شکر اللہ بے نے خان کو کہدیا تھا کہ اگرچہ یہ صورت درویشانہ میں آیا ہے مگر ہر ایک پاشا کا واقف ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دو افسر آئے۔ اور ایک نے

مجھے دائیں اور دوسرے نے بائیں بازو سے پکڑ لیا پھر کسی نے میرے روبرو سے
پردہ اُٹھا دیا اور میں نے اپنے آپ کو سید محمد خاں پادشاہ خوارزم
کے حضور میں پایا۔ خان خیوا اُس وقت ایک تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے
بازو کے نیچے مخمل کی گول مسند تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سونیکا
عصا تھا۔ مینے دربار میں حاضر ہوتے ہی اپنے دونوں ہاتھ حسب دستور
اُٹھائے اور کل حاضرین سمیت خان نے بھی میرے ساتھ ہاتھ اُٹھا لئے۔ مینے
ایک چھوٹی سی سورۃ قرآن شریف کی پڑھی۔ دو بار درود شریف پڑھا
اور پھر دعا مانگی جب خان نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر آمین کہی تو ہر ایک
شخص نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "قبول بلغئی" یعنے میری دعا قبول ہو۔ پھر
میں آگے بڑھا اور خان خیوا نے ہاتھ بڑھا کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اسکے بعد میں
اُنہیں پاؤں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ خان نے پھر مجھ سے راستے کے سفر کے
متعلق کئی سوال کئے اور میں نے کہا کہ میں نے راستہ میں بہت تکلیف اُٹھائی
ہے۔ مگر حضرت کا دیدار مبارک کرنے میں تمام تکلیف راحت سے بدل گئی ہے
پھر مینے کہا کہ شکر ہے اللہ کا کہ جس نے مجھے ایسا خوش قسمت بنایا ہے۔ زہے
قسمت کہ مجھے جمال جہاں آرا دیکھنا نصیب ہوا۔ اور یہ نیک شگون اس بات کا
ہے کہ میں اپنے سفر میں مقصود دل حاصل کرونگا۔ اس کے بعد خان نے مجھ سے
دریافت کیا کہ کیا تم خیوا میں کچھ عرصہ قیام کرو گے۔ اور تمہارے پاس
خرچ وغیرہ ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں چند دن ٹھہروں گا۔ کیونکہ مجھ کو یہاں کے
جملہ اولیاؤں کی قبروں کی زیارت کرنی ہے۔ اور خرچ کی نسبت ہم درویشوں
کا گذارہ توکل پر ہے۔ مجھ میں میرے پیر کا نفس ہے اور اس نفس کے ذریعہ
میں پانچ دن بغیر کھائے پیئے زندہ رہ سکتا ہوں اخیر میں میری خواہش

بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ آپ عمر طبعی کو پہنچیں۔

میری گفتگو سے خان خیوا ایسا خوش ہوا کہ اُس نے حکم دیا کہ فوراً مجھے بیس اشرفیاں اور ایک عمدہ گدھا انعام دیا جائے۔ میں نے روپیہ تو نہ لیا۔ اور کہا کہ درویشوں کے مذہب میں روپیہ لینا حرام ہے۔ مگر سفید رنگ کا گدھا لے لیا کیونکہ درویش عموماً سفید رنگ کا جانور سواری کے لیے منتخب کرتے ہیں میں نے چاہا کہ آداب بجا لاکر رخصت ہوں کہ خان نے مجھے کہا کہ تم جب تک یہاں ہو۔ میرے مہمان ہو اور ہر روز دو تنگ (ایک سکہ ہے جو چھ پنس کے برابر ہوتا ہے) شاہی خزانے سے کھانے پینے کے لئے لیا کرو۔ یہ بات بھی میں نے منظور نہ کی۔ اور خان کے حق میں دعا کر کے وہاں سے رخصت ہوا۔ راہ میں ایک مجمع کثیر میرے گرد جمع ہو گیا۔ ہر طرف سے سلام علیکم کی بوچھاڑیں ہونے لگیں۔ آخر جب میں سرائے میں اپنی کوٹھڑی میں پہنچا۔ اُس وقت میرے دم میں دم آیا۔

خان خیوا کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ عیاش۔ بیمار کند طبیعت اور ظالم انسان ہے۔ اِسکی آنکھیں اندر کی طرف گھُسی ہوئی تھیں۔ اُس کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے اور اُسکی آواز کانپتی تھی۔ میں نے خدا کا شکر کیا کہ یہ ظالم مجھ سے مہربانی سے پیش آیا۔ اور سوچنے لگا کہ جتنا عرصہ مجھے خیوا میں رہنا ہے وہ کس طرح اپنی حسب مرضی گذاروں۔

خیوا میں بہت کم چیزیں دیکھنے کے قابل تھیں۔ خیوا میں ہر روز اہلکاران سرکار سوداگران اور خان کے ہاں سے مجھے دعوت کا پیغام آتا تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ میں خان کے نزدیک معتبر ہوں اسلیئے وہ اپنے مطلب کے لئے میرے اور میرے رفقا کی دعوتیں کرتے تھے کچھ نہ پوچھیئے کہ ہر دفعہ چھ سات

دعوتیں قبول کرنے میں مجھے کسقدر تکلیف ہوتی تھی جس وقت اب میں اس
زمانے کو جبکہ مجھے چربی کی یخنی میں بہتے چانولوں پر صبح کے ۴ بجے سے شام کے ۴ بجے تک کئی کئی
بار بیٹھنا پڑتا تھا - یاد کرتا ہوں تو بے اختیار کانپ اُٹھتا ہوں - دن میں
کئی بار مجھے صبح سے لیکر شام کے چار بجے تک لوگوں کے ساتھ پلاؤ کھانا پڑتا
تھا - میں جس مکان میں فروکش تھا - اُس کا نام توشہ باز تھا - اُس مکان میں ایک
مسجد اور ایک تالاب تھا - اِس لئے اسکو جائداد وقف سمجھتے تھے - اس
جگہ مجھے بہت اچھا موقعہ اُزبکوں کے حالات دریافت کرنیکا ملا - مرد یہاں کی
اونچی اونچی مخروطی شکل کی بالوں والی ٹوپیاں پہنتے ہیں - اِنکے بوٹ بڑے
بڑے اور بیڈول روسی چمڑے کے بنے ہوئے ہوتے ہیں - گرمی کے موسم
میں یہ صرف ایک لمبی قمیص پہنتے ہیں - اُنکی عورتیں سر پر بڑی بڑی پگڑیاں
جو لمبائی میں اس قدر ہوتی ہیں کہ پندرہ یا بیس روسی رومال ان کے
بنیں پہنتی ہیں - اُن کے پاؤں میں بھی بڑے بڑے لکڑ توڑ بوٹ ہوتے
ہیں - اور گرمی کے موسم میں بیچاریاں پانی کے مشکے اُٹھاتی ہیں - یہ
عورتیں اکثر میرے قیام گاہ پر آتی تھیں - اور مجھے حاجی سمجھکر خاک شفا جو
حاجی لوگ مدینہ سے لاتے ہیں مانگتی تھیں - اُن لوگوں کا اعتقاد ہے کہ
یثرب کی مٹی کئی بیماریوں کو اچھا کر دیتی ہے - کئی مرد اور عورتیں مجھ سے
جھاڑ پھونک اور دم درود کراتی تھیں - جس وقت میں دم کر چکتا تھا تو ٹھنڈے
سانس بھرتی تھیں - اور اکثر یہ کہتی تھیں کہ اب ہم کو آرام ہے - میرا دم
کرنا یہاں اسقدر مشہور ہوا کہ میں نے پندرہ اشرفیاں ایام قیام میں کمائیں

خیوا میں مجھے معلوم ہو گیا کہ مہتر جو خان کا وزیر تھا میرا دشمن ہو گیا
ہے اور مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے - اُسکی عداوت کی وجہ صرف یہ تھی کہ

شکر اللہ بے میرا مربی تھا۔ یہہ تو نہ کہہ سکا کہ میں ترک نہیں ہوں مگر اُسنے خان کو یہہ پٹی پڑھائی کہ یہہ شخص درویشوں کے لباس میں دراصل سلطان کی طرف سے کوئی مخفی پیغام لایا ہے اور بخارا کو جا رہا ہے۔ مجھے اس بات کی خبر پہنچ چکی تھی کہ مہتر میری مخالفت پر کمربستہ ہے۔ اسلیئے جب چند دن کے بعد پھر دوبارہ میری دربار میں طلبی ہوئی تو مجھے کسی قسم کی حیرت نہ ہوئی۔ اس موقع پر خان کے دربار میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ خان نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہیں علوم دنیاوی بھی آتے ہیں۔ اور تم مقفیٰ اور مرصع عبارت لکھ سکتے ہو۔ اور خط گلزار تم کو لکھنا آتا ہے۔ اس نے مجھ سے خواہش کی کہ اہل استنبول کے خط میں کچھ لکھوں۔ میں خوب جانتا تھا کہ خان نے وزیر کی غمازی میں آکر مجھے ایسا حکم دیا ہے۔ میں نے قلمدان نکالا اور ایک پرزہ کاغذ لیکر اسپر مفصلہ ذیل عبارت لکھی :۔

" اے ذوالاقتدار زبردست اور ذیشان بادشاہ۔ میں تیرا ایک غریب ناچیز ملازم ہوں۔ یہ تیری قدردانی ہے کہ تو نے ذرہ کو آفتاب بنا دیا ہے میرا یہ خیال رہا ہے کہ وہ شخص جس کو مقفیٰ عبارت لکھنے کا شوق ہے ضرور بے وقوف ہے۔ اسلیئے میں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ گناہ بھی اگر بادشاہ کو پسند آجائے تو ثواب ہو جاتا ہے۔ اس لیئے مینے یہ عبارت لکھنے کی جرأت کی ہے "

میری اس خوشامدانہ تحریر سے خان بہت خوش ہوا۔ مگر مہتر میرے مطلب کو نہ پہنچا۔ پھر خان نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ اور چاے منگائی پھر گفتگو شروع ہوئی۔ اس وقت زیادہ تر ملکی معاملات پر بحث ہوتی رہی مگر میں نے درویشوں کی طرح ہر بات میں بے پرواہی اور لاعلمی ظاہر کی۔ مہتر نے ہر چند چاہا

کہ میرے کسی لفظ سے اُس کا دلی منشا پورا ہو۔ مگر اُسکو کامیابی نہ ہوئی۔ غرض خان کو یقین واثق ہو گیا کہ مہتر غلط کہتا ہے۔ اور میں درویش ہوں اُس نے میرے حال پر دوبارہ نوازش فرمائی۔ اور مجھے رخصت کے وقت کہا کہ تم ہر روز اپنا روزینہ خزانچی سے لیا کرو۔ پھر ایک لیاول دربار کے ایک افسر کو حکم دیا کہ اِس درویش کو خزانچی کے پاس لیجاؤ۔ جب میں خزانچی کے پاس گیا تو اُس نے فوراً مجھے رقم معلومہ ادا کر دی۔ اُس وقت وہ عجیب شغل میں مشغول تھا۔ اُس وقت وہ خلعت درست کر رہا تھا۔ چار قسم کی خلعت تھی۔ تمام شوخ رنگ کے ریشمی پارچات سے جن پر طلائی بیل بوٹے کاڑھے ہوئے تھے بنائے گئے تھے۔ انمیں سے ایک کو وہ چار سروں کا خلعت کہتا تھا۔ دوسرے قسم کے خلعت کو بارہ سر کا۔ تیسری قسم کے خلعت کو بیس سر کا۔ اور چوتھی قسم والے کو چالیس سر کا۔ میں حیران ہوا کہ اِن سروں سے کیا مراد ہے۔ خلعت پر تو کوئی بھی سر نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے خزانچی سے پوچھا کہ اِس سے کیا مطلب ہے۔ اُس نے میری بات کا مجھے کچھ جواب نہ دیا۔ اور کہا کہ کل علی الصباح بازار کے چوک میں آنا۔ وقت مقررہ پر میں وہاں پہنچا میں نے دیکھا کہ وہاں سو سوار گرد آلود کھڑے ہیں۔ اُنکے لباس بھی گرد آلود تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی سفر سے آئے ہیں۔ ہر سوار کے ساتھ دو دو عقیدی تھے۔ جنمیں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ جو گھوڑوں کی [illegible] سے یا کمان کے گوشوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اِن سواروں نے یہ اسیر خان اور امرا کے نذر کیئے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے گھوڑوں کی سی بڑی بڑی خورجیاں اوتاریں اور جب اُن خورجیوں کو خالی کیا تو اُنمیں سے انسانوں کے سر اِس طرح گرے جیسے آلو گرتے ہیں۔ پھر ایک تھیلے کے سر ایک اہلکار شمار کرتا تھا۔ اور پھر سوار

جو اُن سروں کو لایا تھا۔ بہر رسید خزانچی کے نام کی دیدیتا تھا۔ سوار رسید لیکر اُدہر روانہ ہو جاتا تھا۔ اور اہلکار خان ٹھوکروں سے سروں کو انبار کیطرف پھینکتا جاتا تھا۔ اِن سواروں کو سروں کی تعداد کے بموجب خلعتیں ملتی تھیں۔

اِس یساول کو جو مجھے خزانچی کے پاس لیجایا کرتا تھا کچھ اور کام بھی تھا۔ ناچار مجھے بھی اُسکے ساتھ جانا پڑا۔ ایک اور چوک میں تین سو چودور کھڑے تھے۔ چودور بھی ترکمانوں کا ایک قبیلہ ہے اِن قیدیوں کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ بھوک سے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اور کئی دِن کے فاقوں سے اور موت کے ڈر سے ایسے نقیہہ معلوم ہوتے تھے کہ گویا ابھی قبر سے اُٹھکر آئے ہیں۔ یہ غریب دو قطاروں میں کھڑے کیئے گئے تھے۔ جو چالیس سال سے عمر میں کم تھے۔ اور ہدیہ کرنے یا بیچنے کے قابل تھے۔ وہ ایک طرف کھڑے تھے۔ اور جو عمر رسیدہ تھے وہ دوسری طرف کھڑے کیئے گئے تھے۔ جوان قیدی مسلسل بہ طوق وزنجیر غلاموں میں داخل کر دیئے گئے۔ اور پندرہ پندرہ کی قطاروں میں ہمارے روبرو گذر گئے۔ مُسن قیدیوں میں سے بعض تو دار پہ چڑھائے گئے۔ اور آٹھ کی آنکھیں ہمارے روبرو جلاّد نے خنجر کی نوک سے نکال ڈالیں اُنکے سینوں پر چڑھ کر یکے بعد دیگرے ایک تیز خنجر سے آنکھیں نکال لیں جب جلاّد اِس ظلم سے فارغ ہوا تو اُس نے خون چکاں خنجر کو ایک سن رسیدہ قیدی کی لمبی ڈاڑہی سے صاف کیا۔ خدا یہ نظارہ دشمن کو بھی نہ دکھائے جس وقت یہ اندہے ہو گئے تو اُنکی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کاٹدی گئیں۔ یہہ مظلوم اندہے اُٹھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور پھر گر پڑتے تھے

کبھی ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ کبھی تھک کر گر پڑتے تھے۔ کبھی درد سے بیتاب ہوکر زمین پر پانوں مارتے تھے۔

ایک مہینہ میں خیوا میں رہا۔ جب خان سے میں رخصت ہونے لگا تو اُس نے مجھے کہا کہ واپسی پر تم اسی رستہ جانا۔ میں تمہارے ساتھ ایک ایلچی کو سلطان کی خدمت میں بھیجوں گا۔ تاکہ سلطان حال بھی مجھے خان خیوا تسلیم کرلے۔ میں نے کہا کہ ہمارے مذہب میں زمانہ مستقبل کی نسبت کوئی ارادہ کرنا گناہ ہے دیکھیے قسمت کیا دکھاتی ہے۔ یہہ کہکر اور اپنے دوستوں اور واقفوں سے ملکر میں خیوا سے رخصت ہوا۔

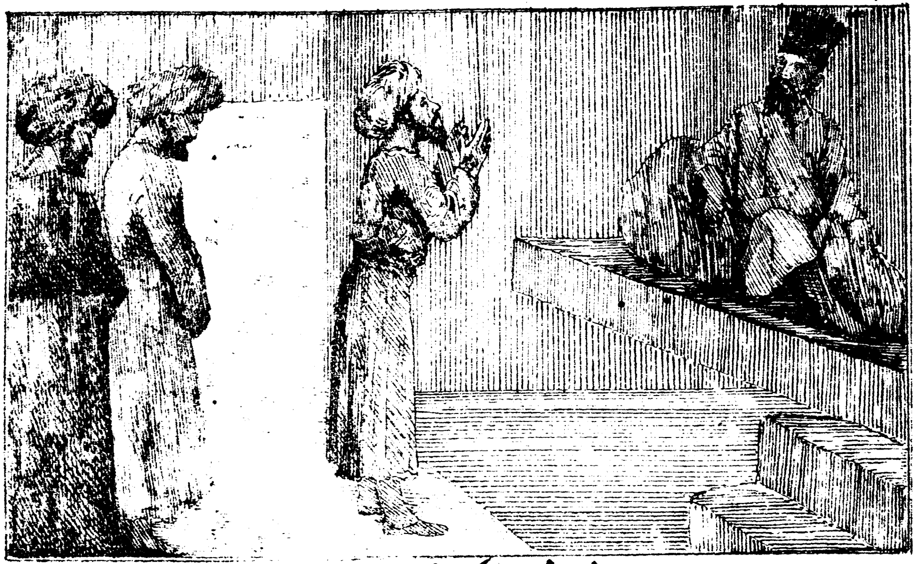

خانِ خیوا کے حضور میں

فصل بست ودوم

خیوا سے بخارا تک

روانگی کے وقت ہم تمام رفقا توشہ باز کے سایۂ دار صحن میں جمع ہوئے
خیوا کے باشندوں کی فیاضی ہمارے قافلے کے سازوسامان سے عیاں تھی
ہم نے کرم خوردہ ٹوپیاں جو ترکمانوں کے ملک میں پہنی تھیں اُتار
ڈالیں۔ اور اب سفید پگڑیاں سر پر باندھیں پھٹے پُرانے کپڑے بدلکر
اُنکے عوض میرے رفقانے پرتکلف لباس زیب تن کیئے۔ ہمارے تھیلے
جو خالی تھے اب مختلف اشیا سے پھٹے پڑتے تھے۔ اس وقت ہم اسقدر
متموّل تھے کہ جو ہم میں نہایت غریب تھا۔ اُس کے پاس بھی ایک چھوٹا
موٹا گدھا موجود تھا۔ اب ہم نے آٹا نہیں اُٹھایا ہوا تھا۔ بلکہ آٹے کے
عوض ہمارے تھیلوں میں سفید کلیچے۔ چاول۔ مکھن اور مصری تھی میرے
پاس بھی ایک عمدہ پیرہن تھا۔ مگر میں نے اپنا پہلا لباس نہ بدلا اور پیرہن کا
کو زیب بدن کرنا ابھی قرین مصلحت نہ سمجھا کہ مبادا اُس کے اثر سے طبیعت
آرام طلب ہو جائے۔ غرض بغلگیریوں کے [illegible] داعوان کی ہو [illegible]
کے درمیان ہم ۲ جون کو تیسرے پہر خیوا سے [illegible]

اس قدر عزت تھی کہ بعض ہمارے معتقد نصف گھنٹہ تک ہمارے پیچھے دوڑتے آئے۔ اور جب رخصت ہونے لگے تو بہت روئے۔ اور کہنے لگے کہ خدا جانے پھر خیوا کی قسمت کب جاگے۔ اور اس قدر بزرگ اور رندا رسیدہ آدمی پھر یہاں آئیں۔ پہلی رات ہمنے **گادشی** نامی ایک موضع میں بسر کی۔ اس جگہ ہم **قلندرخانہ** میں مقیم ہوئے۔ قلندرخانہ ایک قسم کی سرائے ہوتی ہے جو مخلص درویشوں کی خاطر بنائی جاتی ہے۔ یہاں دنیا دار فردکش نہیں ہوتے۔ اس جگہ سے ہم **خانقاہ** نامی مقام میں آگئے۔ اور یہاں بھی قلندرخانہ میں فردکش ہوئے۔ اس قلندرخانہ میں ہمکو دو نیم برہنہ درویش ملے۔ یہ اُس وقت افیون کھانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر اُنہوں نے مجھے بھی افیون کی تواضع کی۔ مگر جب میں نے انکار کیا تو متعجب ہوئے۔ پھر اُنہوں نے مجھے زبردستی چائے پلائی۔ میں چائے پی رہا تھا۔ اور یہ افیون کی چسکیاں لگا رہے تھے۔ نصف گھنٹہ میں چینا بیگم نے اپنا اثر دکھایا۔ مگر ایک درویش تو نشے کیحالت میں بہت خوش اور بشاش معلوم ہوتا تھا۔ اور دوسرا رنج والم کی تصویر بنا ہوا تھا۔

جس دن ہم خانقاہ سے روانہ ہوئے تو دن چھپے دریائے آکسس (جیحون) پر پہنچے۔ غالباً موسم بہار کی بارش نے دریا کے پانی کو طغیانی دی ہوگی۔ کیونکہ اس جگہ یہ دریا مجھے میرے خیال سے بڑھکر وسیع نظر آیا۔ شکم دریا کا پانی زردی مائل ہے۔ اور ایسا شفاف نہیں ہے جیسا کہ اس نہر کا ہے جو اس دریا سے نکلتی ہے۔ نہر کا پانی چونکہ آہستہ آہستہ بہتا ہے۔ اس لیے بہت جلد سرد ہو جاتا ہے۔ جہاں کہیں دریا میں ریت بیٹھ گئی ہے وہاں کا پانی اس قدر میٹھا ہے کہ شائد ہی دنیا کے کسی دریا کا ہو۔ اس

دریا کے عبور کرنے کے لئے نہ صرف محصول ادا کرنا پڑتا ہے بلکہ "تپاک" پروانہ راہداری کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تمام حاجیوں کے لئے ایک ہی پروانہ دیا گیا۔ مگر مجھے خاص طور پر ایک پروانہ علیحدہ دیا گیا۔ جس کا مضمون یہ تھا "محافظان سرحد اور تحصیل محصول کرنے والوں کو معلوم ہو کہ حاجی ملا عبدالرشید آفندی کو پروانہ دیا گیا ہے۔ کوئی شخص اس کو دق نہ کرے اور نہ اسکے معاملات میں دخل دے۔"

دس بجے ہم اس دریا سے گذرنے لگے۔ اور جب آفتاب غروب ہونے لگا تو دریا کے پار پہنچے۔ اگر ہمارے ساتھ اسباب اور جانوروں کا بکھیڑا نہ ہوتا تو ہم بہت جلد نصف گھنٹہ میں دریا کے پار ہو جاتے۔ لیکن گدہوں کے اتارنے چڑھانے اور مختلف کاموں میں دیر لگ گئی۔ ہر دس منٹ کے بعد دریا کی پایاب سطح آجاتی تھی۔ اور ناچار ہمیں کشتی سے اترنا پڑتا تھا۔ بعض جگہ تو مسافروں کو جانوروں کو بھی اٹھا کر لیجانا پڑتا تھا۔ اس جگہ ایک معاملہ ایسا پیش آیا کہ مجھے اگر اب بھی یاد آتا ہے تو ہنسی آجاتی ہے۔ حاجی یعقوب ایک توانا دراز قد آدمی تھا۔ مگر اسکا گدہا چھوٹے قد کا جانور تھا۔ اس موقع پر اس نے اپنے گدہے کو اٹھا کر اپنی پشت پر اس طرح ڈال لیا جس طرح کوئی ننھے بچے کو ڈال لیتا ہے اور گدہے نے بھی نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا سر حاجی کی گردن کے ساتھ لگا دیا۔ ہمارا قافلہ نہایت آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ اس لئے جب ہم آق امش کے قریب پہنچے جسکے لفظی معنے سفید گھاس ہیں تو کاروان باشی میں اور دو اور درویشوں نے ارادہ کیا کہ چلو شیرخان کا میلہ بھی دیکھ آئیں۔ جو وہاں ہفتہ وار لگتا ہے۔ اور لگے ہاتھ کھانے پینے کا سامان بھی مہیا کر لیں۔

شرخان میں تین سو دکانیں ہیں۔ یہ دوکانیں ہفتہ میں دو دن کھلتی ہیں۔ اور یہاں گردو نواح کے مستقل باشندے اور نیز خانہ بدوش لوگ آکر سودا سلف خریدتے ہیں۔ میں نے اپنے رفقا سے کہا کہ تم کھانے پینے کی چیزیں خریدو اور میں ابھی آتا ہوں۔ یہاں سے میں قلندر خانہ کی طرف گیا۔ قلندر خانہ میں پھر مجھے کئی درویش ملے۔ جو بھنگ کے نشہ میں بیہوش تھے اور کثرت سے نشہ استعمال کرنے کی وجہ سے صرف پوست اور استخوان ہو رہے تھے۔ خان خیوا کا حکم ہے کہ چونکہ شراب حرام ہے۔ ہرگز کوئی نہ پیئے۔ پینے والا تہ تیغ کیا جائیگا۔ ممانعت شراب کے باعث لوگ عموماً افیون اور بھنگ کا نشہ استعمال کرتے ہیں۔ قلندر خانہ سے میں میلہ میں آیا۔ یہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اور ایک بڑی عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ سودا خریدنے والے اور بیچنے والے دونوں فریق گھوڑوں پر سوار تھے۔ کرغیز عورتیں گھوڑوں پر سوار تھیں۔ اور قمص بیچ رہی تھیں۔ قمس ایک قسم کی کھٹی فرنی ہوتی ہے جو گھوڑیوں کے دودھ سے تیار کی جاتی ہے۔ یہ عورتیں قمص کے مرتبان لئے دوڑتے خریداروں کے منہ کے پاس بڑی تیزی کے ساتھ لیجاتی تھیں۔ مگر کیا مجال جو ایک قطرہ بھی گر جائے۔ میلہ دیکھکر ہم قافلہ میں واپس آگئے۔ اہل قافلہ ہمارے انتظار میں بے قرار تھے۔ رات کے وقت ہم نے دوسری منزل کی جانب کوچ کیا۔ اس وقت چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ہمارا قافلہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ مسافروں کے سائے اس چاندنی میں عجیب معلوم ہوتے تھے۔ ہمارے جانب راست دریائے آکسس بہ رہا تھا۔ اور جانب چپ دشت تاتار پھیلا ہوا تھا۔ راہ میں دوسرے دن ہمیں چند خانہ بدوش کرغیز ملے انہیں عورتیں بھی تھیں ایک عورت سے میں نے پوچھا کہ تم کو ایک جگہ آرام نہیں آتا۔

ہر چیز اِدھر اُدھر پھرتی ہے۔ اُسنے مجھسے کہا کہ ہم سُست اور کاہل نہیں ہیں۔ یہ ہی ہم لوگوں کو مبارک رہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ آفتاب۔ ماہتاب۔ ستارے حیوان پرندے اور مچھلیاں سب متحرک رہتی ہیں۔ مگر مردے اور زمین ساکن رہتے ہیں۔

دریائے آکس کے کنارے پر ہمیں پانچ سوداگر ملے۔ یہ بخارا سے چار دن کے چلے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے ہمکو خوشخبری دی کہ رستہ بالکل صاف ہے اور غالباً تم لوگ کل اُس قافلہ کو جا ملوگے۔ جو ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

۸ جولائی کی صبح کو رستہ میں ہمیں دو شخص ملے جو ننگے مادر زاد تھے۔ بیچاروں کے تن پر ایک چیتھڑا تک نہ تھا۔ جونہیں اُنہوں نے ہمکو دیکھا تو چلانے لگے کہ خدا کے واسطے ایک ٹکڑہ روٹی کا ہمیں دو۔ اور پھر انکو غش آگیا۔ ہمنے اُنکو روٹی کھلائی اور پانی پلایا۔ جب اُنمیں توانائی آئی تو اُنہوں نے ہمکو کہا کہ ہم ھواویس کے ملاح ہیں۔ تکّی ترکمانوں نے جنکی تعداد قریب ایکسو پچاس کے تھی ہمیں لوٹ لیا ہے اور فقیر کر دیا ہے۔ خدا کے لیئے یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اور کہیں چھپ جاؤ۔ ورنہ ہرچند کہ تم حاجی ہو۔ تمکو بھی لوٹ لینگے اور برہنہ کر کے جنگل میں چھوڑ جاویں گے۔ یہ کافر کسی بات سے نہیں ڈرتے جونہیں کاروان باشی نے ان ترکمانوں کا نام سُنا فوراً اُس نے حکم دیا کہ لوٹ جاؤ۔ ہمنے لدے ہوئے اونٹوں کو جہانتک وہ بھاگ سکتے تھے بھگایا۔ اگرچہ اُن قزاقوں سے جو گھوڑوں پر سوار تھے اگر وہ ہمارا تعاقب کرتے تو جان بر ہونا دشوار ہوتا۔ مگر ہمیں اتنی تسلی تھی کہ جتنی دیر میں ڈیڑھ سوار دریا عبور کریں گے۔ ہم تنکلو میں پہنچ جاویں گے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ تنکلو سے ششکزی بہر کر دشت خلاطہ میں داخل ہو جائیں۔ اس دشت میں قزاقوں کے آنے کا

دُور نہ تھا۔ بڑی جدّ و جہد کے بعد ہم تنگلو میں پہنچے۔ پہنچنے کو تو پہنچ گئے۔ مگر ہمارے مویشیوں میں دم باقی نہ رہ تھا۔ تین گھنٹے ہم نے یہاں قیام کیا مگر یہہ تین گھنٹے نہایت قلق اور اضطراب میں گذرے۔ یہ وقت ہم نے سفر کی تیاری میں گذارا۔ اَور آفتاب غروب نہیں ہوا تھا کہ ہم تنگلو سے خلاآطہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم نے اِس سے پہلے دشت بیابان کا سفر کیا ہوا تھا۔ اِس لیئے ہمارے ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہم نے اِس دشت میں قدم رکھا تو ہمارے دل کی حالت کیا تھی۔ گومش تپہ سے خیوآ تک ہم نے ماہ مئی میں سفر کیا تھا۔ اَور یہہ مہینہ جولائی کا تھا۔ اِن ایام اور نہیں تو بارش کا پانی ہی ہمیں کہیں کہیں ملجاتا تھا۔ جولائی کے مہینہ میں ہمیں آب شور ملنے کی بھی امید تھی جب ہم اِس دشت کی طرف روانہ ہوئے تو آپ دریا کی طرف ہمنے نہایت حسرت کے ساتھ دیکھا۔ ہمارے بے زبان مویشی بھی ہمارے ساتھ اِس حسرت میں شریک تھے اَور مُڑ مُڑ کر آب دریا کی طرف دیکھتے تھے۔ ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے کہ مبادا ہماری آواز تُرکمان سُن لیں۔ اور آ دبائیں۔ خوش قسمتی سے زمین نرم تھی۔ اِس لیئے ہمارے مویشیوں کے چلنے کی آواز بھی سُنائی نہ دیتی تھی۔ اور اُس وقت ہمارے رفیق کو گانے کا شوق بھی نہ چرایا آدھی رات کے وقت ہم ایسے جنگل میں پہنچے جہاں ہم سب کو پاپیادہ چلنا پڑا کیونکہ ہمارے جانور گھٹنوں تک ریت میں غرق ہوئے جاتے تھے۔

دوسرے دن صبح کے وقت ہم پانچ جولائی کو آدم کریلگن (آدم ڈس) نامی ایک مقام میں پہنچے۔ واقعی یہ مقام اسم بامسمّے تھا۔ جہانتک نگاہ کام کرتی تھی بجز ریت کے اَور کچھہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ البتہ ریت میں کہیں

کہیں مردہ آدمیوں اور حیوانوں کی ہڈیاں دکھائی دیتی تھیں جو اس پرخطر دشت میں راستہ بھول کر داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ سیاحوں نے راہنمائی کی غرض سے ان ہڈیوں کو ڈھیریوں میں جمع کر رکھا تھا۔ یہاں اب ہمیں ترکمانوں کا ڈر مطلق نہ رہا تھا۔ کیونکہ تمام دنیا میں کوئی ایسا گھوڑا نہ ملے گا جو ایک منزل بھی اس ریت میں راستہ طے کرسکے۔ ہمارے کارواں باشی نے ہمیں اطلاع دی کہ تنکلو سے بخارا تک چھٹے یوم کا راستہ ہے۔ ان چھ یوم میں مصیبت کے تین دن ریت میں گذرتے ہیں اور پھر سخت زمین آجاتی ہے۔ جو کہیں کہیں سرسبز بھی ہے۔ ہم نے جو پانی اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا وہ ہمیں یقین تھا کہ کم سے کم اور ڈیڑھ دن تو ضرور اکتفا کریگا۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ پانی نہایت غیر معمولی طور پر کم ہو رہا ہے اور بخار بنکر اُڑتا جاتا ہے۔ اس دشت میں ہر ایک مسافر پانی کو جان کے برابر عزیز سمجھتا ہے۔ اور جب لوگ سوتے تھے تو مشکیزہ چھاتی پر رکھ لیتے تھے گرمی شدت کی تھی۔ لیکن پھر بھی ہم ہر روز چھ گھنٹے سفر کرتے تھے تاکہ جلد اس پرخطر دشت سے باہر نکل جائیں۔ اس دشت میں ایک خاص ہوا (تیباد) بھی کسی کسی وقت چلتی ہے۔ جسکے آگے افریقہ کی باد سموم بھی گرد ہے۔ اس ہوا میں بھی کوئی متنفس زندہ نہیں رہسکتا۔ اس قاتل ہوا کا دو سیکنڈ بھر چلنا خاتمے کا کام تمام کر دیتا۔ لیکن شکر ہے کہ ہنگام سفر یہ ہوا نہ چلی۔ پھر بھی چونکہ ہم زبردستی اونٹوں سے محنت لیتے تھے۔ ۲ جولائی کو دو اونٹ اس بیابان میں مرگئے۔

تین دن میں ہم نے یہ سفر جو نمونہ سقر تھا پورا کیا۔ تمازت آفتاب نے ہمارے اجزا بجز ڈھیلے کر دیئے تھے۔ ہمارے دو رفیق جن کے حیوان بہت

کمزور تھے - مجبوراً پا پیادہ چلتے رہے تھے - اِس مشقت کے سبب اُن کا پانی بہت جلد ختم ہو گیا - اور یہ اسقدر ظہیر اور ضعیف ہو گئے کہ نہ تو چل سکتے تھے اور نہ بیٹھ سکتے تھے - اِس لیئے ہمیں اُنکو اونٹوں کی پُشت پر رسیوں سے باندھنا پڑا - جب تک اِن بیچاروں میں طاقت گویائی رہی یہ پانی پانی پکارتے رہے - افسوس کہ اِن کے دلی دوستوں نے بھی اِس وقت اِن کو چند قطرہ پانی نہ دیا - اور جب ہم مدامی بلاغ میں پہنچے تو موت نے مہربان ہو کر ایک کو اُنمیں سے پیاس کی مصیبت سے نجات دلا دی - جس وقت اِس خدا کے بندے نے جان دی تو میں اُس کے پاس تھا - اُسکی زبان مطلق سیاہ ہو گئی تھی - اور اُسکا گلا سفید سنہری مایل تھا - خط و خال میں اُس کے فرق نہیں آیا تھا - صرف مرجھائے ہوئے ہونٹوں کے باعث مُنہ کُھلا پڑا تھا اِس مرض میں پانی سے جان بچنی شاید ناممکن تھی - مگر مجھے کئی دن تک یہ غم رہا کہ ایسی نازک حالت میں بھی کسی نے اسکو ایک قطرہ پانی کا نہ دیا - اِس لق و دق بیابان میں پانی اِس قدر پیارا ہوتا ہے کہ باپ بیٹے سے اور بھائی بھائی سے پانی چھپاتا ہے - پیاس کا ڈر ہم کو اِس فیاضی اور ایثار سے باز رکھتا ہے - جو اَور خطرات کے موقع پر اکثر ظہور پذیر ہوا کرتے ہیں -

خالاطہ کے بیابان میں پہاڑ بھی ہیں - یہاں سے سخت زمین شروع ہو جاتی ہے - لیکن ابھی وہ ہم سے دور تھی - ہمارے اونٹ چونکہ بہت کمزور ہو گئے تھے - اِس لیئے ہمیں اِس بیابان میں ایک دن اور قیام کرنا پڑا - اب میرے مشکیزے میں صرف چھ گلاس بھر پانی رہ گیا تھا - میں ایک قطرہ سے زیادہ نہ پیتا تھا - اِس لیئے ہر وقت پیاسا رہتا تھا

ایک دن میں نے سیاہ داغ اپنی زبان پر دیکھا۔ پھر تو میں ڈر گیا۔ اور نصف کے قریب پانی جو میرے مشکیزہ میں تھا میں نے پی لیا۔ اس وقت تو میں نے سمجھا کہ میں بچ گیا۔ مگر دوسرے دن درد سر اور حرارت نے مجھے آدبایا۔ اور جب دور سے نیلگوں بادلوں کے نیچے مجھے پہاڑ نظر آنے لگے تو میں نے جانا کہ میری طاقت رفتہ رفتہ مجھے جواب دینے لگی ہے۔ جوں جوں ہم پہاڑوں کے قریب ہوتے جاتے تھے۔ بیابان کی ریت کم ہوتی جاتی تھی۔ اور ہماری آنکھیں بڑی رغبت کے ساتھ مویشیوں کے گلوں اور چرواہوں کی جھونپڑیوں کی متلاشی تھیں۔ اتنے میں یکایک کسی نے کاروان باشی سے کہا دیکھو یہ طوفان گرد و باد چلا آتا ہے۔ کاروان باشی اسے دیکھکر ایسا خوف زدہ ہوا کہ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ یہ بگولہ دور سے ہماری طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ کاروان باشی نے خوف زدہ لہجے میں کہا" یہ تیاد (ہوا) ہے"۔ اس بگولہ کو دیکھکر ہم سب کے رنگ فق ہو گئے۔ اور ہم جلد جلد اونٹوں سے اُتر کر اُن کے نیچے چھپ گئے۔ اتنے میں یہ بگولہ ہمارے سروں پر آپہونچا۔ اس بگولہ کی خاک ہمارے چہروں پر گرم پانی کی طرح لگتی تھی۔ اور طرفتہ العین میں ہمارے چہروں پر ڈیڑھ ڈیڑھ انچہ ریت جم گئی۔ اگر یہ آندھی اس جگہ سے پانچ میل پیچھے ریگستان کے اندر آتی تو ممکن نہ تھا کہ ہم میں سے ایک بھی جان بر ہو سکتا۔ اس آندھی میں انسان کو بخار ہو جاتا ہے۔ اور قے آنی شروع ہو جاتی ہے۔ مگر شکر ہے کہ میں بچا رہا۔ تھوڑی دیر میں یہ بگولہ گذر گیا۔ اور ہم اپنے جانوروں کے نیچے سے نکلے۔ یہاں سے تین راستے بخارا کو جاتے ہیں۔ ہم نے وہ راستہ اختیار کیا جو سب سے نزدیک تھا۔ راہ میں سر شام ہمیں کئی کنوئیں ملے۔ مگر ان کا پانی اس قابل نہ تھا کہ انسان پی سکے۔ البتہ ہمارے مویشیوں نے وا لگو لگ

پانی پیا۔ اس وقت ہماری حالت دِگرگوں ہو رہی تھی۔ اگر ہم میں رمق بھر جان باقی تھی تو وہ اُمید کی بدولت تھی۔ جب ہم دوسرے پڑاؤ پر پہونچے تو بلا امداد دیگرے میں اونٹ سے اُتر نہ سکا۔ لوگوں نے مجھے نیچے اُتارا۔ اور زمین پر لٹا دیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ اور میرا سر درد سے پھٹا پڑتا تھا۔ ناظرین کچھ نہ پوچھئے کہ پیاس سے میں نے کسقدر تکلیف اُٹھائی۔ میں نے بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھائی تھیں۔ مگر پیاس کی تکلیف کے آگے یہ سب مصیبتیں ہیچ تھیں۔ یہاں میں اسقدر کمزور ہو گیا کہ مجھے اُمید نہ رہی تھی کہ میں رات بخیریت گذار سکوں۔ دوپہر کے وقت ہم پھر روانہ ہوئے اور میں سو گیا۔ ۱۰ جولائی کو جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ مَیں زمین پر ایک مٹی کی جھونپڑی میں پڑا ہوا ہوں۔ اور میرے گرد کئی دراز ریش آدمی کھڑے ہیں۔ میں نے پہچان لیا کہ یہ ایرانی ہیں۔ انھوں نے پہلے مجھے نیم گرم دودھ پلایا۔ پھر انھوں نے مجھے چھاچھ (جسکو یہ لوگ نمک۔ دودھ اور پانی سے بناتے اور "ایران" کہتے ہیں) پلائی۔ اور اِن دونوں کے اثر سے میں تندرست ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ ہم دو ایرانی غلاموں کے مہمان ہیں۔ جو بخارا سے ۴۰ میل کے فاصلے پر بھیڑوں کے گلّہ کی نگہبانی کے لئے رہتے ہیں۔ مگر اُن کو بہت تھوڑی روٹی اور پانی ملتا ہے تاکہ وہ کہیں بھاگ نہ جائیں۔ یہ ایرانی ہرچند کہ غلام تھے۔ مگر بڑے فیاض تھے۔ شیعہ ایرانی سنیوں کے نام سے بھاگتے ہیں۔ لیکن اِن غلاموں نے سنّی مولویوں کو آب و نان دے کر

مہربانی کا نام زندہ کر دیا۔ جب میں نے ان سے ان کی مادری زبان (فارسی) میں گفتگو کی تو یہ مجھ سے اور بھی زیادہ مہربانی سے پیش آنے لگے۔ ان میں میں نے ایک لڑکا دیکھا۔ جس کی عمر پانچ سال کی تھی۔ یہ بیچارہ بھی غلام تھا۔ دو سال ہوئے کہ وہ اور اُس کا باپ گرفتار ہو کر غلام بنائے گئے تھے۔ اس کے باپ نے روپیہ ادا کر کے اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا۔ اس لڑکے نے مجھے کہا کہ دو سال تک میرا باپ روپیہ کما لیگا۔ اور مجھے بھی آزاد کر لیگا۔ مجھے اس کے حال پر بڑا رحم آیا۔ بیچارے کے جسم پر ایک چیتھڑا بھی نہ تھا۔ اور اس کا رنگ ایسا تھا جیسے کمایا ہوا چمڑہ ہوتا ہے۔

فصل بست سوم

بخارا

۱۱- جولائی ہم بخارا میں داخل ہوئے۔ اور سیدھے ایک وسیع تکیہ میں چلے گئے۔ جس کے ارد گرد مربع شکل میں بہت سے درخت لگے ہوئے ہیں۔ اس مکان کی پہلی منزل میں چالیس کوٹھڑیاں ہیں۔ اس مکان کا منتظم یا متولی امیر بخارا کے دربار کا خاص مولوی تھا۔ اور کسی ولی کی اولاد میں سے تھا۔ حاجی صالح جو میرا بڑا دوست تھا کسی زمانہ میں اس متولی کا شاگرد رہ چکا تھا۔ اور بہ حیثیت شاگرد اُس نے میری اور خاص خاص آدمیوں کی ملاقات اپنے اوستاد سے کرائی۔ متولی صاحب ہم سب سے ملاقات کرکے بہت خوش ہوئے۔ اور مجھسے آدھ گھنٹہ گفتگو کرکے تو اسقدر باغ باغ ہوئے کہ بلند آواز سے حاضرین کو مخاطب کرکے کہا کہ افسوس ہے۔ خودبدولت امیر بخارا اسوقت بخارا میں موجود نہیں ہیں۔ ورنہ اُن کو ابھی اُن کی خدمت میں لیجاتا۔ اُس نے فوراً حکم دیا کہ مسجد کے پاس ایک عمدہ کوٹھری میرے لئے علیحدہ خالی کیجائے۔

اس کوٹھڑی میں ایکطرف میرا پڑوسی حاجی صالح اور دوسری طرف ایک فاضل مولوی تھا۔ اس تکیہ میں بڑے بڑے ملا رہتے تھے۔ میری یہاں بہت جلد شہرت ہو گئی۔ اور شہر کے سرکاری پرچہ نویس نے میرے آنے کی خبر اس طرح شایع کی جیسے کوئی بہت بڑا اجنبی شخص اس شہر میں وارد ہوا ہے۔

امیر رحمت بئیےلہ افسر اعلیٰ و سپہ سالار امیر بخارا تھا جو امیر صاحب کی عدم موجودگی میں جو خوقند کی طرف کسی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ انکا جانشین تھا۔ اس نے میری بابت حالات دریافت کرنے چاہے لیکن یہ تکیہ جہاں ہم مقیم تھے امیر کے حدود اختیارات سے باہر ہے۔ اس لئے اُس کے آدمی کی کسی نے پرواہ بھی نہ کی۔ اور اُس کے آدمی کا آنا ایسی معمولی بات سمجھی گئی۔ کہ مجھسے اُسکا ذکر بھی نہ کیا گیا۔ کہ امیر صاحب کے سپہ سالار کا آدمی آیا تھا اور تمہاری بابت پوچھتا تھا۔ جب کبھی میرا ذکر آتا تھا تو میرے دوست میری بابت یہ کہتے تھے "حاجی رشید نہ صرف پکا مسلمان ہے بلکہ فاضل ملا ہے۔ اس لئے جو کوئی اُس کی نسبت شک دل میں لاتا ہے۔ وہ سخت گناہ کرتا ہے۔

دوسرے دن میں۔ حاجی صالح اور چار اور درویش شہر کی سیر کو نکلے۔ اگرچہ بخارا کے مکانات اور گلیاں جنمیں ایک ایک فٹ ریت چڑھی ہوئی تھی۔ مجھے چنداں پسند نہ آئے۔ مگر جب میں بازار میں داخل ہوا

لہ معلوم نہیں یہ نام صحیح کس طرح ہے۔ انگریزی کتاب میں Rahmet Bi (رحمت بئیے) لکھا ہے۔ جو غالباً صحیح نہیں۔ کیونکہ بی۔ یا بائی کسی مسلمانی یا ترکی نام کا جزو نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے رحمت بئیے لکھا ہے۔

تو وہاں کے ہجوم نے میرے دل پر عجیب اثر کیا۔ بازار کی خوشنمائی اور دولت نے مجھے اسقدر تعجب میں نہیں ڈالا جسقدر وہاں کے مختلف لباس۔ اطوار اور قومیت کے بیشمار اشخاص کی جماعتوں نے مجھے متعجب کیا۔ یہاں ہر قسم کا تجارتی سامان موجود تھا۔ اور طرح طرح کے آدمی خرید و فروخت میں مشغول تھے۔ زیادہ تر اس شہر میں ایرانی مجھے نظر آئے۔ لیکن تاتاری۔ اُزبک اور کرغیز بھی جابجا میں نے دیکھے۔ کرغیز اور تورانی ایرانیوں سے نقش و نگار سے پہچانے جا سکتے تھے۔ یہودی اور ہندوستان کے باشندے بھی کثیر تعداد میں میں نے دیکھے۔ میں نے دزدیدہ نگاہ سے ان دوکانوں کا اسباب بھی دیکھا۔ اس اسباب میں مغربی یورپ کی مجھے کوئی شئے نظر نہ آئی البتہ روس کی اشیا کثرت سے موجود تھیں۔ بخارا کے بازار میں بخارا کی ساختہ اشیاء کے لئے ایک مقام علیحدہ مخصوص ہے۔ اور اس مقام میں زیادہ تر کرغیز۔ قپچاق۔ قلماق اور چینی تاتار کے باشندے خرید و فروخت کرتے ہیں

اس بازار میں تین گھنٹے تک ہم نے اِدھر اُدھر چکر لگائے۔ آخر کار میں اسقدر تھک گیا۔ کہ میں نے حاجی صالح کو کہا کہ بھئی کہیں بیٹھکر سستانا چاہیے وہ مجھے چائے بازار میں دیوان بیگ کے تالاب پر لے گیا۔ یہاں چوک میں ایک تالاب تھا جسپر نیم کے درخت کا سایہ تھا۔ اس تالاب کے ارد گرد چائے کی دوکانیں تھیں۔ جنپر بڑے بڑے سماوار جو روس میں خاص طور پر بخارا کے لئے بنتے ہیں موجود تھے۔ کئی دوکانوں پر مٹھائی بھی چنی ہوئی تھی اور میوے رکھے ہوئے تھے۔ اور یہاں بھوکوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ اس جگہ ایک طرف ایک مسجد بھی ہے۔ جس کے محاذ میں درویش اور مدح خواں (قصہ گو) گلے پھاڑ پھاڑ کر بزرگان اسلام کے کارنامے لوگوں کو سناتے ہیں۔ اسجگہ میں نے پندرہ کے قریب نقشبندی درویش دیکھے۔

یہ خانقاہِ نقشبند سے آرہے تھے۔ اور عجیب طرح پر اِدھر اُدھر جست وخیز کرتے جاتے تھے۔ ان کے سر پر اونچی ٹوپیاں تھیں۔ اور ان کے بال لمبے لمبے تھے۔ انکا سفید ریش سرگروہ پہلے بلند آواز سے کچھ گاتا تھا۔ اور پھر یہ سب ملکر اُسے یکبارہ دُہراتے تھے۔

بخارا میں میرا لباس بھی انہی نقشبندی درویشوں کا سا تھا۔ تمازت آفتاب کے باعث میری صورت اسقدر متغیر ہوگئی تھی کہ اگر میری والدہ ماجدہ بھی مجھے اس وقت دیکھتیں تو ہرگز نہ پہچان سکتیں۔ میرے عمامہ اور جبّہ سے اور نیز قرآن سے جو میں حمائل کئے ہوئے تھا لوگ مجھے بڑا بھاری شیخ سمجھتے تھے۔ اور بار بار مجھسے مصافحہ اور معانقہ کرتے تھے۔ ان جنگلیوں سے میں بہت جلد تنگ آگیا بخارا میں کسی نے مجھ پر شک نہ کیا۔ حالانکہ یہاں کے باشندے بڑے چالاک اور عیار ہیں۔ میں نے یہاں جا بجا وعظ کیا مگر کسی نے مجھے کوڑی نہ دی۔

لوگوں نے تو مجھ پر کسی قسم کا شبہہ نہ کیا۔ مگر حکام کے دل میں شبہہ ضرور تھا۔ نائب امیر رحمت بے نے خود تو اپنا شبہہ براہِ راست ظاہر نہ کیا لیکن میرے پیچھے جاسوس لگا دیئے جو ہر وقت میرے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ اور اکثر فرنگستان کا ذکر چھیڑتے رہتے تھے۔ تاکہ سہواً میرے منہ سے کوئی کلمہ نکلے۔ اور میری گردن ناپیں۔ مگر اس امتحان میں میں پورا اُترا۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ اس طرح کام نہیں چلتا تو اُنہوں نے مجھے ڈرانا چاہا۔ اور کہا کہ فرنگیوں کا مدت سے بخارا پر دانت ہے۔ حال میں چند اٹلی کے باشندے آئے تھے۔ اور چند صندوق چائے کے لائے تھے۔ جن میں ہیرے کی راکھ تھی۔ وہ اس مقدس شہر کے تمام باشندوں کو زہر دے کر ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ مگر پکڑے گئے۔ اور اُن کو ایسی سخت سزا دی گئی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔

یہ جاسوس عموماً وہ حاجی تھے جو قسطنطنیہ میں رہ آئے تھے۔ جب

میں نے دیکھا کہ یہ میرا امتحان لیتے ہیں۔ اور جان جان کر ہر بار فرنگستان کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ تو میں نے اور حکمت کھیلی۔ میں نے ایسا منہ بنا لیا جیسے کہ میں سخت ناراض ہوں۔ اور کہا کہ انہی فرنگیوں سے بچنے کے لئے تو میں یہاں آیا ہوں۔ شکر ہے کہ اب میں پاک شہر میں داخل ہو گیا ہوں اور نہیں چاہتا کہ اپنا وقت ان ناپاک لوگوں کے ذکر میں ضائع کروں۔

ایک دن رحمت بے کا ایک ملازم میرے پاس ایک دبلا پتلا آدمی لایا۔ اور مجھے کہنے لگا کہ حضور نے کہا ہے کہ اس کا امتحان لو اور دیکھو کیا واقعی یہ عرب ہے! اور دمشق سے آتا ہے۔ میں نے اُس کی صورت دیکھی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی یورپین ہے۔ پھر جب میں نے اُس سے عربی زبان میں گفتگو کی تو اُس کے لب و لہجہ سے مجھے ثابت ہو گیا کہ وہ اعرابی نہیں ہے۔ اس شخص نے مجھے کہا کہ میں چین میں کسی ولی کی خانقاہ کی زیارت کے لئے چلا ہوں۔ مگر میں سمجھ گیا کہ یہ بھی غالباً وہی حکمت عملی کر رہا ہے جو میں کر رہا ہوں۔ افسوس یہ شخص پھر مجھے نہ ملا۔

جب سپہ سالار بخارا نے دیکھا کہ جاسوسوں کے ذریعہ میں اُسکے قابو نہ آیا تو اُس نے میری دعوت کی۔ اور کہلا بھیجا کہ میرے ہاں پلاؤ تناول کرو۔ میں اُس کے مکان پر گیا۔ اور وہاں جا کر میں نے دیکھا کہ بخارا کے تمام علما موجود ہیں۔ رحمت بے نے اُن کو اس لئے پہلے جمع کیا تھا۔ کہ میری نسبت رائے لگائیں۔ مگر میں نے اُن کو امتحان لینے کا موقعہ ہی نہ دیا میں نے اُن سے چند دقیق مسائل متعلق مذہب اسلام دریافت کئے۔ اور اس بارہ میں اُن میں بقدر قیل و قال اور مباحثہ ہوا کہ شور مچ گیا۔ میں چپکا بیٹھا سنتا رہا۔ اور آخر میں میں نے کہا کہ بخارا کے علما علم و فضل میں علمائے قسطنطنیہ سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں۔

میرا جادو چل گیا اور علمانے اشاروں سے رحمت بے کو سمجھا دیا کہ پرچہ نویس کا زُعم باطل ہے۔ اور یہ شخص بے شک درویش ہے۔

جن ایام میں میں بخارا میں تھا۔ گرمی کی بڑی شدت تھی اور میں بار بار گرم پانی پیا کرتا تھا تاکہ کہیں مجھے مرض رشتہ عارض نہ ہوجائے۔ شہر کے دسویں حصّہ کو یہ بیماری تھی۔ یہ عجیب مرض ہے کہ پہلے پاؤں میں یا کسی اور عضو بدن میں خارش شروع ہوکر ٹیس پڑنے لگتی ہے پھر ایک سُرخ داغ پڑ جاتا ہے۔ اور اُس داغ کے وسط میں سے ایک کیڑا تاگے کی شکل کا نکلتا ہے۔ جو کئی گز لمبا ہوتا ہے۔ اگر یہ کیڑا آہستہ آہستہ نکال لیا جائے تو درد نہیں ہوتا۔ لیکن اگر نکالنے میں ٹوٹ جائے تو پھر سخت تکلیف ہوتی ہے اور ایک ہفتے تک انسان صاحب فراش ہوجاتا ہے۔ جو لوگ صاحب حوصلہ ہیں وہ فوراً چیرا دلوا کر اُس کیڑے کو نکلوا دیتے ہیں۔ بخارا کے جراح اِس فن میں بڑے چابکدست ہیں جب چیرا دیکر کیڑا نکال دیا جاوے تو زخم تھوڑی سی دیر میں اچھا ہوجاتا ہے۔

بخارا میں دریائے زرافشان کا پانی تالابوں کے ذریعہ سے آتا ہے۔ یہ تالاب نہر سے پانی حاصل کرتے ہیں جو اِس دریا سے نکالی گئی ہے نہر کافی عمیق ہے۔ مگر صاف نہیں ہے۔ پہلے اِسمیں انسان غوطے لگاتے ہیں اور غسل کرتے ہیں۔ پھر گھوڑے مویشی گدھے نہاتے ہیں جب انسان اور حیوان غسل کرچکتے ہیں تو پھر یہاں جانیکی ممانعت ہوجاتی ہے۔ اور پانی کھڑا ہوکر کسیقدر صاف ہوجاتا ہے۔ مگر اِس کا گدلاپن بالکل نہیں جاتا۔

وسط ایشیا کے جنگلوں میں چونکہ مینے بہت تکلیف اُٹھائی تھی اِس لیئے

بخارا مجھے ممالک یوروپ کا سا معلوم ہونے لگا۔ یہاں مینے اپنے لیئے دو پیرہن سلوا لیئے۔ اور آرام سے رہنے لگا۔ بخارا میں مجھے گرم گرم روٹی۔ چاء اور میوے ملجاتے تھے۔ اس لیئے جب میرے ہمراہیوں نے کہا کہ اب یہاں سے چلنا چاہیئے۔ تاکہ جاڑے سے پہلے ہم اپنے اپنے وطن میں پہنچ جائیں۔ تو مجھے یہاں سے نکلنا ناگوار سا معلوم ہوا۔ بہر حال مینے دل میں سوچ لیا کہ سمرقند تک جہاں امیر آج کل تھا۔ انکا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ کیونکہ یہہ حاجی میرے بہت کارآمد تھے۔

سمرقند جاکر میں نے دل میں ٹھان لیا کہ یا تو انکے ساتھ قوقند اور کاشغر جاؤں گا۔ یا براہ ہرات طہران کو واپس جاؤں گا۔ حاجی بلال اور حاجی صالح نے مجھے اصرار سے کہا کہ ہمارے ساتھ رہو۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ شاید میرا ارادہ سمرقند میں جاکر بدل جائے۔ انہوں نے میری ملاقات ملا زمان سے کرائی۔ یہہ ایک کارواں باشی ہرات کا رہنے والا تھا۔ اور آجکل ڈیڑھ سو اونٹوں کے ساتھ بخارا میں مقیم تھا۔ مینے ملا زمان کو کہدیا کہ اگر میرا ارادہ سمرقند جاکر واپس ہونے کا ہوا تو میں تم کو کرکی میں ملونگا۔

ملا زمان سے میری ملاقات ایک کارواں سرائے میں ہوئی تھی۔ جہاں غلام برائے فروخت لائے جاتے ہیں۔ ترکمان قزاق جب ایرانیوں کو پکڑ کر لیجاتے ہیں۔ تو ضرورت کے باعث کسی امیر ترکمان کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں پھر یہ امیر ترکمان بہت سے غلام جمع کرکے بخارا میں لیجاتا ہے۔ اور وہاں نفع لیکر فروخت کر دیتا ہے۔ یہہ ترکمان پہلے تو آپ غلاموں کو بیچتا ہے جب دیکھتا ہے کہ کچھ باقی رہ گئے ہیں اور نہیں بکتے تو وہ دلال کی معرفت باقیماندہ کے ٹکے کھرے کرتا ہے۔ خیوا اور بخارا کی منڈی میں تین سال سے

لیکر ساٹھ سال کی عمر کے غلام ہر وقت انسان خرید سکتا ہی۔ مسلمانوں کے مذہب میں لکھا ہے کہ اگر غلام بناؤں تو کافروں کو بناؤں۔ مگر بخارا کے ریاکے لوگ اس حکم کو ٹال دیتے ہیں۔ علاوہ بریں جو سنی ہیں وہ شیعوں کو کافر کہتے ہیں۔ لیکن لطف تو یہ ہے کہ شیعہ ہی غلام نہیں بنائے جاتے۔ بلکہ یہ سنیوں کو بھی پکڑ لاتے ہیں۔ اور جب بیچنے لگتے ہیں تو سنیوں کو طرح طرح کے عذاب دیکر اُنسے یہ کہلواتے ہیں کہ کہو ہم سنی نہیں ہیں شیعہ ہیں۔

جس وقت غلام بیچنے والا غلام منڈی میں لاتا ہے تو خریدنے والے اسکو اچھی طرح سے دیکھتے ہیں تاکہ اُنمیں کوئی نقص جسمانی نہ ہو۔ غلام فروش کے پنجہ سے غلام کا آزاد ہونا اُسکے لیئے بہشت میں جانا ہوتا ہے چاہے اُسکا نیا آقا کیسا ہی ظالم ہو۔ مگر غلام فروش جیسی تکلیف اُسے نہیں دیتا۔ غلاموں کی قیمت پولیٹیکل حالت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ آج کل عموماً تندرست غلام کی قیمت چالیس سے لیکر پچاس طلا[ل] تک ہوتی ہے (یعنے دو پونڈ دس شلنگ سے لیکر تین پونڈ تک) لیکن جب کثرت سے غلام آجائیں تو کم بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً جب ایرانیوں کو مرو کے پاس شکست ہوئی تھی اور دس ہزار ایرانی قید ہوگئے تھے تو اُس وقت تین تین اور چار چار طلائے بخاری کو غلام ملسکتا تھا۔ شکر ہے کہ اب اس مکروہ تجارت میں تخفیف ہوتی جاتی ہے۔ اور ایک دن وہ آنیوالا ہے کہ جب وسط ایشیا سے بردہ فروشی بالکل نیست و نابود ہو جائیگی۔ اسبارہ میں ہمیں روس کا ممنون ہونا چاہیئے کہ جس نے نہ صرف اپنے ایشیائی مقبوضات میں غلامی کو روکدیا ہے۔ بلکہ ان ممالک میں بھی ممانعت کر دی ہے جو اُسکی زیر حفاظت ہیں۔ اب

ل ساڑھے سینتیس ہندوستانی روپئے سے پینتالیس روپئے تک ۱۲

اب ترکمان بھی جو مشہور رسارقان حیوانات و انسان تھے۔علانیہ ایران پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔

جب مجھے بخارا میں رہتے اٹھارہ دن ہوگئے تو میرے رفقانے کہا کہ اب زیادہ ہم یہاں ٹھہر نہیں سکتے۔چنانچہ ہم نے سمرقند کی طرف جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔بخارا میں لوگ کچھ دینا نہیں جانتے۔انکو صرف مصافحہ کرنا آتا ہے۔اِس لیئے ہماری تھیلیاں بھی خالی ہو چلی تھیں۔ہم نے مجبوراً اپنے مویشی بیچ ڈالے۔اور ایک گاڑی کرایہ کر کے روانہ ہوئے کئی ہمارے رفقا یہیں سے اپنے گھروں کو رخصت ہوگئے۔

جب روانگی کے وقت میں رحمت بے کو ملنے گیا تو اُس نے مجھے ایک خط لکھدیا۔اور وعدہ کیا کہ تم کو ضرور امیر کی ملاقات نصیب ہوگی۔

بخارا سے جو راستہ سمرقند کو جاتا ہے وہ زیادہ تر کاشت شدہ کھیتوں اور آباد دیہات میں سے گذرتا ہے۔راہ میں ہم نے پانچ منزلوں میں قیام کیا۔جوں جوں میں سمرقند کے قریب پہنچتا گیا میرا شوق زیادہ ہوتا گیا۔یہ شہر کوہ چوبانا تا کے دامن میں واقع ہے۔یہ پہاڑ یہیں دور سے دکھائی دینے لگا۔اور جب ہم اُس کے اوپر چڑھ گئے تو امیر تیمور کا شہر آفتاب صبح کی روشنی میں آنکھوں کو نہایت پیارا پیارا معلوم ہونے لگا۔اُس وقت صبح کا سہانا سماں تھا۔اور اِس شہر کے بیشمار قبے اور گنبد اور مینار انواع و اقسام کے رنگوں میں نظر آرہے تھے۔

فصل بست وچہارم

سمرقند

تاجیک ابھی تک اِس اعتقاد پر جمے ہوئے ہیں کہ سمرقند تمام جہان کا مرکز ہے۔ بہرحال اِسمیں شک نہیں کہ وسط ایشیا کے شہروں میں قدیمی یادگاروں عالیشان مسجدوں اور مشہور مزاروں کے لحاظ سے یہ شہر بے نظیر ہے۔ حجاج اِس شہر میں ایک کاروان سرائے میں اُترے۔ اور یہاں اُنسے کچھ کرایہ نہ لیا گیا۔ لیکن میں جس دن اُس شہر میں پہنچا اُسی دن ایک شخص کے ہاں مہمان جا رہا۔ اُس شخص کا مکان امیر تیمور کی قبر کے پاس تھا۔ یہ شخص ناظم محل امیر بخارا تھا۔ امیر خوقند سے مظفر و منصور سمرقند میں بہت جلد واپس آنے والا تھا۔ میرے رفقا نے بڑی مہربانی سے منظور کیا کہ امیر کے آنے تک ہم یہیں رہتے ہیں۔ اور پھر تمہاری واپسی کا انتظار کرکے ہم آگے جائیں گے۔ اِس اثناء میں مینے اولیاؤں کے مزار دیکھنے شروع کیئے۔ اس شہر میں قریب سو کے مزار ہیں۔ اور اِن مزاروں کی زیارت بہ لحاظ تقدس مرحوم کے بعد دیگرے کی جاتی ہے۔ چونکہ میں یہاں حاجی بنا ہوا تھا۔ مینے بھی حسب دستور پہلے بڑے بڑے اور پھر چھوٹے چھوٹے اولیاؤں کی

خانقاہوں کی زیارت بڑی سرگرمی سے کی۔ اِس موقع پر میں صرف مسجد امیر تیمور کا ذکر کرونگا۔ یہ ایک بڑا قلعہ ہے۔ اِس کے ایک بڑے دالان میں "گوک تاش" یعنے وہ سبز پتھر موجود ہے جسپر امیر تیمور نے اپنا تخت رکھوایا ہوا تھا۔ یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب امیر تیمور کو صاحبقران عصر کہتے تھے۔ اور دور دور سے باجگذار اِس دالان میں جمع ہوتے تھے۔ اور جبکہ ہر وقت تین سو سوار اِس دالان کے روبرو کھڑے رہا کرتے تھے۔ تاکہ بادشاہ کے حکم کو آن کی آن میں دور دور از مقام تک پھیلا دیں۔ امیر تیمور کی قبر اور اُس کے مدرسے بھی قابل بیان ہیں۔ ان مدارس کے ایک حصّہ میں اب لوگوں نے رہائشی مکانات بنائے ہوئے ہیں۔ اور کئی مدرسے اِس وقت گرنے والے ہو رہے ہیں۔ خانم کا مدرسہ جو کسی زمانہ میں بڑا مشہور تھا۔ جس زمانہ میں میں وہاں تھا۔ نہایت خستہ حالت میں تھا۔ میں نے یہاں تلاش کی کہ شاید مجھے اِس کتب خانہ کا کچھ پتہ ملجائے۔ جو تیمور یونان اور آرمینیا سے لایا تھا۔ مگر افسوس کہ مجھے کامیابی نہ ہوئی۔

جن ایام میں میں سمرقند میں تھا۔ بازاروں میں اکثر بھیڑ لگی ہوئی ہوتی تھی۔ اور اُسمیں زیادہ تر سپاہی ہوتے تھے۔ جو مہم سے واپس آرہے تھے۔ اِس شہر کی آبادی پندرہ یا بیس ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ اِنمیں دو تہائی اُزبک اور ایک تہائی تاجیک ہیں۔ چونکہ سمرقند کی آب وہوا اچھی ہے۔ اِس لیئے امیر بخارا دو تین ماہ موسم گرما میں ضرور یہاں بسر کرتا ہے۔

سمرقند میں آئے مجھے آٹھ یوم ہو گئے تھے۔ یہاں میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اب ہرات کے رستہ یورپ کو واپس ہوں گا۔ حاجی بلال کا منشاء تھا

کہ مجھے اکسو تک اپنے ہمراہ لیجائے۔ اُس نے کہا کہ میں تجھے یارقند تبت اور کشمیر کے رستہ مکہ بھیجدوں گا۔ اور اگر خدا کو منظور رہوا تو کوملی کے رستہ پیکین پہنچا دونگا۔ مگر حاجی صالح اس مشورے کے مخالف تھا۔ اُس نے کہا کہ اکسو تک تو راہ میں مسلمان ہیں۔ وہ تمہاری مدد کریں گے لیکن اس سے آگے کافر ہیں۔ مانا کہ وہ تمہیں کچھ تکلیف نہ پہنچائیں گے مگر وہ تمہاری مدد بھی نہ کرینگے۔ اسلیئے اس حالت میں بیک بینی و دوگوش وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کہ جنکے ساتھ تمہاری ملاقات کرادیگئی ہے تم واپس چلے جاؤ۔ کچھ عرصہ تک میں دودلا رہا۔ اگر میں پیکین میں قدیمی تاتاریوں۔ کرغیزوں منگولوں اور چینیوں کے بیچ میں سے گذرکر کہ جہاں مارکوپولو کو بھی جانے کی جرأت نہ ہوئی تھی جا پہنچتا تو مجھ سے بڑھکر کوئی بہادر نہ تھا۔ لیکن مینے یہی مناسب سمجھا کہ اب اعتدال سے کام لینا چاہیئے۔ جسقدر تجربہ حاصل کیا ہے وہی کافی ہے۔ اب بے سوچے سمجھے آفت کے منہ میں جانا اچھا نہیں۔ یہ سوچکر میں نے پکا ارادہ واپس جانیکا کر لیا۔

جب سمرقند سے چلنےکی میں نے پوری تیاری کرلی تو امیر صاحب سمرقند میں تزک و احتشام کے ساتھ تشریف لائے۔ اُنکے آنے کی خبر سُنکر ریگستان میں بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔ مگر میں نے اس جلوس میں کوئی عجیب و غریب رونق نہ دیکھی۔ سب سے آگے دو سو شیرباز بخارا کی وردی پہنے ہوئے تھے اُنکے پیچھے سوار جھنڈے اور باجہ اُٹھائے ہوئے تھے اور اُنکے پیچھے امیر مظفر الدین خاص مصاحبوں کے حلقہ میں تھے۔ امیر کی عمر ۴۲ سال کی تھی۔ اُس کا قد میانہ تھا۔ مگر جسم مضبوط تھا۔ امیر کے چہرہ سے خندہ پیشانی کے آثار نمودار تھے۔ اُسکی آنکھیں سیاہ تھیں۔ اور چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔

امیر کے پیچھے قپچاق تھے۔ اُنکے چہروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ منگولین ہیں۔ انکے ہاتھوں میں تیر و کمان تھے اور پسِ پشت ڈھالیں لٹکتی تھیں۔

جب امیر صاحب تشریف لائے۔ تو اُنہوں نے اپنی واپسی کی خوشی میں کئی دیگیں پلاؤ کی پکوائیں۔ ایک ایک دیگ میں کئی کئی بوریاں چاولوں کی اور تین تین بھیڑیں ذبح کرکے اور صاف کرکے ڈلوائی گئیں۔ اور اس قدر چربی ڈالی گئی کہ جس سے کئی تنبیاں بن سکتی تھیں۔ پلاؤ میں گاجریں بھی ڈالی گئی تھیں۔ جب پلاؤ پک کر تیار ہوگیا تو فقیروں کی بھیڑ لگ گئی۔

دوسرا دن "عرض" دیکھنے دربارِ عام کے لیئے مقرر تھا۔ اِس موقعہ کو مینے غنیمت سمجھا اور اپنے رفقا کو لیکر امیر صاحب کے سلام کے لیئے شہر میں داخل ہوا۔ لیکن راہ میں ہمیں ایک "محرم" ملا اور اُسنے کہا کہ "خود بدولت ~~تمہیں~~ تم سے تنہا ملنا چاہتے ہیں۔ اِس پیغام سے میرے رفقانے یہ نتیجہ نکالا کہ ظاہرا بہتری کی صورت نہیں ہے۔ مگر قہر درویش برجان درویش میں تنہا محرم کے ساتھ ہولیا محرم مجھے شاہی مکان میں لیگیا۔ اُس وقت امیر ایک سُرخ مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ مینے پہلے قرآن سے سورۂ فاتحہ پڑھی۔ پھر دعا مانگی اور آمین کہی۔ امیر نے بھی آمین کہی۔ آمین کہکر میں امیر کے پاس مسند پر جا بیٹھا۔ امیر نے مجھے یہ نہ کہا تھا کہ بیٹھ جاؤ وہ میری اِس جسارت سے متعجب ہوا۔ مگر مینے کوئی بات خلافِ شانِ درویشان نہ کی تھی۔ امیر نے میری طرف ایسی نظر سے دیکھا۔ جس کے معنے یہ تھے کہ وہ مجھے گھبرانا چاہتا ہے۔

امیر۔ "حاجی میں سنتا ہوں تو روم سے آیا ہے اور بہاءالدین اور دیگر اولیاؤں کی خانقاہوں کی زیارت کرنا چاہتا ہے۔"

میں۔ "حضور نے سچ فرمایا۔ مگر ساتھ ہی میں آپکے جمالِ جہاں آرا کی زیارت

بھی کرنا چاہتا تھا۔
امیر۔ "تعجب کی بات ہے۔ کیا تیرا اور کوئی مطلب اس قدر دور و دراز سفر کرنے میں نہیں ہے"؟
میں۔ "اور کوئی مطلب نہیں صرف بخارا اور سمرقند دیکھنے کا شوق تھا۔ جنکی نسبت شیخ جلال الدین کا قول ہے کہ یہاں آدمیوں کو سر کے بل چلنا چاہئیے علاوہ بریں جہاں گشت ہوں اور یہی میرا کام ہے"۔
امیر۔ یہ عجیب ہے کہ تو اس لنگڑی ٹانگ کے ساتھ جہانگشتی کرتا ہے۔
میں۔ مجھے ادبی معاف۔ آپ کا بزرگ تیمور بھی اعرج تھا۔ مگر وہ جہانگیر ہو گیا
پھر امیر نے مجھ سے پوچھا کہ سمرقند اور بخارا کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے میں نے رائے ظاہر کی اور کئی اشعار فارسی زبان کے پڑھے۔ ان اشعار کو سن کر وہ خوش ہوا۔ کیونکہ وہ خود بھی ملّا تھا اور عربی زبان میں بخوبی گفتگو کر سکتا تھا۔ لیکن ابھی تک مجھے یہ یقین نہ تھا کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ اور پھر امیر نے آہستہ سے ایک خدمتگار کو کچھ کہا۔ اور پھر مجھے اشارہ کیا کہ اسکے پیچھے جاؤ۔
میں فوراً اٹھکر اس خدمتگار کے پیچھے ہولیا۔ یہ مجھے کئی پیچدار رستوں سے کئی کمروں میں گذر کر ایک تاریک دالان میں لیگیا۔ اور کہنے لگا کہ یہاں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہکر وہ تو چلا گیا۔ مگر جو کیفیت میرے دل کی تھی وہ میں ہی جانتا ہوں۔ طرح طرح کے پراگندہ خیالات میرے دلمیں اٹھنے لگے اور موت میری آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ خدمتگار واپس آیا اور اسکے ہاتھوں میں آلہ قتل کی بجائے ایک گٹھری تھی جو اس نے مجھے دی۔ اسمیں ایک پُر تکلف خلعت اور کچھ نقدی تھی جو امیر نے بطور تحفہ مجھے عطا کی تھی۔

یہ گھڑی ایک میں نے اپنی جان کی سلامتی کا شکر ادا کیا اور سیدھا اپنے رفقا کے پاس پہنچا۔ وہ میری کامیابی پر بہت خوش ہوئے۔ اصل معاملہ یہ تھا کہ رحمت بے نے ایک ذومعنی رپورٹ میری نسبت بھیجی تھی جس سبب سے امیر کے دل میں شک پیدا ہوا۔ لیکن جب اُسنے مجھ سے گفتگو کی تو خدا میری زبان کا بھلا کرے کہ اسکی وجہ سے اُسکا شک و شبہ رفع ہو گیا۔

میرے رفقا نے مجھے نصیحت کی کہ اب بخارا میں تمہارا ٹھہرنا اچھا نہیں۔ یہاں سے جلد دریائے آکسس (جیحون) کے پار چلے جاؤ۔ اور قرشی میں بھی قیام نہ کرو۔ تم براہ راست ساریق ترکمانوں میں جو بڑے مہمان نواز ہیں چلے جاؤ وہیں وہ قافلہ آ جائے گا جو ہرات کو جانے والا ہے۔ مینے ان رفقا کی نصیحت قبول کی۔ اب جدائی کا وقت آ گیا۔ قلم میں طاقت نہیں کہ اس نظارہ کا نقشہ کھینچ سکے۔ چھ ماہ تک ہم اکٹھے رہے تھے۔ اس چھ ماہ کے عرصہ میں ہم نے جنگل و بیابان میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ اور بھوک اور پیاس کی سختیاں اُٹھائی تھیں۔ اس وقت ہم ایک دوسرے کو ایسا سمجھتے تھے جیسے ہم ایک ہی کنبے کے لوگ ہیں قومیت اور عمر کا فرق جو عارضی اختلاف ہوتے ہیں معدوم ہو چکا تھا اور مجھے اُنکی جدائی کا سخت صدمہ تھا۔ زیادہ تر مجھے یہ افسوس تھا کہ اس مفارقت کے وقت بھی مینے اُنکو اپنی اصلیت سے آگاہ نہ کیا۔ اور دل میں کھوٹ رکھا۔ ناظرین جو لوگ اِن مسلمانوں کے تعصب سے واقف ہیں۔ اور اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر میں ایسا کرتا تو کس آفت میں پڑتا مجھے معاف کریں گے اور میری حمایت کرینگے کہ اگر مینے اپنے آپ کو ایسے رفیقوں سے بھی جنہوں نے میری جان بچائی تھی چھپایا تو کچھ بُرا نہیں کیا۔

فصل بست و پنجم

سمرقند سے ہرات تک

اب جو لوگ میرے رفیق ہوئے وہ توقند کے مسافر تھے۔ انکا میرا بہت عرصہ تک ساتھ نہیں رہا۔ لیکن میں نے اپنا تعلق ایک نوجوان مُلا سے بڑھایا جو کتنگرات سے آ رہا تھا۔ اس نوجوان کا نام اسحاق تھا اور میرے ساتھ مکہ جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ ایک نیک نہاد و لبشر تھا۔ اور چونکہ میری طرح غریب تھا ہر وقت میری خدمت کر کے مجھے ممنون کرنا چاہتا تھا۔

سمرقند سے جو سڑک جاتی ہے وہ بخارا کو جانے والی سڑک سیدہ میں اس پہاڑی تک چلی گئی ہے۔ جہاں کھڑے ہونے سے شہر نظر آتا ہے۔ دوسرے دن ہم بیابان میں داخل ہوئے۔ مگر یہ بیابان ایسے وحشت خیز بیابانوں کے مقابلہ میں جو ہم نے پہلے دیکھے تھے۔ ایک وسیع سبزہ زار تھا۔ راہ میں میں نے کئی کنوئیں اور خانہ بدوش اُزبکوں کے خیمے دیکھے۔ یہ کنوئیں بڑے عمیق تھے اور انکے ساتھ ساتھ تالاب بھی تھے کہ جن سے وحشی پانی پیکر سیراب ہوتے تھے۔ اس جگہ گڈریئے خود پانی کنوئیں سے نہیں نکالتے بلکہ ایک سرا اُس کا چرخ کے اوپر رکھکر چرس کی کمر میں باندھ دیتے ہیں۔ اور خچر سے پانی کھنچواتے ہیں۔ اس جگہ کنوؤں کے اردگرد پھیر و مل

کے گلے۔ اور گدھے ریوں کو آرام کرتا دیکھکر مجھے ہنگری کے پست میدان یاد آگئے۔ اگلے دن اُس جگہ ایک تالاب پر ہمیں ایک قافلہ ملا جو قرشی سے آرہا تھا۔ اِس قافلہ کے ساتھ ایک عورت تھی جو نالہ و بکا کر رہی تھی۔ اسکو اُس کا شوہر ایک بوڑھے تاجیک کے ہاتھ فروخت کر گیا تھا۔ اور اُس جنگل میں آکر اُسکو اصل حال معلوم ہوا۔ مجھے دیکھکر وہ دیوانہ وار میرے پاس دوڑی آئی۔ اور رونے لگی۔ حاجی صاحب بتائیے ہمارے مذہب میں کہاں لکھا ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو جو بچوں کی ماں ہو اِس طرح بیچ ڈالے۔ میں نے ہر چند تاجیک کو سمجھایا کہ یہ کبیرہ گناہ ہے۔ مگر اُس نے صرف مسکرا دیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرشی کے قاضی نے میری رائے کے برخلاف فتوے دیا تھا۔ اور مشتری کو یقین واثق تھا کہ معاہدہ جائز ہے۔

گرمی چونکہ بہت سخت تھی اِس لیئے دو دن اور تین راتوں کے سفر کے بعد ہم قرشی میں پہنچے۔ قرشی کا نام قدیم زمانہ میں نخشب[1] تھا۔ اور بہ لحاظ تجارت یہ شہر بخارا سے دوسرے درجہ پر ہے۔ اِس شہر میں میں ایک شقہ سفارشی اپنے دوستوں کی طرف احسان حسین نامی اُزبک کے نام لایا تھا۔ یہ شخص نہایت تپاک سے پیش آیا۔ اُس نے مجھے صلاح دی کہ یہاں مویشی بہت سستے ہیں۔ ایک گدھا خرید لو۔ اور باقی جو روپیہ تمہارے پاس ہے اُس سے سوئیاں۔ چاقو۔ تسبیح کے دانے۔ اور بخارا کے رومال خرید لو۔ یہ چیزیں راہ میں اچھی بکتی ہیں اور تمام حاجی ایسا ہی کرتے ہیں۔ واقعی یہ نیک نہاد میزبان سچ کہتا تھا میں نے اسحاق کے ساتھ جاکر یہ اشیاء خریدیں۔ نصف خرجیاں میری ان کتابوں سے

[1] جہان کی نسبت ایک جادوگر کے مصنوعی چاند بنانے کا قصہ مشہور ہے۔ جسکی نسبت ملا جامی نے اِس مصرعہ میں اشارہ کیا ہے ؎ چو ماہ نخشب اندر چاہ نخشب۔

بھری ہوئی تھیں جو ہنیے بخارا میں خریدی تھیں۔ باقی نصف میں ہنیے یہ سامان بھر لیا۔ اس وقت میں سوداگر بھی تھا۔ مولوی بھی تھا۔ حاجی بھی تھا۔ اور جھاڑ پھونک کرنے والا بھی تھا۔

کرکی قرشی سے قریبا چھپن میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں سے میں ملا اسحاق کا اور دو اور حاجیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ تین دن کے سفر کے بعد ہم علی الصباح دریا کے کنارہ پر پہنچے۔ دریا کے کنارہ پر ایک چھوٹا سا قلعہ ہے اور قلعہ کے سامنے بلندی پر ایک اور قلعہ کے اردگرد کرکی کا قصبہ واقعہ ہے۔ دریائے جیحون کی چوڑائی دو قلعوں کے درمیان دریائے ڈنیوب کی چوڑائی سے جو بمقام بوڈا پیسٹ ہے دوگنی ہے۔ لیکن چونکہ دریا زور پر تھا ہمکو اسکے عبور کرنے میں تین گھنٹوں سے زیادہ وقت خرچ ہوا۔ ملاح بڑے ہوشیار تھے اور انہوں نے ہم سے کچھ نہ لیا۔ مگر ابھی ہم نے خشکی پر قدم ہی رکھا تھا کہ گو تر کرکی کے دریابیگی[1] نے ہم کو روک لیا اور کہا کہ تم بھاگے ہوئے غلام ہو اور ایران کو جا رہے ہو یہ کہکر وہ ہمیں اور ہمارے تمام اسباب کو قلعہ کی طرف لیگیا۔ راہ میں دو تین مسافروں کو جنکی گفتگو اور وضع سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایرانی نہیں ہیں اُسنے آزاد کر دیا۔ لیکن مجھ پر طرح طرح کے اعتراض کیئے۔ پہلے تو میں چپکا سنتا رہا۔ پھر مجھے غصہ آگیا اور مینے ترکی زبان بولنی شروع کی۔ اور چلا کر کہا کہ یا تو میرا پروانہ راہداری حاکم کو دکھا دو۔ یا مجھے اُسکے پاس لیچلو۔

میرا شور و غل سُنکر ایک توپچی باشی نے جو ایرانی معلوم ہوتا تھا کچھ آہستہ سے دریا بیگی کے کان میں کہا۔ وہ مجھے ایک طرف لیگیا۔ اور کہنے لگا کہ میں تبریز سے کئی بار استنبول گیا ہوں۔ اور روم کے لوگوں کو خوب جانتا ہوں۔

[1] پانی یا دریا کا افسر یا امیر البحر ۱۲

یہاں کا دستور ہے کہ ہر ایک کی تلاشی لیتے ہیں۔ جو غلام آزاد ہو کر یہاں سے گذرتے ہیں انکو دو اشرفیاں محصول دینا پڑتا ہے۔ اور وہ اکثر بھیس بدل کر حیلہ حوالہ کرتے ہیں۔ جو خدمتگار میرے کاغذات لیکر گورنر کے پاس گیا تھا۔ وہ نہ صرف کاغذات واپس لایا۔ بلکہ پانچ تنگے (بخارا کا ایک سکہ ہوتا ہے) بطور نذرانہ میرے لیئے لایا۔ یہاں مجھے معلوم ہوا کہ مُلا زمان جس کے ساتھ ہمکو ہرات جانا تھا۔ ابھی آٹھ دس دن تک نہیں آئیگا۔ ناچار میں مُلا اسحاق کے ساتھ ارساری ترکمانوں کے ہاں چلا گیا۔ یہاں میں خلیفہ نیاز کے ہاں مہمان ہوا اُسکے ہاں علم وفضل ہور رونق تھا۔ اُس کا اپنا مقدس مکان تھا۔ اور مکہ سے خاص طور پر اُس نے مقدس اشعار پڑھنے کی اجازت منگوائی تھی۔ اُس کا دستور تھا کہ جب مقدس اشعار پڑھا کرتا تھا تو ایک پیالہ پانی کا بھر کر اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ جب اشعار ختم ہوتے تھے تو یہ اُس پانی کے پیالہ میں تھوک دیتا تھا۔ اِس تھوک کی برکت سے وہ پانی پاک ہو جاتا تھا۔ اور یہ پانی اُس شخص کو دیتا تھا جو سب سے زیادہ قیمت ادا کرے۔

چونکہ ہمیں کافی فرصت تھی ہمنے اور میرے وفادار رفیق نے لباب ترکمانوں (یعنی اُن ترکمانوں سے جو کنارہ پر رہتے ہیں) بھی ملاقات کی۔ ہم ایک ویران مسجد کے صحن میں اُترے۔ شام کو ترکمان میرے پاس کوئی نہ کوئی منظوم کہانی لاتے تھے اور میں خوش الحانی سے گا کر اُنہیں سناتا تھا۔ ترکمان دریا کے سامنے میرے روبرو قطار باندھکر بیٹھ جاتے تھے اور میں اُنکے بزرگوں کے کارنامے اُنکو گا کر سناتا تھا۔

ایک دن آدھی رات تک یہ گاتا ہوا رہا۔ جب آدھی رات کے وقت میں بہت تھک گیا تو دیوار کے پاس لیٹ کر سو گیا۔ مجھے میرے رفقا نے بارہا

سمجھایا تھا کہ پرانی دیواروں کے پاس کبھی نہ سونا۔ مگر مجھے اُنکی نصیحت یاد نہ رہی
شاید مجھے سوئے ہوئے ایک گھنٹہ ہوا ہوگا کہ مجھے سخت درد ہونے لگا۔ اور میں
کودکر اُٹھ بیٹھا۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے سوئیاں زہر آلودہ
میری ٹانگ میں چبھودی ہیں۔ میرے پاس ایک بوڑھا ترکمان سویا ہوا تھا میری
چیخوں سے وہ جاگ اُٹھا اور کہنے لگا "بدنصیب حاجی یہ موسم سرطان ہے تجھے
بچھو نے کاٹ کھایا ہے۔ خدا تجھہ پر رحم کرے۔ یہ کہکر اُس نے میری ٹانگ پکڑلی
اور ایڑی کو اس زور سے مروڑا کہ مجھے ایسا درد معلوم ہوا کہ میری ایڑی
پاؤں سے علیحدہ ہوگئی۔ پھر اُس نے زخم پر مُنہ رکھکر اس زور سے چوسنا شروع
کیا جیسے تمام بدن کا عرق نکالنے لگا ہے۔ اس ترکمان نے اسی طرح دو بار زخم کو
چوسا اور تھوکا۔ اور پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ اور کہا دن چڑھتے تک
معلوم ہو جائے گا کہ تو بچتا ہے یا مرجاتا ہے۔ اُس وقت درد اور جلن سے میری
حالت غیر ہو رہی تھی۔ مگر اس حالت میں بھی مجھے یاد آیا کہ لوگ سچ کہتے ہیں کہ بلخ
کے عقرب بڑے زہریلے ہوتے ہیں۔ اُس وقت مجھے اس قدر تکلیف تھی کہ میں
بالکل اپنی زندگی سے مایوس ہوچکا تھا۔ اور اس مایوسی کے عالم میں یہ بھی
بھول گیا کہ میں نے بھیس بدلا ہے۔ اور ایسے فقرے کہہ بیٹھا کہ تاتاری حیران
ہوگئے۔ چند سیکنڈ کے بعد درد پاؤں سے سر تک پہنچ گیا۔ اور مجھے یہ معلوم ہوتا
تھا کہ میری دہنی طرف میں ایک دریا آگ کا کھول رہا ہے۔ اُس وقت مجھے
اس قدر تکلیف تھی کہ مینے موت کو غنیمت جانا اور دیوانہ وار سر زمین پر مارنے
لگا تاکہ سر پھٹ جائے اور میں مرجاؤں۔ ترکمان نے یہ حال دیکھکر مجھے ایک
درخت سے باندھ دیا۔ کئی گھنٹوں تک میں اسی حالت میں درخت کے ساتھ
بندھا رہا۔ میری پیشانی پر پسینہ آیا ہوا تھا۔ اور میری آنکھیں آسمان کے ساتھ لگی

ہوئی تھیں۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ اب یہ ستارے مجھے دیکھنے نصیب نہیں
ہونگے۔ اُس وقت ثریا آہستہ آہستہ مغرب کو اُس پار سے مغرب کو رواں تھا
جسکے دیکھنے کی اُمید اب مجھے نہ رہی تھی۔ صبح کے قریب میری آنکھ لگ گئی۔ مگر
آنکھ لگتے ہی موذن نے پھر مجھے لا الہ الا اللہ کی آواز سے جگا دیا۔ لیکن اس وقت
مجھے درد میں اور جلن میں کمی معلوم ہوئی اور سورج نکلتے تک میں اس قابل ہو گیا
کہ آہستہ آہستہ پاؤں زمین پر رکھنے لگا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے کہا کہ تیرے جسم
میں بچھو کا زہر بنکر شیطان گھس آیا تھا۔ اور صبح کی اذان نے اُسکو نکال دیا ہے
میں سوائے اِسکے اور کیا کہہ سکتا تھا کہ ہاں آپ بجا فرماتے ہیں۔ اِس رات کی
تکلیف بھی مجھے تمام عمر یاد رہے گی اور کبھی نہیں بھولے گی۔ کئی دن تک میں قافلہ
کا جو ہرات کو جانے والا تھا۔ منتظر رہا۔ آخر کار مجھے خبر ملی کہ قافلہ آگیا ہے
میں فوراً کرکی کو گیا۔ اور مجھے اُمید تھی کہ جاتے ہی ہرات چل پڑیں گے۔ مگر
یہاں مجھے سخت مایوسی ہوئی مُلا زمان کے قافلہ میں قریباً چالیس غلام تھے
جنہوں نے اپنی آزادی خرید لی تھی۔ اور اب ملا زمان کی حفاظت میں گھروں
کو واپس جا رہے تھے۔ اگر یہ ہمارے ساتھ جاتے تو پھر انکی گرفتاری اور غلامی کا
خوف تھا۔ ان غلاموں کے محصول کی بابت ورسابیگی اور اہل قافلہ میں بڑی
دیر تک جھگڑا ہوتا رہا۔ کاروان باشی نے غلاموں کی تعداد اصل سے کم بتائی
افسر چونگی نے بخلاف اس کے آزاد اشخاص کو بھی غلاموں کی تعداد میں شامل کر لیا
اور تمام دن آدمیوں۔ اونٹوں اور گدھوں کی تلاشی میں گذر گیا۔ آخر جب
ہم یہاں سے روانہ ہوئے تو یہ افسر سرحد بنجارا تک ہمارے ساتھ گیا۔ تاکہ مبادا
کوئی اور مسافر راہ میں ہمارے ساتھ نہ ہو لے اور ادائیگی محصول سے بچ جائے۔
پہلی منزل پر پہنچکر مجھے معلوم ہوا کہ میرے علاوہ اور بھی بہت سے آدمی

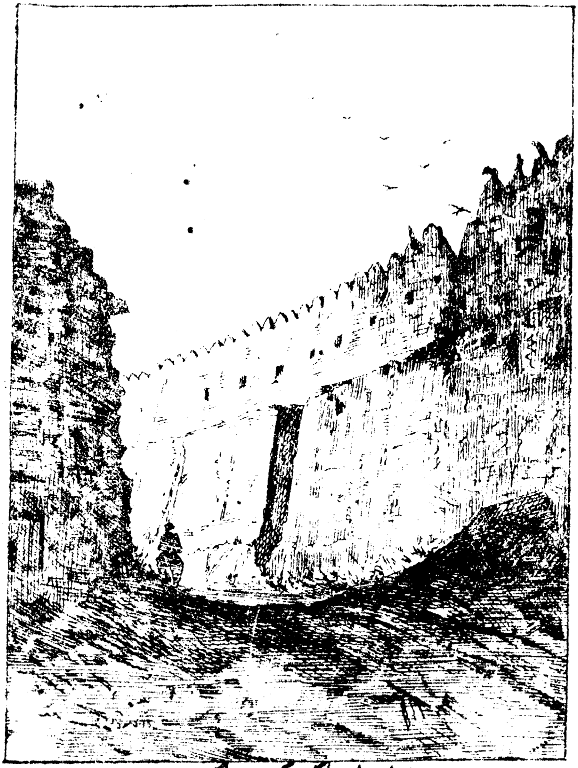

وسط ایشیا کی ایک سڑک

ایسے اس قافلہ میں ہیں جو دعائیں مانگ رہے ہیں کہ جلد اُنکو وسط ایشیا کا جنوبی حصّہ دیکھنا نصیب ہو۔ یہ لوگ جو آزاد ہوئے تھے مجھے حاجی سمجھ کر زیادہ تر میری طرف متوجہ ہوئے تھے اور اِنکی زبانی میں اُنکی مصیبتوں کا افسانہ سنکر کانپ جاتا تھا۔ میرے پاس ایک سفید ریش و پیر مرد بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے حال میں اپنے تیس سالہ بیٹے کو پچاس اشرفی دیکر جو اُسکی تمام زندگی کا سرمایہ تھا آزاد کرایا تھا اور اَب وہ اُسکو اُسکی بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے پاس لیجا رہا تھا۔ اُس شخص نے مجھے کہا کہ مجھے غریبی منظور ہے مگر بیٹے کو پابہ زنجیر نہیں دیکھا جاتا۔ یہ شخص مقام خاف کا رہنے والا تھا۔ جو مشرقی ایران میں واقع ہے۔ میرے قریب ایک اور قوی ہیکل شخص تھا۔ اُس کے بال قبل از وقت صدمے اُٹھا کر سفید ہوگئے تھے۔ اُس نے کہا کہ چند سال ہوئے ترکمان میری بیوی۔ میری بہن اور چھ بچے کنیز اور غلام بنا کر لے گئے تھے۔ سال بھر میں اُنکی تلاش میں خیوا اور بخارا میں پھرتا رہا۔ اور مجھے کچھ پتہ نہ ملا۔ آخر جب پتہ ملا تو معلوم ہوا کہ محنت اور مشقت کے باعث میری بیوی اور بہن اور دو چھوٹے بچے جاں بحق تسلیم ہوچکے ہیں۔ آخر کار میں نے دو چھوٹے بچوں کو روپیہ دیکر آزاد کرایا۔ دو لڑکیاں اَب جوان ہو چلی تھیں اور چونکہ خوبصورت تھیں اُنکی قیمت اُنہوں نے اس قدر مقرر کی کہ مجھ میں استطاعت ادائیگی کی نہ تھی۔ اس گروہ میں ایک بڑھیا اور ایک نوجوان شخص تھے۔ یہ لڑکا ہرات کا رہنے والا تھا۔ اُس نے اپنی والدہ کو آزاد کرایا تھا۔ دو سال اِس سے پہلے وہ اپنے شوہر اور بڑے بیٹے کے ساتھ سفر کر رہی تھی کہ ترکمانوں نے حملہ کرکے اُسکو گرفتار کر لیا۔ اُس کا خاوند اور بیٹا تو اُسکی آنکھوں کے سامنے قتل ہوئے اور اُسکو قزاقوں نے بخارا میں لیجا کر تیس اشرفی کو بیچ ڈالا۔ جب اُسکے چھوٹے بیٹے کو خبر ہوئی تو وہ وہاں پہنچا۔ اور چالیس اشرفیاں دیکر والدہ کو وہاں سے چھڑوایا۔

حصے میں جس پر ایک گنبد استادہ ہے اور بیشمار محاصروں کا مقابلہ کر چکا ہے رونق تھی اور وہاں افغان۔ ہندو۔ ترکمان۔ ایرانی اور یہودی اپنے اپنے ملک کا لباس پہنے پھر رہے تھے قسم قسم کے لباس اور طرح طرح کے خط و خال کا عجیب نظارہ تھا۔ افغانوں کا قومی لباس قمیص۔ شلوار اور ایک بڑا ڈھیلا کمبل ہے۔ لیکن بعض افغان یوروپ کے طرز کے کوٹ سرخ رنگ کے کپڑے کا پہن لیتے ہیں۔ البتہ سر کی پگڑی افغانی اور ہندوستانی ملی جلی ہوتی ہے انہیں جو افغان زیادہ شائستہ ہیں وہ ایرانی لباس پہن لیتے ہیں۔ یہاں مسلح رہنا عام فیشن ہے۔ سپاہی سے لیکر عام باشندوں تک ڈھال تلوار لگائے رہتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے آپکو معزز ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تمام سلاح خانہ ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ افغان لوگ نہایت وحشی اور بہائم صفت ہوتے ہیں۔ لوگ جب اونکے پاس سے گذرتے تھے تو نہایت مسکین شکل بنا لیتے تھے لیکن اہل ہرات جس قدر اپنے افغان حکمرانوں سے متنفر ہیں اس قدر کوئی رعایا اپنے حاکم سے نفرت نہ کرتی ہوگی۔ اس جگہ میں نے کہیں کہیں افغان انگریزی لباس میں بھی دیکھے اور میرے دل میں آیا کہ اب میں بھی اس بھیس کو جو مجھے پسند نہیں ہے بدل ڈالوں مگر پھر مجھے عقل آگئی کہ دیکھا کیا کرتا ہے مشرق میں لوگ اکثر ظاہر باطن میں یکساں نہیں ہوتے۔

یہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اب میں بالکل قلاش ہو گیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح رستے کا خرچ میرے پاس ہو جائے۔ میں سردار محمد یعقوب خاں کے پاس بھی گیا۔ جسکو امیر افغانستان اپنا قائم مقام چھوڑ کر خود افغانستان کو واپس چلا گیا تھا۔ جہاں اُس کے حقیقی بھائی اُس کے برخلاف سازش پر کمربستہ تھے۔ سردار محمد یعقوب خاں ایک سولہ سال کا نوجوان تھا۔ جو شہر کی

دیوان حال قلعہ میں رہتا تھا۔ اور تمام دن وردی پہنے ہوئے اور آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی عرضیاں لیا کرتا تھا۔ جب عرضیاں لیتا لیتا تھک جاتا تھا تو غرفہ میں بیٹھکر فوج کی قواعد دیکھا کرتا تھا۔

جب میں غرفہ میں مُلا اسحاق کے ساتھ پہنچا تو سردار ابھی قواعد دیکھ کر ہٹا تھا۔ میرے جُبہ اور عمامہ کو دیکھ کر لوگ ہٹ گئے اور مجھے رستہ دیدیا۔ میں بلا روک ٹوک دیوان عام میں پہنچا۔ ایک دالان میں شہزادہ آرام چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وزیر اسکے جانب راست بیٹھا تھا۔ اور دیوار کے ساتھ اہلکار اور مولوی تکیہ لگائے کھڑے تھے۔ شہزادے کے سامنے میر مُہر اور چند خدمتگار کھڑے تھے۔ چونکہ میں درویش تھا۔ اسلیئے سلام علیک کرکے سیدھا شہزادے کے پاس چلا گیا اور اُس کے اور وزیر کے درمیان بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے وقت میں نے وزیر کو جو ایک قوی ہیکل افغان تھا دونوں ہاتھوں سے دھکیل دیا کہ اپنے بیٹھنے کے لیئے جگہ بنا لوں حاضرین نے یہ تماشہ دیکھکر بلند آواز سے قہقہ لگایا۔ مگر میں مطلق نہ ہنسا اور بیٹھتے ہی دونوں ہاتھ دُعا کے لیئے اُٹھائے۔ ہنگام دُعا شہزادہ میری طرف غور اور حیرت سے دیکھتا رہا۔ اُسکے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ مجھسے کچھ شبہ ہے۔ جب دُعا کے بعد میں نے آمین کہی تو تمام حاضرین نے ڈاڑھیوں پر ہاتھ پھیرا۔ اسپر شہزادہ اپنی چوکی سے یکلخت اُٹھا اور ہنستے ہوئے میری طرف اُنگلی کرکے کہا کہ قسم ہے خدا کی تو انگریز ہے۔

شہزادہ[1] کے مُنہ سے یہ کلمہ سُنکر تمام حاضرین دوبارہ ہنسنے لگے۔ اور شہزادہ نے

---

[1] یہ وہی شہزادہ تھا جو اپنے والد امیر شیر علی خاں کے بعد والئی کابل ہوا۔ شروع میں اُس نے اپنے آپ کو ایک بہادر اور عقلمند شہزادہ ثابت کیا تھا۔ لیکن بعد ازاں اُس نے سر لوئیس کو گنیری اور اُنکے ہمراہی افسران کے قتل میں شریک ہوکر جو کہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کابل گئے تھے اپنے آپ کو کمزور اور نا قابل حکومت ثابت کیا۔

میرے قریب آکر پھر مجھے کہا کہ مجھے اپنی جان کی قسم ہے کہ تو انگریز ہے۔ اور تو نے بھیس بدلا ہوا ہے۔ میں نے اُس وقت ایسی صورت بنائی کہ جیسے یہ مذاق مجھے ناگوار ہے۔ اور کہا کہ شہزادے "من ضحک ضحک" مسلمان کے ساتھ تمسخر کرنا کفر میں داخل ہے۔ مجھے چھوڑ دو تا کہ میں بخیریت اپنا سفر پورا کر دوں" میری سنجیدگی سے یعقوب خاں کو کسیقدر حیرت ہوئی۔ اور اُسے شک سا ہو گیا۔ پھر اُسنے کہا کہ میں نے اس صورت کا حاجی کبھی بخارا سے آتا نہیں دیکھا۔ مینے کہا کہ میں بخارا کا رہنے والا نہیں ہوں۔ میں استنبول سے آتا ہوں۔ یہ کہکر میں نے اُسکو اپنا پروانہ راہداری دکھایا۔ اِسکو دیکھکر اُسکی تسلی ہو گئی۔ اور وہ اپنی غلطی پر شرمندہ سا ہو کر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ میں نے اُس سے اُسکے چچیرے بھائی جلال الدین خاں[1] کا بھی ذکر کیا۔ جو ۱۸۶۰ء میں مکہ اور قسطنطنیہ گیا تھا۔ اور سلطان نے اُسکی بڑی خاطر مدارات کی تھی۔ اِس گفتگو سے یعقوب خاں کو پورا اطمینان ہو گیا۔ پھر سب حاضرین نے دست بدست میرے کاغذات لیکر دیکھے۔ اور میرے حق میں رائے دی۔ شہزادہ نے مجھے دو قران دیئے اور کہا کہ پھر آنا۔ چنانچہ جب تک میں ہرات میں رہا اُس سے ملتا رہا۔

ہرات میں میرا دل نہ لگتا تھا۔ یہاں کے باشندے افغانوں کے تسلط کے ماتحت ناراض اور سہمے ہوئے تھے۔ اور جہاں کہیں جاؤ اِسی محاصرے کی تباہیوں کا

---

[1] افسوس ہے کہ یہ نیک نہاد سردار جو امیر دوست محمد خاں کے نہایت لائق بیٹے سردار محمد اکبر خاں کا بیٹا اور امیر شیر علی خاں کا داماد اور بھتیجا تھا۔ امیر شیر علی خاں نے اُسے اپنے ملک سے خارج کر دیا تھا۔ سردار جلال الدین تیس سال سے زیادہ مدت راولپنڈی اور گوجرانوالہ میں سرکار انگریزی کا وظیفہ خوار رہ کر پانچ سال کا عرصہ گذر چکا ہے کہ لاولد مر گیا۔ یہ بڑا خوش اخلاق اور معقول شخص تھا۔ مگر قسمت نے اسکی یاوری نہ کی۔

ذکر کرنے میں آتا تھا مجھے دن رات قافلہ کا انتظار تھا۔ آخرکار ۱۰ نومبر ۱۸۶۳ء کو ایک بڑے قافلہ کے ساتھ میں مشہد کی طرف روانہ ہوا۔ اس قافلہ میں دو ہزار آدمی تھے۔ نصف کے قریب انمیں کابل کے ہزارہ لوگ تھے۔ جو زیادہ غریب اور مصیبت زدہ تھے۔ اور اپنے عیال و اطفال کو لیکر شیعہ بزرگوں کی زیارت کو جا رہے تھے۔ چونکہ یہہ قافلہ بہت بڑا تھا۔ اس لیئے کئی حصوں میں منقسم کر دیا گیا تھا۔ میں اس تقسیم میں قندہار کے افغانوں کی پارٹی کے ساتھ شریک ہوا جو سمور اور نیل کے تاجر تھے۔ اور یہ دونو اشیا ایران کو لیجا رہے تھے۔

میرا خیال تھا کہ وسط ایشیا کے جنگلوں میں میں نے وہ تمام مصیبتیں اٹھالی ہیں جو میری قسمت میں لکھی ہوئی تھیں۔ لیکن مجھے یہ خبر نہ تھی کہ ابھی ایسی ایسی تکلیفیں مجھے ہرات سے مشہد کے رستہ میں اُٹھانی ہیں کہ جن کے آگے وہ پہلی مصیبتیں مجھے بھول جائیں گی۔ میری جیب میں کوڑی نہ تھی۔ اور میرا روزمرہ کا گذارہ افغانوں اور تاجیکوں کی خیرات پر منحصر تھا۔ تاجیک بیچارے تو خود ہی بھوکے تھے۔ وہ کسیکو کیا دے سکتے تھے۔ اور افغان اس قدر حریص اور طماع تھے کہ اُنسے خیرات لینا مشکل سے مشکل کام تھا۔ جب کبھی ہمارا قافلہ کسی گاؤں کے قریب ٹھہرتا تھا تو میں اور مُلّا اسحاق دونوں گاؤں میں بھیک مانگنے کے لیئے چلے جاتے تھے۔ وہ روٹی اور آٹا جمع کرتا تھا۔ اور میں لکڑی مانگ لاتا تھا۔ اور دونوں ملکر گذارہ کر لیتے تھے۔

یہاں کے باشندے اگرچہ بہت غریب تھے۔ لیکن خدا ترس تھے اور حسب توفیق ہمیں کھانے پینے کی چیزیں دیتے تھے۔ لیکن یہاں جاڑہ کڑاکے کا پڑتا تھا اور میرے پاس کوئی بھاری کپڑا بدن ڈھکنے کے لیئے نہ تھا۔ جس وقت سرد ہوا کے جھونکے چلتے تھے تو میرا بدن سُن ہو جاتا تھا۔ شب بش سے

لیکن مشہد سے دو پڑاؤ ورے تک کچھ نہ پوچھو کہ میں نے کیسی مصیبت برداشت کی۔ کئی بار مجھے زمین پر برف کے درمیان رات گذارنی پڑی۔ کئی بار میں نے سنگدل افغانوں سے جو پوستینیں پہنے ہوئے تھے گڑگڑا کر کہا کہ مجھے رات بھر کے لئے ایک فالتو کمبل دیدیا کرو۔ مگر انہوں نے میرا کہنا نہ مانا۔ اور میرے دانت سے دانت بجتے دیکھکر ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ حاجی صاحب ناچو اور گرم ہو جاؤ گے۔ مشرقی ایران کے بلند میدانوں کی یاد وسطی ایشیا کے صحراؤں کی طرح میرے دل میں ہمیشہ رہیگی۔

کافرقلعہ کے پاس ہمیں ایک قافلہ ملا۔ جو مشہد سے اس طرف آرہا تھا اہل قافلہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ کرنیل ڈالمیگ ایک انگریزی آفیسر جو ملازم ایران تھا۔ اور میرا قدیمی دوست تھا۔ آجکل مشہد میں ہے۔ اس خوشخبری کو سنکر میں بہت خوش ہوا۔ سرحد ایران میں جو پہلا گانوں ہمیں ملا اسکا نام قرجیون ہے۔ یہاں ایک گرم اصطبل میں گھسکر سونے سے کل گذشتہ مصائب مجھے بھول گئے۔ ہرات سے چلکر بارہویں دن مجھے امام رضا کی خانقاہ کے ملمع اور مطلا گنبد نظر آنے لگے۔ اور میں شکر کر کے شہر مشہد میں کہ جسکے لئے میری آنکھیں ترستی تھیں داخل ہوا۔

مشہد میں پہنچنے کی مجھے یہ خوشی تھی کہ مجھے امید تھی کہ یہاں پہنچکر میں مُردوں سے نکلکر پھر زندوں میں آجاؤں گا۔ اور یہ مکروہ کپڑے کہ جنکو پہن کر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی تھی اُتار ڈالوں گا۔ اور فکروں اور اندیشوں سے نجات پاؤں گا۔ مشہد کا حاکم شاہ ایران کا چچا تھا۔ اور یہ شہزادہ ایک مہذب انسان تھا۔ اور مغربی خیالات کے بموجب حکمرانی کرتا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ یہاں مجھے آرام اور آسائش میسر ہو جائے گی۔ ان سب باتوں سے

بڑا ہکر مجھے یہ خوشی تھی کہ یہاں میں ایک قدیمی دوست سے ملاقات کروں گا۔ اِن اُمیدوں میں امام رضا کی خانقاہ کا گُنبد میرے حق میں روشنی کا مینار تھا جو مجھے ساحل مراد پر پہنچانے والا تھا۔ غرض اِس خانقاہ کی طرف میں اُسی خوشی کے ساتھ دوڑا کہ جس جوش کے ساتھ اَور زائر دوڑے جو مدّت تک آوارہ وطن رہکر اَب گہروں کو واپس آئے تھے۔

امام رضا آٹھویں امام ہیں۔ یہ خلیفہ مامون پسر خلیفہ ہارون رشید کے ہمعصر تھے۔ خلیفہ مامون کو یہ دیکھکر کہ لوگوں کو اِنسے انتہا کی عقیدت اَور ارادت ہے رشک اَور حسد پیدا ہوا۔ اور اس نے بہانہ سے اُنکو جلا وطن کرکے طوس میں جو کہ مشہد کے پاس ایک جگہ آباد تھا بھیجدیا۔ اِس جگہ اُنکی اَور بھی زیادہ قدر و منزلت ہونے لگی۔ اِس لیئے خلیفہ نے فریب سے اُنکو شراب کے پیالہ میں زہر دلوادیا۔ امام رضا کی اِس طرح پر وفات نے اُنکو اَور بھی مقدّس کردیا۔ اَور لوگ اُسے سلطان الغربا کے خطاب سے مخاطب کرنے لگے۔

فصل بستِ وہفتم

مشہد

جب ہم مشہد میں داخل ہوئے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ نیچے اپنے پُرتکلف کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ موسم بہت اچھا تھا۔ اور خزاں کی اکثر سحرگاہوں کی طرح اس صبح کو بھی مطلع صاف تھا۔ راستہ ہموار تھا۔ البتہ کہیں کہیں پہاڑیاں آ جاتی تھیں۔ مشہد کے شہر کے سنہری کلس اور مینار گرد و نواح کی سبزہ زار میں عجیب کیفیت دے رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے شہر ایک روشن نگینہ ہے جو سبز رنگ کی انگوٹھی میں جڑا ہوا ہے۔ اس خوبصورت نظارہ کو دیکھکر میں گذشتہ حالات میں ایسا محو ہوا کہ اپنا آپ بھول گیا۔ مجھے کارواں کے حرکات و سکنات کی مطلق خبر نہ تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا خواب دیکھ رہا ہوں نہ مجھے گذشتہ واقعات کا خیال تھا۔ اِن بزرگوں کے نام میری زبان پر آئے جنکے عالیشان مزاروں سے یہ شہر آراستہ ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مصیبتناک تجربوں سے پیچھا چھٹا۔ اب آئندہ امن اور تہذیب کی منزل میں قدم رکھنا ہوگا۔

جب ہم دروازہ ہرات سے شہر میں داخل ہونے لگے تو میں اُن خیالات کے گرداب سے نکلا۔ ہم پایین خیابان سے ہو کر صحن شریف کی طرف

روانہ ہوئے۔ مشہد کے شہر میں جو چیز مجھے بہت پسند آئی وہ اُسکی نہر تھی جو شہر میں ہے۔ اور اُسکے کناروں پر درخت نصب ہیں۔ شہر میں ہر قوم و ملت کے آدمی دیکھنے میں آتے ہیں۔ مگر یہاں کے باشندوں کا مذہب شیعہ ہے۔ بلکہ مشہد کو شیعوں کا قلعہ کہنا چاہیئے۔ ترکمان اور اُزبک جو بیچارے شیعوں کو اپنے گھروں میں ستاتے ہیں۔ بھیگی بلی کی طرح یہاں سر جھکائے پھرتے ہیں۔ اور بخارا۔ ہزارہ۔ ہندوستان اور ہرات کے لوگ سر اُٹھا کر اس طرح چلتے ہیں کہ گویا وہ بڑے آدمی ہیں۔ اِس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ سُنّیوں کو مشہد میں تکلیف دیجاتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ خود ہی اپنی کرتوتوں کے باعث شرمائے ہوئے پھرتے ہیں۔ اور یہاں اِس شرم کے باعث سر جھکا کر چلتے ہیں۔

خاص کر ایام خزاں میں شہر میں مسافروں کی بھیڑ بھاڑ۔ سودا فروشوں کی پکار۔ اور خلقت کے اژدھام کے باعث کہیں بیٹھکر ستانے کی جگہ نہیں ملتی۔ نہ اِس گوناگون نظارے میں یہ ممکن تھا کہ کسی خاص چیز کو اپنی قوت حافظہ میں جگہ دیجائے۔ خاصکر امام رضا کے مزار کے اردگرد کئی سو قدم تک سب سے زیادہ رونق تھی۔ لیکن لطف یہ ہے کہ باوجودیکہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔ کیا مجال جو کسی کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ اِس بھیڑ میں بھی ایک قسم کی باقاعدگی ہے۔ جس کو یورپین آنکھ محسوس نہیں کرسکتی۔ چنانچہ اس جگھٹی میں انسان بلا خوف و خطر جہاں جانا چاہتا ہے وہیں پہنچ جاتا ہے۔ میرا دل اس بھیڑ اور شور و غل میں لگ گیا۔ کیونکہ میری آنکھیں اِن رونق کو ترکستان کے وحشت خیز شہروں میں ترستی تھیں۔

مشہد میں پہنچکر میں نے مناسب سمجھا کہ جس قدر جلد ہوسکے کرنیل ڈالمیگ

فصل بست وہفتم

مشہد

جب ہم مشہد میں داخل ہوئے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بچے اپنے پُرتکلف کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ موسم بہت اچھا تھا۔ اور خزاں کی اکثر سحرگاہوں کی طرح اس صبح کو بھی مطلع صاف تھا۔ راستہ ہموار تھا۔ البتہ کہیں کہیں پہاڑیاں آجاتی تھیں۔ مشہد کے شہر کے سنہری کلس اور مینار گرد ونواح کی سبزہ زار میں عجیب کیفیت دے رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے شہر ایک روشن نگینہ ہے جو سبز رنگ کی انگوٹھی میں جڑا ہوا ہے۔ اس خوبصورت نظارہ کو دیکھکر میں گذشتہ حالات میں ایسا محو ہوا کہ اپنا آپ بھول گیا۔ مجھے کارواں کے حرکات وسکنات کی مطلق خبر نہ تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا خواب دیکھ رہا ہوں نہ مجھے گذشتہ واقعات کا خیال تھا۔ ان بزرگوں کے نام میری زبان پر آئے جنکے عالیشان مزاروں سے یہ شہر آراستہ ہے۔ مجھے محسوس ہورہا تھا کہ مصیبتناک تجربوں سے پیچھا چھٹا۔ اب آئندہ امن اور تہذیب کی منزل میں قدم رکھنا ہوگا۔

جب ہم دروازہ ہرات سے شہر میں داخل ہونے لگے تو میں اُن خیالات کے گرداب سے نکلا۔ ہم پایین خیابان سے ہوکر صحن شریف کی طرف

روانہ ہوئے۔ مشہد کے شہر میں جو چیز مجھے بہت پسند آئی وہ اُسکی نہر تھی جو شہر میں ہے۔ اور اُسکے کناروں پر درخت نصب ہیں۔ شہر میں ہر قوم و ملت کے آدمی دیکھنے میں آتے ہیں۔ مگر یہاں کے باشندوں کا مذہب شیعہ ہے۔ بلکہ مشہد کو شیعوں کا قلعہ کہنا چاہیئے۔ ترکمان اور اُزبک جو بیچارے شیعوں کو اپنے گھروں میں ستاتے ہیں۔ بھیگی بلی کی طرح یہاں سر جھکائے پھرتے ہیں۔ اور بخارا۔ ہزارہ۔ ہندوستان اور ہرات کے لوگ سر اٹھا کر اس طرح چلتے ہیں کہ گویا وہ بڑے آدمی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ سُنیوں کو مشہد میں تکلیف دیجاتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ خود ہی اپنی کرتوتوں کے باعث شرمائے ہوئے پھرتے ہیں۔ اور یہاں اس شرم کے باعث سر جھکا کر چلتے ہیں۔

خاص کر ایام خزاں میں شہر میں مسافروں کی بھیڑ بھاڑ۔ سودافروشوں کی پکار۔ اور خلقت کے اژدہام کے باعث کہیں بیٹھکر ستانے کی جگہ نہیں ملتی۔ نہ اس گوناگون نظارے میں یہ ممکن تھا کہ کسی خاص چیز کو اپنی قوت حافظہ میں جگہ دیجائے۔ خاصکر امام رضا کے مزار کے اردگرد کئی سو قدم تک سب سے زیادہ رونق تھی۔ لیکن لطف یہ ہے کہ باوجودیکہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔ کیا مجال جو کسی کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ اس بھیڑ میں بھی ایک قسم کی باقاعدگی ہے۔ جس کو یورپین آنکھ محسوس نہیں کرسکتی۔ چنانچہ اس جگھٹ میں انسان بلاخوف و خطر جہاں جانا چاہتا ہے وہیں پہنچ جاتا ہے۔ میرا دل اس بھیڑ اور شوروغل میں لگ گیا۔ کیونکہ میری آنکھیں اس رونق کو ترکستان کے وحشت خیز شہروں میں ترستی تھیں۔

مشہد میں پہنچکر میں نے مناسب سمجھا کہ جس قدر جلد ہوسکے کرنیل ڈالمیک

کو ملنا چاہئیے۔ چنانچہ پہلے میں کاروان سرائے میں فروکش ہوا۔ غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور اپنے دوست کے مکان کی تلاش میں کاروان سرائے سے نکلا۔ اگرچہ ایک حاجی کے لیئے مشہد میں کسی فرنگی کے مکان کا پتہ دریافت کرنا معیوب تھا۔ لیکن مینے حکمت عملی سے پوچھ پاچھ کر مکان ڈھونڈ نکالا۔ اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک خدمتگار نے دروازہ کھولا اور مجھے حاجیوں کے لباس میں دیکھکر اور کچھ سخت سست کہکر پھر دروازہ بند کر لیا۔ یہ حال دیکھکر میں سخت مایوس ہوا۔ اور دوبارہ مینے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ابکے پھر اسی خدمتگار نے دروازہ کھولا۔ مگر ابکی دفعہ مینے اُسکو مہلت نہ دی اور جلد مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ پہلے تو نوکر حیران ہوا۔ مگر پھر جلدی حیرت کو دور کر کے مجھے کہنے لگا۔ تو حاجی ہے۔ اور میرا آقا انگریز ہے۔ تیرا یہاں کیا کام ہے۔ مینے کہا تجھے اس سے کیا مطلب۔ جا اور اپنے آقا کو کہہ کہ ایک شخص بخارا سے آیا ہے۔ اور تجھے ملنا چاہتا ہے۔ یہہ کہکر میں ایک کمرے میں جو مغربی ساز و سامان سے آراستہ تھا داخل ہو گیا۔ اگرچہ یہاں میز اور کرسیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ تاہم اُسکو دیکھ کر مہذب دنیا کے آرام کی تصویر میری آنکھوں میں پھر گئی۔ میز پر ایک اخبار لیوانٹ ھیرلڈ نامی پڑا ہوا تھا۔ میں اُسکی طرف اس طرح لپکا جیسے کئی دن کا بھوکا روٹی کیطرف جاتا ہے۔ اس عرصے میں کیسے کیسے جدید واقعات ہو چکے تھے۔ اہم اور غیر اہم ہر واقعے کو میں عجیب دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ اس اخبار میں جو بعد از مدت مدید مجھے دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ میں اس طرح محو ہوا کہ کرنیل ڈالیگا اُس کمرے میں آبھی گیا۔ اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ کرنیل موصوف کچھ عرصہ تک غور سے میری صورت کو دیکھتا رہا۔ مگر اُس نے مجھے مطلق نہ پہچانا۔ ہوک

بیابانی مشقت سفر۔ خوف جان اور طرح طرح کے اندیشوں نے میری قلب ماہئیت کر دی تھی۔ اگر نوجوان کرنیل نے مجھے نہ پہچانا تو مقام تعجب نہ تھا۔ تھوڑی دیر تک ہم ایک دوسرے کا مُنہہ دیکھتے رہے۔ آخر مجھسے رہا نہ گیا اور میں نے کہا "کیا کرنیل تم مجھے نہیں پہچانتے؟" میری آواز سنکر وہ فوراً مجھے پہچان گیا اور دوڑ کر مجھے چمٹ گیا۔ اور اب اُسکو پہلی باتیں یاد آ گئیں۔ اُس نے میرے سفر کے خطرات کا ذکر سُنا تھا۔ اِس لئے اِس موقع پر اُسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

یوروپ میں بیشک لوگ اختلاف عہدہ۔ پیشہ۔ رتبہ۔ دولت اور قومیت کے باعث ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔ مگر جب یہ لوگ غربت میں ایک دوسرے کو ملتے ہیں تو یہ باتیں سب بالائے طاق رہجاتی ہیں۔ اور آپسمیں اِس طرح ملتے ہیں جیسے بچھڑے ہوئے بھائی۔ کرنیل نے پہلا سوال جو مجھسے کیا وہ یہ تھا کہ برائے خدا مجھے بتاؤ تم کہاں تھے۔ اور کیا کرتے رہے اور کس حال میں ہو۔ اُسکی گفتگو سے مجھے معلوم ہوا کہ میں اس وقت اپنے حقیقی بھائی کے گھر میں ہوں۔ میں نے اپنی تمام سرگذشت اُسکے روبرو بیان کی اور وہ بڑی ہمدردی کے ساتھ بڑی دیر تک سنتا رہا۔ جب رات بہت ہو گئی تو میں اس سے رخصت ہوا۔

مشہد میں کئی ہفتے میرا قیام رہا۔ کرنیل ڈالمیگ یہاں میرے بڑے کام آیا۔ اور ہرچند کہ میری وجہ سے اُس کا بہت حرج ہوا۔ اور میں نے اُسکو بہت دق کیا۔ مگر وہ ہمیشہ مجھسے برادرانہ برتاؤ کرتا رہا۔ اور اُسی کی مروت سلوک اور امداد کے باعث میں چار ہفتہ کے قیام کے بعد تندرست اور بشاش ہو کر آگے سفر کرنے کے قابل ہو گیا۔

مشہد میں پہنچکر سب سے پہلے میں نے آرام کیا جس سے میری صحت پھر درست ہو گئی - چند دن آرام کر کے پھر اپنے سیر و سیاحت شروع کی - اس شہر میں اس قدر عجائبات ہیں کہ مشرقی ایران کے اور کسی شہر میں نہیں یہاں اِس قدر تاریخی یادگاریں اور مقدس اشیا ہیں کہ انسان نہیں جانتا کہ پہلے کسے دیکھنا شروع کرے -

غالباً اِس وجہ سے کہ میں مدت تک درویش رہا تھا سب سے پہلے میں صحن شریف میں داخل ہوا - کئی سید جو یہاں موجود تھے مجھے سُنی حاجی سمجھکر میرے گرد ہو گئے - اور مجھے پکڑ پکڑ کھینچنے لگے کہ ادھر آیئے - ادھر دیکھئے - اور یہہ چیز ملاحظہ کیجئے - اِس موقعہ پر میرے دل میں خیال آیا کہ یہ وہی مکان ہے جس کو دور سے کونلی - فریسر - پرنٹنر - چینی کوف بلکہ خود سرکاری افسر ایسٹ وک نے دیکھا تھا اور جنکو کوئی نزدیک نہ آنے دیتا تھا اور آج یہی سید مجھے زبردستی اندر لیجاتے ہیں - میں نے اِن سیدوں سے کہا کہ مجھے معاف کرو میں خود ہی ہر ایک شے دیکھ لونگا - گذشتہ سفر میں کئی ماہ کی متواتر زبردستیوں سے میں اِس قدر تنگ آگیا تھا کہ اسلامی زیارتگاہوں کا شوق میرے دل سے نکل گیا تھا - چنانچہ جب سید مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو طبیعت کو اطمینان ہوا اور میں صحن شریف کے جانب چلا گیا -

اِس طرف گوہرشاہ کی مسجد ہے - یہہ خانقاہ شان اور خوبصورتی میں مدینہ - نجف - کربلا اور قم کی خانقاہوں سے بہی کہیں بڑھکر ہے - اسکی اندر باہر سونے کی چادریں پڑی ہوئی ہیں - اگرچہ وہ اگلی شان اب نہیں رہی اور اُزبک اور افغان بہت سی آرایشی چیزیں اُتار کر لے گئے ہیں - مگر اب بھی بڑی رونق ہے - جب سے یہ خانقاہ بنتی ہے

کئی مرتبہ لوٹی جا چکی ہے ۱۵۸۹ء میں اُزبکوں نے عبد المومن خان بخارا کے ماتحت مشہد میں بڑی آفت برپا کی تھی اور اُس نے تمام شہر کو زیر و زبر کر کے تمام باشندوں کو غلام بنا لیا تھا۔ پھر افغانوں نے اس شہر کو وقتاً فوقتاً لوٹا۔ اس خانقاہ میں ایک گولہ سونیکا وزن میں پانچ من چھت سے لٹکتا تھا۔ وہ نادر شاہ کے بیٹے اُتار کر لیگئے اور پھر ایک باغی حسن خان سالار کے ناپاک عہد میں کئی جواہرات یہاں سے چوری گئے۔ لیکن باوصف ان خرابیوں کے ابتک یہاں بہت سا خزانہ جمع ہے۔ اب بھی مزار کی دیواریں چڑھاوے کے جواہرات اور زیورات سے آراستہ پیراستہ ہیں۔ شیعوں کو اس خانقاہ سے بڑی عقیدت ہے اور جب انسان اس ان میں داخل ہوتا ہے تو جواہرات اور سونے کے زیورات دیکھکر آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ یہاں ایک ہیروں کا جیغہ اور ایک جواہر نگار ڈھال اور ایک جواہر نگار خنجر ہے۔ وزنی جھاڑ قیمتی کنٹھے اور ہار کثرت سے موجود ہیں۔

مزار کے اندر اور باہر کا منظر دیکھنے والوں کو یکساں حیرت میں ڈالتا ہے۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی محال ہے۔ میں بیرون مزار سنہری کلس کی خوبصورت کھڑکیوں کو اور اندرون مزار چاندی کی جالیوں زر کار نقش و نگار اور بیش بہا قالینوں کو دیکھتا تھا۔ اور متعجب ہوتا تھا۔ اس خانقاہ میں کثرت سے زائرین موجود تھے۔ مگر یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ سب میری طرح تماشہ دیکھنے آئے تھے۔ ان میں اکثر ایسے تھے جو خلوص دل سے آئے تھے۔ اُنکے چہروں سے وہ سرگرمی۔ فروتنی اور خودرفتگی عیاں تھی جو پیروان اسلام کا خاص وصف ہے۔ انہوں نے منتیں مانی ہوئی تھیں۔ بعض اپنے گناہوں سے توبہ کر رہے تھے۔ بعض رکوع و سجود میں مشغول تھے۔ بعض معتکف بیٹھے تھے۔ اور

بعض آنسو بہا رہے تھے۔ اور درود پڑھ رہے تھے۔ ایک اور بات میں نے یہاں عجیب دیکھی کہ اِس خانقاہ میں بڑے بڑے امرا۔ خان زادے اور کُرد جو دور دور سے آئے تھے اور غریب سے غریب کسان برابر تھے۔ یہاں کچھ رتبہ یا درجہ کی تمیز نہ تھی۔ کیا اصفہانی کیا شیرازی کیا پاک باطن ترک اور کیا خونخوار بختیاری اور کُرد سب پر وہی ایک جوش عقیدت کی حالت طاری تھی۔

خانقاہ دیکھکر میں نے گوہر شاہ کی مسجد دیکھی۔ ایرانی سمجھے ہیں۔ کہ اگرچہ خانقاہ امام رضا کی بہت شاندار ہے مگر عمارت مسجد کی مزار کی عمارت سے اچھی اور مکمل ہے یہہ مسجد اور خانقاہ ایک ہی صحن میں آمنے سامنے ہیں۔ اِس مسجد کے خشتی کام میں اِس قدر صنعت اور کاریگری دکھائی گئی ہے کہ اُسکے آگے سونا اور چاندی ماند ہے۔ اِس مسجد کا محراب جسمیں رنگ برنگ کی اینٹیں لگی ہیں۔ صنعت کا اعلیٰ درجہ کا نمونہ ہے اور سورج کی روشنی میں نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ اِسکا دروازہ اِس قسم کا ہے جیسے دروازے میں نے ہرات اور سمرقند میں دیکھے تھے۔

خانقاہ اور مسجد کو دیکھکر میں امام رضا کے باورچیخانہ یا لنگر کی طرف گیا۔ اسکو وہاں کے لوگ "آش پز خانۂ حضرت" کہتے ہیں۔ امام صاحب کو یہاں حضرت کہتے تھے۔ حضرت بڑے دولتمند مشہور ہیں۔ اور ہر ایک زائر آپ کا مہمان ہوتا ہے۔ فقرا اور مساکین کثرت سے جاتے ہیں۔ سات دن تک یہاں مسافروں کی دعوت ہوتی ہے۔ اور اِن سات دِن میں خانقاہ کے خرچ سے مسافروں کو نہ صرف کھانا کھلایا جاتا ہے۔ بلکہ اُنکے رہنے کے لیئے مکان اور نہانے کے لیئے حمام بھی کھل جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ چلو ایکبار

اور اس خوان سے بھی دعوت اڑالیں اور کچھ تھوڑا سا اور تجربہ حاصل کرلیں چنانچہ میں فقرا کے لباس میں وہاں پہنچا۔ مینے وہاں جاکر دیکھا کہ ہزار دش شیعہ اور سُنّی فقیر بھیڑ لگائے کھڑے تھے آسودہ حال مسافر تو اس دعوت کی پرواہ نہیں کرتے۔ مگر غریب اور مفلس اس ہفتہ کی انتظار میں گھڑیاں گنتے رہتے ہیں۔ میں بھی فقیروں کے درمیان جا بیٹھا۔ اور مینے دیکھا کہ بیشمار خدمتگار گرم گرم پلاؤ کی رکابیاں لارہے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت یعنے صاحب خانقاہ بہت دولتمند ہیں۔ مگر یہ پلاؤ جو مینے بادل ناخواستہ کھایا وہی چربی کا پکا ہوا موٹے چاولوں کا پلاؤ تھا۔ اس لیئے میرے دل نے حضرت کے تموّل کی چنداں تعریف نہ کی۔ اور میں بھوکا رکھکر اُٹھ کھڑا ہوا کہ کسی اور موقعہ پر سیر ہو کر کھاؤنگا۔

چونکہ ایرانی لوگ بہت حریص اور طماع ہیں وہ زیادہ تر امام صاحب کے ثناخوان اُنکے تقدس آبی کی وجہ سے نہیں ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے مداح ہیں کہ اُنکی خانقاہ بڑی مالدار سمجھی جاتی ہے۔ ایک دن اتفاقاً مجھے معلوم ہو گیا کہ یہودی مشہد میں نہایت خطرناک حالت میں رہتے ہیں۔ ایک دن بازار میں مجھے ایک قدیم رفیق ملا۔ جو بخارا سے میرے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ اُسنے مجھے نہ دیکھا۔ اور میرے پاس سے گذرتا ہوا نکلگیا۔ مینے اُسکو یہودی یہودی کہکر پکارا۔ میری آواز سنکر یہ لوٹا اور میرے پاس آکر کہنے لگا۔ خدا کے لیئے حاجی مجھے یہودی نہ کہنا۔ مشہد سے باہر میں بیشک یہودی ہوں لیکن یہاں آکر مجھے مسلمانوں کی طرح بسر کرنا ضروری ہے۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ متعصب مسلمان مذہب کی آڑ میں اِنکو ستاتے ہیں اور لوٹ مار اور کشت و خون کا ہنگامہ برپا کرتے ہیں۔

آجکل یہودی مشہد میں بھیس بدل کر اس لیئے آتے ہیں کہ اب سے چند سال پیشتر

ایکدفعہ ایک یہودی کے ہاتھ پر پھوڑا نکل آیا تھا۔ ایک ایرانی ڈاکٹر نے اُسکو صلاح دی کہ تازہ تازہ ذبح شدہ کتے کی انتڑیوں میں تم ہاتھ ڈالدو فوراً اچھی ہوجاؤ گی۔ بیچارے یہودیوں نے دوسرے دن اس مطلب کے لیئے ایک کتا مروایا۔ بدقسمتی سے یہ دن عید الضحےٰ کا تھا۔ مسلمان تو یہودیوں کے دشمن ہو رہے تھے۔ اور ہر وقت بہانہ ڈھونڈہتے تھے۔ یکایک اُنہوں نے یہ شور مچایا کہ یہود نے ازراہ تمسخر قربانی کی نقل کی ہے۔ اور کتا ذبح کیا ہے چنانچہ چند بدمعاش یہودیوں کے محلہ پر جا پڑے اور اُن لوگوں کو لوٹ لیا اور قتل کر ڈالا۔ جو باقی رہے اُنکو صرف اس شرط پر امان دی کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ جبتک وہ شہد میں رہیں اُسپر وہ ظاہراً مسلمان ہوگئے۔ گو وہ باطن میں یہودی ہی رہے۔ اس معاملے کو ہوئے کئی سال گذر گئے۔ یورپین اثر نے شیعہ مسلمانوں کے تعصب کو بھی کم کر دیا۔ لیکن یہودی بدستور اپنے قدیم احتیاط پر قائم ہیں۔

مشہد کے شمال میں طوس کے کھنڈرات ہیں۔ یہاں ایرانیوں کا یقین ہے کہ فردوسی مصنف شاہنامہ کی قبر ہے۔ میں اس دنیا کے ایک سب سے بڑے قومی شاعر کی تربت پر دلی عقیدت سے گیا۔ اس شخص نے یہ کمال کیا ہے کہ ایران کی تاریخ ساٹھ ہزار اشعار میں لکھی ہے۔ اور ان اشعار میں سوائے چند عربی الفاظ کے غیر زبانوں کے الفاظ بالکل نہیں لایا ہے۔ یہ واقعی بڑی بات ہے۔ آجکل فارسی کا یہ حال ہے کہ جب فارسی لکھی جاتی ہے تو ہر دس الفاظ میں چھ فارسی اور چار عربی الفاظ ہوتے ہیں۔ اس شاعر کی حب الوطنی نے اسکو اجنبی الفاظ کے استعمال سے باز رکھا۔ فردوسی کی شہرت نہ صرف بطور شاعر ہمیشہ رہے گی۔ بلکہ اُسمیں کئی صفات اور بھی ایسی تھیں جن سے وہ اس

قابل تھا کہ بقائے دوام کے دربار میں کرسی نشین ہو۔ یہ شخص بالکل نڈر اور بے رو رعایت تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے وعدہ کیا تھا کہ ہر شعر کے لئے تمہیں ایک اشرفی دونگا۔ مگر جب کتاب ختم ہوئی تو محمود نے ساٹھ ہزار اشرفی کے بجائے صرف تیس ہزار درہم فردوسی کو بھیجے۔ جس وقت یہ انعام آیا تو اُس وقت فردوسی حمام کر رہا تھا۔ اُسکو سلطان کی وعدہ خلافی پر اسقدر غصہ آیا کہ اُس نے وہیں ملازمان حمام میں وہ روپیہ تقسیم کر دیا۔ جب سلطان محمود غزنوی کو یہ خبر ہوئی تو وہ بہت پچھتایا اور پھر انعام موعودہ فردوسی کے پاس بھیجا۔ مگر جب قاصد اشرفیوں کے بدرے لیکر پہنچے تو فردوسی مرچکا تھا۔ اور لوگ اُسکا جنازہ لئے جا رہے تھے۔ فردوسی کی دختر نے[لہ] بھی اُس کے بعد یہ انعام لینے سے انکار کر دیا۔ فردوسی مرنے سے پہلے محمود کی ہجو لکھ گیا۔ اور اِس مشہور بادشاہ کی یادگار پر دھبہ لگا گیا۔ یہ ہجو آجتک ایرانیوں کو نوک زبان ہے۔ اسکا پہلا شعر یہ ہے[لہ]

ایا شاہ محمود کشور کشا زمن گر نہ ترسی بترس از خدا

زمانہ حال کے ایرانیوں اور اِس شاعر کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے

لہ وہ فردوسی کی ہمشیرہ تھی کہ جس نے سلطان کا روپیہ قبول کرنے سے انکار کیا تھا نہ کہ اُسکی دختر تھی جیسا کہ یہاں درج ہے اور فردوسی کی وصیت کے مطابق اِس روپیہ سے طوس کے گرد شہرپناہ بنا دی گئی

لہ ایک اور شعر اِس نظم کا یہ ہے ــ اگر مادر شاہ بانو بدے ÷ مرا سیم و زرتا بزانو بدے ÷ اِس سے مطلب یہ ہے کہ سلطان محمود کنیزک زادہ تھا۔

لہ ایشیا کی اسلامی تصنیفات میں سے حافظ سعدی اور فردوسی کی منظومات گھر گھر موجود ہیں۔ میں نے اپنے سفر میں کوئی ایسا ایرانی نہیں پایا۔ جو شاہنامہ کے ہیرو اور اُنکے معرکہ آرا واقعات سے واقف نہ ہو۔ باستثنائے مدارس و مساجد کے کوئی کاروانسرائے یا اور پبلک دفتر یا مکان ایسا نہیں جسپر رستم۔ زال۔ اور کیخسرو کی تصویریں نہ ہوں۔ ایرانیوں کی بڑی ہر دلعزیز تاریخ شاہنامہ ہی ہے۔

اِس اثنا میں میں نے مشہد سے طہران جانے کی تیاری کرلی۔ حاکم مشہد نے میری بڑی قدر و منزلت کی اور مجھے بہت تحائف دیئے۔ یہاں سے طہران تیس دن کا سفر تھا۔ اور جاڑے کے موسم میں یہہ سفر آسان نہ تھا مگر میں جلد یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ خوشی خوشی میں یہاں سے روانہ ہوا۔

فصل بست وہشتم

مشہد سے طہران تک

بادشاہ وقت کے چال چلن کا اثر ایران میں ہر بات پر نمودار ہوتا ہے۔ اور اسی طرح ہر صوبے کے حاکم کا چال چلن ایک محدود طرز پر اُسکے اپنے علاقہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ مشہد سے طہران تک سفر کرنا بزدل ایرانی کے نزدیک تو واقعی بڑی بات ہے۔ مگر ایرانیوں کے علاوہ بڑے بڑے بہادر ابھی سفر کرتے ہوئے تامل کرتے ہیں۔ کیونکہ راہ میں خراسان کے قریب ترکمانوں۔ بلوچیوں اور کُردوں کی لوٹ مار کا بہت خوف ہوتا ہے سلطان مُرادمیرزا جسکو ایران کے لوگ شمشیران کہتے تھے یہاں کا گورنر تھا۔ اور واقعی تعریف کا مستحق تھا۔ اُس نے راستوں کے صاف کرنے میں بہت کوشش کی۔ اور لوگ سچ کہتے تھے کہ اِسکے عہد میں راہ میں سونا اُچھالتے چلے جاؤ کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہارے مُنہ میں کے دانت ہیں۔ مُلک ایران میں کوئی ایسا گورنر نہیں تھا جس نے مرادمیرزا سے زیادہ رستوں کو صاف کیا ہو اور تجارت وسیاحت کو ترقی دی ہو۔

میں خوشی خوشی اپنے تاتاری رفیق کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوا۔ دو دن رستے

مشہد سے نیشاپور کو جاتے تھے۔ ایک رستہ پہاڑوں کے اوپر سے تھا اور دوسرا دامن کوہ سے تھا۔ میں نے آخری رستہ اختیار کیا۔ جس وقت میں شہر سے ایک عمدہ ادیان پر سوار ہو کر نکلا۔ تو میرے رفیق تاتاری کے گھوڑے پر کافی سامان لدا ہوا تھا۔ اور میں اُس وقت بہت ہی خوش اور مسرور تھا۔ یہ خوشی صرف اس وجہ سے نہ تھی کہ میں گھر کو واپس جا رہا تھا۔ بلکہ اس وجہ سے تھی کہ اب سفر میں میں محض گدا کے بھیس نہ تھا۔ جیسا کہ ترکستان کے جنگلوں میں تھا۔ مشہد اور طہران کے درمیان ہمیشہ قافلوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ راہ میں مجھے ایک پرانا شیرازی دوست ملا۔ اُس دوست کے ساتھ میں نے تخت جمشید۔ نقش رستم اور شیراز کی سیر کی تھی۔ ایک عرصے کی باہم سیاحی ایشیا میں ایک قسم کی رشتہ داری خیال کی جاتی ہے۔ یہ باتونی دوست مجھے دیکھکر بہت خوش ہوا۔ اور ہم دونوں کچھ عرصہ تک زمین پر بیٹھکر قلیان کشی کرتے رہے۔ جب میں اس رفیق کے ساتھ بیٹھکر حقہ پی رہا تھا تو اسکے خوشبودار دھوئیں کو آنکھوں کے سامنے اُٹھتا دیکھکر میرے دلمیں عجیب عجیب خیالات پیدا ہو رہے تھے مقدونیہ کے مغرور شاہ اور فیاض ہرمز جیسے لوگوں کا خیال میرے دلمیں آتا تھا اور کبھی میں سوچتا تھا کہ اللہ غنی میں باختر اور سعدی ( ) بھی دیکھ آیا ہوں جہاں جانے سے مقدونیہ کے سکندر اعظم کی بہادر فوج نے بھی انکار کر دیا تھا۔ جب میں اُس شیرازی دوست سے جدا ہونے لگا تو وہ مجھے نہ چھوڑتا تھا۔ ناچار میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں ضرور تمہیں شیراز میں ملوں گا۔ کہ جسکی راہ میں مجھے مطلق تکان معلوم نہ ہوئی۔ ہم مع الخیر شریف آباد پہنچ گئے۔ میں وہی شخص تھا جو ترکستان میں آٹا اور لکڑیاں مانگ کر شب و روز بسر کرتا تھا۔ اور رات کے کوئی جگہ شب باشی کی مجھے نظر نہ

آتی تھی اور اب میں ایک بڑا آدمی تھا۔ میں سیدھا چپار خانہ یعنی ڈاک خانہ میں گیا اور بلند آواز سے کہا کہ مجھے آج رات یہاں ٹھیرنا ہے۔ اگرچہ ظاہرا لباس میرا ابھی تک حاجیوں کا سا تھا۔ مگر میرے پاس روپیہ ہوگیا تھا۔ پوسٹ ماسٹر نے مجھے معزز آدمی سمجھکر میری خاطر و تواضع کی اور میرے تاتاری دوست نے پر تکلف کھانا میرے لئے تیار کیا۔ میرا ازبک رفیق جس نے غریبی اور محتاجی میں پرورش پائی تھی کھانے پینے کی یہ افراط دیکھکر بہت خوش ہوتا تھا اگرچہ یہ بڑا عمدہ باورچی نہ تھا مگر گذارے کے لئے بہت اچھا کھانا پکا دیتا تھا۔

اس مقام سے دوسری منزل جس کا نام قدم گاہ ہے ۹ جرمن میل یا ۳۶ انگریزی میل کے فاصلے پر تھی یوروپین مسافر کہتے ہیں کہ ایران کے رستے کاٹنے مشکل ہوجاتے ہیں کیونکہ راہ میں کوئی بات کرنے والا نہیں ہوتا۔ ایک ایک میل کا ختم ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا کسی عورت کی بکواس کا ختم ہونا۔ لیکن یہ بات کوئی مجھ سے پوچھتا کہ جس نے ترکستان کے بے آب و علف بیابانوں میں قدم فرسائی اور بادیہ پیمائی کی تھی۔ میرے نزدیک ایران کا راستہ بہت غنیمت تھا۔ علاوہ بریں اس وقت میں مسلح تھا۔ میرے پاس کافی آزوقہ تھا۔ سواری اچھی موجود تھی۔ مجھے کسی بات کی تکلیف نہ تھی۔ وہ لوگ جو جون جولائی کے مہینوں میں ریل کی بند گاڑیوں میں بیٹھتے ہیں اور ریلوے گارڈوں کے گرد آلود چہرے دیکھکر خوش ہوتے ہیں وہ بیچارے کیا جانیں کہ سفر کس چیز کا نام ہے۔ گھوڑے کی زین آپ کے نرم گدیلوں سے بدرجہا بہتر ہے سوار آزاد اور مطلق العنان ہوتا ہے۔ سوار کی لگام اس کا پریذیڈنٹ ہے اس کی شمشیر اس کا قانون۔ اس کی بندوق اس کا پولیس مین ہے۔ اور اگرچہ وہ

٭ ریل کا ٹائم ٹیبل یا گائڈ بک ۱۲

قانون سے باہر ہے اور ہر ایک کے لئے عمدہ شکار ہے مگر اُس کے لئے اور لوگ بھی عمدہ شکار ہیں۔ اگر ساتھ ہی اس کے یہ سوار ان ملکوں کی زبانوں اور رسم و رواج سے کہ جن میں وہ سفر کر رہا ہے واقف ہے تو اُس کو فرمانوں اور محافظوں کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی اور سفر اُس کے لئے نمونہ بہشت ہو جاتا ہے۔ آدھے دن کے سفر کے بعد اُسے دوپہر کی منزل سے خوشی بھی حاصل ہوتی ہے اور ضرورت بھی پوری ہوتی ہے شام کو جو کھانا وہ آسمان کے سائبان کے نیچے بیٹھکر کھاتا ہے اُس سے بڑھکر کوئی نعمت لذیذ نہیں ہو سکتی۔ اوس وقت کی نیند سے زیادہ صحت بخش اور فرحت بخش وہ سونا ہو سکتا ہے جو ریل کے مسافروں کا شاہانہ ٹھاٹھ کے کمروں میں نصیب ہوتا ہے اور جو خوشی اُس کو چراگاہ کے قریب بیٹھکر اور گھوڑے کو چرنے کے لئے چھوڑ کر حاصل ہوتی ہے وہ خوشی وہ ہی سوار جان سکتا ہے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں اس وقت ایسی روشن نہیں ہوتیں جیسا کہ سیاح کی نگاہیں روشن اور سرتتاک ہوتی ہیں۔

اس گاؤں کو قدم گاہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں حضرت علی کے قدم کے نشان ایک سنگ مرمر کے ٹکڑے پر موجود ہیں اس قسم کی زیارتوں کی ممالک مشرق میں کمی نہیں ہے۔ عیسائی۔ مسلمان اور ہندو سب ان چیزوں کی عزت کرتے ہیں۔ اُنھیں دیکھکر مجھے ایک تعجب آیا کہ اِن میں سے بعض بہت بڑے بڑے نقش تھے اور میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ آدمی کے تو نہیں کسی ہاتھی کے نقش قدم ہوں گے مگر عقل اور شے ہے اور مذہبی اعتقاد اور شے ہے۔ شیراز کے پہاڑوں کے قریب ایک نقش قدم تین فیٹ لمبا ہے۔ ایک اسی قسم کا نقش قدم ہرات میں ہے۔ کوہ سینا اور جینی تاتار کے

مقام بختن میں بھی اتنے بڑے بڑے نقش قدم موجود ہیں بختن میں یہ روایت مشہور ہے کہ حضرت جعفرؑ جب مقام صادق کے پاس سے گذرے تو یہ نشان ہو گئے۔ عقیدت کیش لوگ اس قدر لمبائی اُن کی دیکھکر مطلق متعجب نہیں ہوتے ان مقدس مقاموں کے پاس سرائیں بھی ہوتی ہیں۔ ایک سرائے میں میں بھی فروکش ہوا۔ میں ایک خوشنما کنیر کے سایئے میں چاے پی رہا تھا کہ مجاور میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ کہ چلو زیارت کرلو۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ مجھ سے کچھ وصول کرے لینے یہ چیزیں بہت دیکھی ہوئی تھیں۔ اس لئے میں نے ایک پیالہ چاے کا اُس کو پلایا اور چند قران اُس کو دیکر کہا کہ بس تشریف لیجایئے۔

تیسرے دن میں نیشاپور کے میدان میں پہنچا۔ یہ میدان نہ صرف ایران بلکہ تمام ایشیا میں مشہور ہے اس کو ایرانی جولان گاہ نیشاپور کہتے ہیں۔ ایرانیوں کے نزدیک یہاں کی ہوا سب سے زیادہ صاف اور معطر۔ یہاں کا پانی دُنیا بھر کے پانیوں سے شیریں اور اُس کی پیداوار بےمثل ہیں۔ واقعی یہاں کی سبزی اور شادابی اور ٹھنڈی ٹھنڈی فرح ہوا قابل دید تھی۔ مگر بجز یہاں کے مجھے اور کوئی دلچسپی یہاں دکھائی نہ دی۔ غالباً اس میدان کی تاریخ سے میں ناواقف رہتا لیکن اتنے میں یہاں مجھے ایک ایرانی مل گیا جس نے مجھے اجنبی مسافر سمجھ کر نا پرسیدہ اس میدان کی تعریف میں پل باندھ دیئے۔

نیشاپور بھی ایک معقول شہر ہے بازار میں یوروپین اور ایرانی اشیاء بھری پڑی ہیں لیکن یہاں اب وہ بات اور عمارت کی خوبی باقی نہیں رہی ہے جس کی اتنی تعریف یوروپین مورخ کر چکے ہیں اس شہر میں جواہرات کی تجارت ہوتی ہے۔ یہاں قیمتی پتھر صاف کئے جاتے ہیں اور دھوئے جاتے ہیں۔ مگر بعض اوقات ایرانی چھوٹے پتھر بھی حکمت عملی سے سچے بنا کر بیچتے ہیں

یہ پتھر اصلی حالت میں بھورے ہوتے ہیں لیکن متواتر پالش کئے جانے کے بعد ان کا رنگ آسمانی ہو جاتا ہے ان چھوٹے جواہرات کا رنگ کچھ عرصہ کے بعد زایل ہو جاتا ہے۔ ورنہ پہلے اصل اور نقل میں تمیز کرنی بہت دشوار ہوتی ہے جس قدر زیادہ گہرا رنگ ہوتا ہے اسی قدر پتھر کی شکل زیادہ نمایاں ہوتی ہے اور سطح صاف اور قیمت زیادہ ہو جاتی ہے۔ کسی زمانے میں ایران سے اکثر جواہرات یوروپ اور خصوصاً روس میں جاتے تھے مگر اب یہ تجارت ماند پڑتی جاتی ہے۔

نیشاپور سے تین دن کے سفر کے فاصلہ پر ایک مقام سبزوار ہے۔ درمیانی چار پڑاؤ چونکہ ترکستان کی سرحد سے ملتے ہیں وہاں ترکمانوں کی شرارت کا ہمیشہ ڈر رہتا ہے اور چونکہ درمیان میں کوئی پہاڑ یا دریا حایل نہیں ہے یہ لوگ اکثر سرحد ایران میں آکر لوٹ مار کرتے ہیں۔ ان ترکمانوں کی ایرانی ہمیشہ عجیب عجیب کہانیاں سناتے ہیں۔ ایک شخص نے مجھے لکھا کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک ایرانی جرنیل چھ ہزار سواروں کی جمعیت سے اس میدان میں مقیم تھا۔ اُس نے اپنی تمام فوج آگے بھیجدی۔ اور آپ چند منٹ کے لئے پیچھے رہگیا اُس کا منشاء تھا کہ حقہ پی کر فوج سے جا ملوں گا۔ ابھی اُس نے حقہ دل بھر کر نہ پیا تھا کہ ترکمان آگئے اور اُس کو زبردستی گھوڑے پہ سوار کرکے لے گئے اور بخارا میں ۲۵ درہموں کو بیچ ڈالا۔

ایک اور شخص نے مجھے ایک قصہ سنایا کہ ایک دفعہ امام رضا کی خانقاہ کے قریب ایک ایرانی ترکمانوں کے ہاتھ آگیا۔ مگر خوش قسمتی سے اُس نے اُنکو دُور سے دیکھ لیا اور اُنکے آنے سے پہلے اپنی نقدی ایک پتھر کے نیچے چھپا دی ترکمانوں نے اُسے خیوا میں لیجاکر بیچدیا آخر اُس نے اپنی بیوی کو وہاں سے

خط لکھا کہ یہاں میں غلام بنگیا ہوں اور خدمتگاروں کی طرح کام کرتا ہوں۔ فلاں مقام میں جاؤ۔ وہاں میں نے ۵۰ ڈکیٹ چھپا دیئے ہیں۔ اُن میں سے ۲۰ ڈکیٹ مجھے بھیجو کہ کسیطرح میں آزاد ہو جاؤں اور باقی اپنے پاس امانت رکھو جب آؤں گا لے لوں گا۔

دراصل ساری خرابی ایرانیوں کی اپنی ہے وہ فوراً اس قدر بزدلی اختیار کر لیتے ہیں کہ اُن کے دشمن شیر ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اُن کے قافلوں کے ساتھ سواروں کے مسلح دستے ہوتے ہیں اور تعداد کے لحاظ سے تو اُن کا کچھہ حد حساب ہی نہیں ہوتا۔ لیکن جوں ہی وہ چند ترکمانوں کو دیکھتے ہیں اُنکا دم فنا ہو جاتا ہے اہل قافلہ اور سوار ہتھیار پھینک دیتے ہیں۔ اور کل مال واسباب اُن کے حوالے کر کے اُن کے سامنے ہاتھہ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہرچند لوگوں نے مجھے اس راہ میں ڈرایا۔ مگر چونکہ میں نے سُنّی ترکمانوں کا لباس پہنا ہوا تھا اس لئے میں مطلق نہ ڈرا۔ بلکہ مجھے یقین تھا کہ اگر مجھے ترکمان مل گئے تو اُن سے بھی میں کچھہ لے ہی مروں گا۔ البتہ میرا تاتاری رفیق سہما ہوا تھا۔ چار دن مجھے اس راہ میں گذرے۔ ان چار یوم میں ہمیں بجز چند ایرانی حاجیوں کے اور کوئی شخص راہ میں نہ ملا۔

چار دن کے سفر کے بعد ہمیں دور سے **شاہرود** کے باغ نظر آئے ان باغات کے دیکھنے کو ہماری آنکھیں ترستی تھیں۔ ہمارے جانور بھی باغات کو دیکھکر خوش ہوئے۔ مگر یہ باغ ابھی ہم سے پانچ جرمن میل کے فاصلے پر تھے لیکن چونکہ یہ مقام پہاڑ کے دامن میں ہے اس لئے سطح میدان سے باغ بہت قریب معلوم ہوتا ہے راستہ یہاں بڑا بے لطف ہے۔ گرمیوں میں پانی کی قلت سے بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ پہلے میں ایک گاؤں کو شاہرود سمجھکر

وہیں اُتر پڑا مگر پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ شاہ رود نہیں ہے تو مجھے سخت غصہ آیا اور دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر شاہ رود میں داخل ہوا۔ چونکہ رات کے بارہ بجے سے سوار تھا۔ اور اب شام کے ۶ بجے گھوڑے سے اُترنا نصیب ہوا تھا۔ اس لئے میرا گھوڑا اور میں تھک کے چور ہو گئے تھے جب میں کاروان سرائے میں داخل ہوا تو وہاں میں نے ایک انگریز بیٹھا ہوا دیکھا۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ میری آنکھیں غلطی کھا رہی ہیں۔ مگر غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ واقعی ایک کوٹھڑی کے دروازہ میں ایک انگریز بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہے۔ شاہرود جیسے مقام میں ایک انگریز کا تنہا موجود ہونا واقعی ایک اچنبھا تھا۔ اگرچہ میں تھکا ہوا تھا۔ مگر فوراً اس کی طرف گیا۔ اور انگریزی زبان میں اوس سے پوچھا کہ آپ کا مزاج کیسا ہے پہلے تو اوس نے میری بات نہ سُنی۔ مگر جب دوبارہ میں نے اپنا سوال دُہرایا تو وہ گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ کبھی وہ میرے بخاری لباس کو دیکھتا تھا اور کبھی میرے چہرے کو پھر اُس نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے انگریزی کہاں سیکھی شاید ہندوستان میں سیکھی ہوگی؟ میرا ارادہ ہوا کہ اُس سے بھی تمسخر کروں مگر تکان نے اجازت نہ دی۔ اس لئے میں نے اُس کو اپنا حسب و نسب بتا دیا۔ اور اس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور اپنی کوٹھڑی میں لے گیا۔ میرا رفیق جو اب تک مجھے سچا مسلمان سمجھے ہوئے تھا یہ حال دیکھکر بہت متعجب ہوا۔ انگریز مذکور مجھ سے ملکر بڑا خوش ہوا۔ کیونکہ چھ ماہ سے وہ یوروپین احباب کی محبت سے بچھڑا ہوا تھا۔ افسوس کہ وہ بےچارہ اس اتفاقیہ ملاقات کے چند ماہ بعد راہ میں مارا گیا۔ اُس کا نام لانگ فیلڈ تھا اور لنکاشایر کے کسی بڑے کارخانے کا ایجنٹ تھا۔ اُس کے پاس بہت سا روپیہ تھا۔ اور روئی خریدنے کو یہاں آیا تھا۔ افسوس کہ درد و نگو گماشتہ

اصلیت کو چھپاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ایران ابھی وہ مہذب ملک نہیں ہے کہ جہاں فرمانوں یا راہداری کے پروانوں پر انسان بھروسہ کرسکے۔

ابھی طہران یہاں سے گیارہ منزل دُور تھا۔ مگر اَب آگے راستہ صاف تھا اور راہ میں چور چکار کا ڈر نہ تھا۔ ان منزلوں کے متعلق اَب صرف یہ امر قابل بیان ہے کہ خراسان کے باشندوں اور عراق کے باشندوں میں فرق ہے۔ خراسانی چونکہ وسط ایشیا کے قریب ہیں۔ اس لئے اُن میں وحشیانہ صفات موجود ہیں۔ عراقی پرلے درجے کے ظاہردار ہیں۔ اور شائستگی کا دم بھرتے ہیں۔ اگر مسافر مالدار ہے تو یہ لوگ ضرور اُس کی آؤبھگت کریں گے۔ ناظرین کو ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہیئے کہ عراقی بھی مشہور حریص ہیں اُنکی ظاہرداری پر نہ جانا چاہئے۔ اگر اُن کو معلوم ہو جائے کہ تمھارے پاس روپیہ ہے تو پھر ہرگز اُسے نہیں چھوڑتے۔ میرا دستور تھا کہ جب کبھی یہ مجھے کوئی تحفہ یا کھانے پینے کی شے دیتے تھے تو میں نہایت عمدہ الفاظ میں اُن کی تعریف کرتا تھا اور سعدی اور حافظ کے اشعار پڑھتا۔ مگر اُس شے کے کھانے میں ان کو بھی ضرور اپنے ساتھ شریک کرلیتا یہ ظاہردار لوگ بہت جلد بھول جاتے تھے کہ یہ شے ہماری ہی دی ہوئی ہے اور خوانچہ پر بیٹھکر دونوں دونوں ہاتھوں سے میرے ساتھ کھانے میں شریک ہوتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ آفندی تو ایرانیوں سے بڑھکر ایرانی ہے۔ تیری ظاہرداری ایرانیوں کی ظاہرداری کے پَر کترتی ہے۔

جوں جوں ہم طہران کے قریب پہنچتے جاتے تھے۔ سردی کی شدت ہوتی جاتی تھی۔ جاڑے کا موسم اور ماہ دسمبر کا آخیر تھا۔ سردی میدان ہی میں محسوس ہونے لگی تھی لیکن زیادہ بلند مکانات میں اُس کی شدت دو چند تھی۔

ایران میں موسم جگہ جگہ مختلف ہوتا ہے۔ کہیں معمولی سردی ہوتی ہے کہیں دانت سے دانت بجنے لگتے ہیں۔ گونشی میں تو مینے شب کاروانسرے میں آرام سے گذار دی کیونکہ تمام سراے میرے لئے موجود تھی۔ لیکن جب اگلے دن آہوان کو روانہ ہوا تو سردی سے سُن ہو گیا بار بار میں گھوڑے سے اُتر کر پاپیادہ چلتا تھا تا کہ چلنے سے میرے پاؤں گرم ہو جائیں۔ سڑک کے دونوں طرف برف کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل کے بعد افتان و خیزاں میں چاپر خانہ میں پہنچا۔ پوسٹ ماسٹر نہایت شریف انسان تھا وہ مجھے اندر لے گیا اور کہنے لگا کہ مکان حاضر ہے۔ مگر یہاں سپہ سالار کی بیوی جو ایک شہزادی ہے آج رات کو چالیس سے ساٹھ غلاموں کے ساتھ یہاں آنیوالی ہے۔ میں نے کہا دیکھا جاویگا۔ اُس کمرے میں آکر میں نے انگیٹھی میں آگ جلوائی۔ گرم گرم چائے پی۔ پلاؤ اور مرغی کا سالن کھایا اور آرام سے بستر پر کپڑے اوتار کر لیٹ گیا۔ مگر ابھی مجھے لیٹے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ باہر مجھے سواروں کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ میں بستر سے اوٹھکر بیٹھ گیا۔ یہ سوار فوراً شور و غل کرتے اور بیہودہ بکتے صحن میں آگئے اور میری کوٹھری کا دروازہ زور سے کھٹکھٹا کر کہا۔ کون ہے باہر نکل۔ شہزادی صاحبہ جو سپہ سالار کی اہلیہ ہیں تشریف لائی ہیں وہ یہاں مقیم ہوں گی۔ اُن کے لئے جگہ چاہئے مینے کپڑے اتارے ہوئے تھے۔ اور ابھی کئی وجوہات کے باعث مینے دروازہ کھولنے میں تامل کیا ان سواروں نے پوسٹ ماسٹر سے پوچھا کہ اندر کون ہے اور جب اُس نے بتایا کہ ایک حاجی ہے۔ اور حاجی ہی سُنکر تو وہ آگ ہو گئے اور کہنے لگے کہ حاجی باہر نکل آ۔ ورنہ ابھی تیری ہڈیاں سرمہ کر دینگے۔

میں حیران ہوا کہ اب کیا کروں۔ ایسے وقت میں باہر نکالا جانا واقعی خطرناک تھا۔ اگر میں سردی کہا جاتا تو جان کے لالے پڑ جاتے۔ اِن سواروں کی

درشت کلامی اور اپنی نازک حالت کے باعث مجھے غصہ آگیا۔ اور میں نے ڈھال تلوار سنبھال لی۔ اور تاتاری رفیق کو پستول دیکر کہا کہ جس وقت کہوں فوراً پستول دیکر کہا کہ جس وقت کہوں فوراً پستول داغ دینا۔ مجھے صاف ایرانی زبان میں گفتگو کرتا سن کر اور ہتھیاروں کی جھنکار سے بزدل ایرانی چکرا گئے آخر یہ نرم زبانی انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ میں نے کہا کہ گیسا ابھی را۔ اور کرن حاجی میں یورپین ہوں اور میرا نام ویمبری صاحب ہے۔ یہ سن کر ایرانیوں پر وہی اثر ہوا۔ جس کا مجھے خیال تھا۔ وہ ڈر گئے۔ اور بہت خوشامد سے کہا کہ براہ مہربانی دو کے لیئے اندر جگہ دیدو۔ اور باقی ہم سب اصطبل اور برآمدے میں گذارہ کرلیں گے۔ میرے تاتاری رفیق نے جب میری زبان سے سنا کہ میں فرنگی ہوں تو اس کا رنگ زرد ہوگیا۔ اور اسکی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ وہ ابھی تک مجھے مسلمان سمجھے ہوئے تھا۔ لیکن میں نے آنکھ کے اشارے سے اسکو مطمئن کردیا۔ غرض ان لوگوں کی منت سماجت سے میں نے دروازہ کھولا۔ اور دو کو اندر آنے کی اجازت دی۔ باقیوں کو اصطبل اور غلہ خانے میں سونا نصیب ہوا۔ سواروں نے میری شکل سے فوراً پہچان لیا کہ میں سچ کہتا تھا تو مسافر جواب اس کمرے میں آئے وہ بھنگ کے نشے میں سرشار تھے۔ چنانچہ رات بھر بلند آواز سے گھوڑوں کی طرح خراٹے لیتے رہے۔ علی الصباح میں برف پوش پہاڑیوں کو چھوڑ کر دامغان کے پر فضا میدان میں آیا اور راہ میں اپنے تاتاری رفیق کی تسلی کردی۔ اب مجھے خیال آیا کہ میں نے کیوں جلدی کرکے اپنا حسب ونسب بتلایا۔ اور اپنے آپ کو معرض خوف وخطر میں ڈالا۔

دامغان وہ مقام ہے جسکو قدیم زمانے میں "ہیکاٹامپائلی" سو دروازوں والا شہر کہتے تھے۔ ہر چند کہ ہمارے علماء علم آثار اسی بات پر جمے ہوئے ہیں مگر مجھے کوئی

بات ایسی نظر نہ آئی جس سے معلوم ہو کہ واقعی اس شہر کے سو دروازے ہونگے۔ میرے خیال میں یہ یونانیوں اور ایرانیوں کے مبالغہ کا نتیجہ ہے۔ اب اس جگہ بمشکل ایکسو مکانات ہونگے۔ اور دو معمولی حیثیت کے کاروان سرائے ہیں تجارت بھی یہاں کوئی ایسی نہیں ہوتی کہ قابل بیان ہو۔

دمغان سے دو پڑاؤ گذر کر میں سمنان میں داخل ہوا۔ یہاں کی روٹی اور اس سے زیادہ چلے کے کلچے مشہور ہیں۔ ایران کا ہر شہر کسی نہ کسی خاص بات کے لیے مشہور رہا۔ مثلاً شیراز کی بھیڑیں۔ اصفہان کے شفتالو۔ نطنز کی ناسپاتیاں مشہور ہیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ جو شہر جس چیز کے لیے مشہور رہے وہی وہاں نہیں ملتی۔ اور اگر ملتی ہے تو اس میں ہرگز وہ تعریف نہیں پائی جاتی جسکا ذکر ہر فرد بشر کی زبان سے سنا جاتا ہے مثلاً مشہد میں آنے سے پہلے ہرات میں مینے سمنان کے چائے کے کلچوں کی بہت تعریف سُنی تھی۔ یہاں مینے بڑے اشتیاق سے اُنکی تلاش کی۔ اول تو وہ ملے ہی نہیں۔ اور ملے تو بہت بُرے۔ دوکانداروں کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ اکثر بہانے بھی بناتے ہیں مگر بعض نے صاف صاف کہدیا کہ اب بُرا زمانہ آیا ہے۔ اس لیے کلچوں میں بھی وہ بات نہیں رہی۔ بعض جگہ تو اہل شہر اتنا عذر بھی نہیں کرتے جس سے انکے دعوے کی صریح تکذیب ہوتی ہے۔ مشہد میں داخل ہونے کے وقت جو کیفیت مجھے محسوس ہوئی تھی وہی اب پھر جب میں طہران کے قریب پہنچگیا۔ تو مجھے محسوس ہونے لگی۔ میری آنکھیں ان دوستوں کے لیے بیقرار تھیں جو غالباً میری غیبت میں یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ مینے اپنی حماقت کا نتیجہ اُٹھالیا۔ اور کہیں اس پُرخطر سفر کے دوران میں مارا گیا۔

فصل بست و نہم

طہران سے طرابزون تک

جب دار الخلافہ ایران میں میں دوبارہ آیا تو مجھے شائستگی کے لحاظ سے وہ تمام باتیں یہاں نظر آئیں جو انسان کو قومی طرز زندگی میں مطلوب ہوتی ہیں۔ بیشک اِس شخص کے لیئے جو تازہ تازہ یورپ سے آئے طہران کی پیچیدہ گلیاں اور تنگ جھونپڑیاں ایک بڑا بھاری نقص نظر آتا ہے۔ مگر اُس شخص سے پوچھیے جو سیدھا بخارا سے آرہا ہو۔ بخارا اور طہران میں صرف ساٹھ یوم کے سفر کا فاصلہ ہے۔ مگر جو اختلاف دونوں شہروں کی شائستگی میں ہے وہ کہیں صدیوں میں جاکر پورا ہوگا۔ جس طرح میرا تاتاری رفیق بچوں کی طرح ہر ایک چیز کو جو یورپ سے بازاروں میں آئی تھی دیکھتا۔ اور خوش ہوتا تھا وہی حال اس وقت میرا تھا۔ میری اس حالت سے ناظرین کو متعجب نہیں ہونا چاہیئے میں نے اپنی زندگی کو اس قدر تاتاریوں کی طرز پر بدلا تھا کہ میری ایک گونہ قلب ماہیئت ہوگئی تھی۔ تاتاریوں کے درمیان مجھے ہر وقت اپنی اصلیت کو چھپانا پڑتا تھا۔ ہر وقت مجھے جھوٹ بولنا پڑتا تھا۔ اگرچہ یہ عادات جو مجبوری کے عالم میں انسان کو ڈالنی پڑتی ہیں۔ انسان کی سرشت پر کوئی نمایاں

اثر کریں تو جائے تعجب نہیں ہے۔ سیاح کی طبیعت ہزار کوشش کرے کہ اپنی ظاہری حالت کے خلاف رہے۔ لیکن ظاہری حالت اُس پر اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ گذشتہ خیالات اور عادات رفتہ رفتہ مٹتے جاتے ہیں۔ اور جو حالت سیاح نے اختیار کی ہے وہ آخرکار اُسکی فطرت کا جزو ہو جاتی ہے۔

مجھ میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔ اسلئے جب میرے یورپ کے دوست مجھ سے ملے تو اُنہوں نے ازراہ مذاق میری ایک ایک بات پر خوردہ چینی کی بلکہ یہاں تک کہا کہ تیری لُٹ کا یا پلٹ ہو گئی اور تو صورت شکل کے لحاظ سے بھی خاصہ تاتاری ہو گیا ہے۔ میں نے اس مذاق سے بُرا نہ مانا۔ میں نے کہا کہ شکر ہے میں کسی طرح پھر اہل مغرب میں آ گیا۔ تاہم جب میں دوبارہ اپنی برادری میں آیا۔ اور کسی قدر امن و امان کی زندگی نصیب ہوئی تو اس عرصے میں اپنی سابقہ عادات اور اطوار کو دوبارہ اختیار کرنے میں بھی مجھے دقت ہوئی۔ یورپین چست لباس مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے میں شکنجہ میں کسا گیا تھا۔ اب مجھے سر کے لمبے بال منڈانے پڑے۔ اہل یورپ کی گرمجوشی اور مصافحہ کے وقت جست و خیز مجھے جوشِ جنون معلوم ہونے لگا۔ ایرانی فوج میں جو فرانسیسی ملازم تھے اُنکی سج دھج اور چال ڈھال مجھے اُس وقت نہ صرف عجیب اور مصنوعی معلوم ہوئی بلکہ اُن سے اپنے یورپین بھائیوں کے مقابلہ میں یہ یورپین کیسے شاندار نظر آتے تھے۔ غرض میرے دل پر عجیب حالتیں اُس وقت طاری تھیں اُنکا بیان فضول ہے۔ مختصر یہ کہ بخارا کے مقابلہ میں طہران مجھے پیرس نظر آتا تھا۔

جب ایرانیوں نے میری سرگذشت سُنی تو سخت متعجب ہوئے کتمان اسرار ایک مشرقی صفت ہے۔ اور اہل مشرق کا خیال ہے کہ صرف ہمیں لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جب اُنہوں نے ایک مغرب کے باشندے کی اس صفت کو

ایسی کمالیت کے ساتھ بناتے دیکھا تو اُنکو سخت حیرت ہوئی۔ اِسمیں شک نہیں کہ اگر میں ایرانیوں کے بڑے دشمن سُنّی ترکمانوں کا مذاق نہ اُڑاتا رہتا تو یہ لوگ میرے سفر کی کامیابی کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے۔ اور مجھے لینے کے دینے پڑ جاتے ہر چند کہ طہران ترکستان کے بے آب و علف جنگلوں کے قریب ہے۔ مگر یہاں کے بہت کم باشندوں کو ان جنگلوں کے حالات معلوم ہوئے ہیں۔ اِس لیئے ہزاروں قسم کے سوالات لوگ مجھ سے آکر پوچھتے تھے۔ مجھے کئی وزرا نے بھی مدعو کیا اور پھر ناصرالدین تاجدار شاہ ایران کی خدمت میں بھی میں پیش کیا گیا۔

ایرانی اپنے بادشاہ کو شاہ جہاں کہتے ہیں۔ بادشاہ سلامت سے میں نے محل سرائے کے باغ میں ملاقات کی۔ اور اِس موقع کے تمام تکلیف دہ تکلفات کو مجھے پورا کرنا پڑا۔ شاہ نے بڑی نوازش سے فرمایا کہ اپنی سرگذشت مجھے سناؤ میں نے بکشادہ پیشانی حضور ممدوح کے حکم کی تعمیل کی۔ وزرا میری بے تکلفی دیکھکر حیران ہوئے اور بعد ازاں اُنہوں نے مجھے کہا کہ واقعی تو عجیب انسان ہے کہ ایسے بادشاہ کے رُعب میں نہ آیا۔ شاہ ایران میری سرگذشت سُن کر ایسے خوش ہوئے کہ اُنہوں نے مجھے تمغہ شیر و آفتاب عنایت کیا اور ایک ایرانی شال بھی عطا کی۔ تمغہ جو ایک چاندی کا ٹکڑہ تھا۔ مجھے پہنچ گیا۔ مگر شال جو کم سے کم پچاس درہم کی تھی وزیر نے خود غصب کر لی۔ اِس بات سے ناظرین متعجب ہوں خود بادشاہ سلامت اپنے وزرا سے جھوٹ برتتے ہیں اور اُنکو دھوکا دیتے ہیں اِس لیئے وزیر اُس سے دو چند فریب کرتے ہیں۔ اہلکار لوگوں کو اور لوگ اہلکاروں کو فریب اور جُل دیتے ہیں۔ ایران میں کوئی ہی شخص ایسا ہو گا جو جھوٹ بولنا اور فریب دینا نہیں جانتا۔ لطف یہ ہے کہ اِس بات کو بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ دیانتدار اور راست بازی کو

۱؎ ایران کی خصوصیت کیا ہے۔ دنیا کے اکثر ملکوں کا یہی حال ہے ۱۲

دیوانہ اور سٹری سودائی سمجھتے ہیں۔

اس بارہ میں میں ایک واقعہ بطور مثال بیان کرتا ہوں۔ شاہ ایران کو شکار کا بہت شوق ہے۔ وہ بڑے نشانہ باز ہیں۔ سال میں نو ماہ جہاں پناہ شکار میں مشغول رہتے ہیں۔ بادشاہ کی اس حرکت سے اعیان سلطنت سخت بیزار ہیں۔ کیونکہ اُنکو بھی حرم سرائے کی آرام و آرایش چھوڑ کر خیموں میں رہنا پڑتا ہے جب بادشاہ شکار سے واپس آتے ہیں تو وہ تیتر یا بارہ سنگھے وغیرہ جو شکار کرتے ہیں تحفہ کے طور پر یورپ کے سفیروں کے پاس بھیجتے ہیں۔ یہ بات بادشاہ کی بڑی مہربانی سمجھی جاتی ہے۔ اور جو شخص یہ جانور لیکر سفیروں کے پاس جاتا ہے اُسکو بہت سا انعام ملتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ تحائف اس کثرت سے آنے لگے تو سفیروں کو شک ہوا کہ بادشاہ خود نہیں بھیجتے بلکہ خدمتگار خود بادشاہ کا نام لیکر انعام کی خاطر یہ کارستانی کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ انتظام کیا گیا کہ آئندہ اگر تحفہ بھیجا جاوے تو وزیر خارجہ کا سارٹیفکٹ ساتھ ہو۔ کچھ عرصہ تک تو انتظام ٹھیک رہا۔ پھر وہی پہلی سی کثرت شروع ہوگئی اور تحقیقات سے معلوم ہوا کہ خود وزیر صاحب بھی اس کام میں حصہ دار تھے۔ جب بادشاہ کو معلوم ہوا تو اُنہوں نے یہ کہدیا کہ وزارت پناہ نے مذاق کیا تھا۔

جاڑے کا تمام موسم طہران میں بسر کرنے کا میرا ارادہ تھا۔ اس لئے یہاں مجھے دو ماہ کامل رہنا پڑا۔ یہ وقت میں نے اہل یورپ کی چھوٹی سی بستی میں بڑے آرام سے کاٹا۔ یہ لوگ میری واپسی پر بہت خوش ہوئے۔ اور اُنہوں نے کئی طور پر اظہار مسرت کر کے مجھے ممنون احسان کیا۔ ان سفیروں نے اپنی اپنی گورنمنٹ کو میرے کارناموں سے مطلع بھی کر دیا۔ اور مجھے واقعی تعجب ہوا۔ کیونکہ جو میری قدر و منزلت ہوئی اُسکا مجھے شان و گمان تک بھی نہ تھا۔

مجھے اِس بات کا فخر ہے کہ جب میں طہران سے روانہ ہوا تو سفیروں نے مجھے انگلستان اور فرانس کے بڑے بڑے مدبران ملک کے نام سفارشی خط دیئے ایک میرا ہم وطن مسٹر سوز نیٹو طہران میں درزی کی دوکان کرتا تھا۔ یہ ہنگری کا باشندہ تھا۔ اُس نے میری بہبودی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ اُس شخص کی بھی سرگذشت عجیب تھی۔ یہ تھیس کے کنارہ پر پیدا ہوا تھا۔ اور چونکہ یہ جبرًا سپاہی نہ ہونا چاہتا تھا۔ اِس لئے اپنے مُلک سے نکلا اور براہ قسطنطنیہ ایشیا کوچک اور رجوب میں پہنچا۔ اور پھر جنوبی ایران سے ہندوستان گیا۔ اِس شخص نے یہ تمام سفر پا پیادہ ہی کیئے تھے۔ ۱۸۴۸ء میں وہ چین میں جانے والا تھا کہ اُسکو خبر پہنچی کہ اُسکے اہل وطن نے خودمختاری کے لیئے شورش کی ہے۔ یہ وہیں سے واپس آیا۔ تاکہ بحیثیت سپاہی اُس کارروائی میں شریک ہو۔ لیکن اُس نے ایشیا اور یوروپ کے دور و دراز فاصلے اور اپنے قلیل وسائل کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ جب پا پیادہ یا بادبانی جہازوں کے ذریعے وہ استنبول پہونچا تو اُس نے یہاں وانگاس کی لڑائی اور بغاوت کے انجام کا حال سنا ناچار مایوس ہوکر پھر خانہ بدوشی اختیار کی اور براہ تبریز طہران میں خیاطی کی دوکان کھول لی۔ یہ شخص عجیب زبان بولتا تھا۔ جب کسی امر میں گفتگو کرتا تھا تو اول تو ہنگری میں گفتگو کرتا تھا۔ پھر جب اُسے جوش آتا تو عربی۔ ترکی۔ جرمن فارسی۔ فرانسیسی اور ہندوستانی الفاظ کثرت سے استعمال کرتا تھا۔ جس سے اُس کے ساتھ گفتگو کرنے والے کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ یہ شریف دل میری واپسی پر بہت خوش ہوا۔ اور اگرچہ مفلس تھا مگر اُس نے مجھے ایک پتلون اپنی سی ہوئی نذر دینی چاہی۔ اور جب میں نے بڑے اصرار سے انکار کیا تو اُس نے میرے تاتاری رفیق کو دیدی پہلے تو وہ یہ عجیب پاجامہ دیکھکر ہنسا

اور پھر جب اُسنے اُسکو شو قیہ پہنا تو سو زنیٹو بہت خوش ہوا۔ اور کہنے لگا کہ میں پہلا درزی ہوں جس نے ایک تاتاری کو پتلون پہنا کر چھوڑی۔

اِس موقع پر میں ایک اور یورپین کا ذکر کرنا بھی یہاں مناسب سمجھتا ہوں۔ اِس شخص کا نام ایم ڈی بلاکو یولی تھا۔ جو آجکل فوٹو گرافری کرتا تھا۔ اور شاہ ایران کا خاص فوٹوگرافر تھا۔ یہ بدقسمتی سے ترکمانوں کے برخلاف ایرانیوں کے ساتھ چڑھائی میں گیا۔ اور گرفتار ہو گیا تھا۔ اور آخرکار دس ہزار درہم دیکر آزاد کرایا گیا تھا۔ دراصل یہ فرانس کا رہنے والا تھا اور تلاش معاش میں ایران میں آیا۔ بخلاف اور اہل یوروپ کی جو قدیم سے یہاں ڈاکٹری کرنے آتے رہتے ہیں اُسنے یہ نیا پیشہ اختیار کیا تھا اور جب امید اُسکو اِس سے فایدہ بھی بہت ہوا۔ شاہ ایران نے اِسکو شاہی مُصوّر مقرر کیا۔ بادشاہ کو یہ گمان تھا کہ جس وقت یہ میدان جنگ میں میری فوج کی تصویر اُتاریگا۔ میرا ہر ایک سپاہی بجائے خود ایک رستم معلوم ہوگا۔ مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ بادشاہ کی فوج کے پچیس ہزار رستموں کو پانچہزار ترکمانوں نے سخت شکست دی۔ اور بہت سے ایرانی غلام بنالیئے۔ بیچارہ مصوّر بھی قید ہو کر غلام ہو گیا۔ باقی ایرانی تو پانچ پانچ چھ چھ درہم اداکرکے آزاد ہو گئے مگر اِس مصوّر کو اُسکی شکل صورت سے اُنہوں نے بہت بڑا معزز آدمی سمجھا۔ اور زیادہ قیمت مانگی۔ جتنا ایرانیوں نے انکار کیا اُتنا ہی ترکمان قیمت بڑھاتے گئے۔ آخر مطالبہ دس ہزار درہم تک پہنچا دیا۔ بھلا یہ رقم ایرانی کب دیتے تھے۔ آخرکار گورنمنٹ فرانس نے اپنے سفیر کے ذریعے دھمکی دی کہ اگر گورنمنٹ ایران فدیہ نہیں ادا کرسکتی۔ اور اِس غرض کے لیئے کافی درہم نہیں رکھتی تو ہم اپنے سفیر کو فرانسیسی سنگین عاریت دیگی۔ اِس دھمکی کا

کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ایرانیوں نے دس ہزار درہم دیکر مصور کو رہا کرایا بیچارہ مدت تک مسلسل بطوق و زنجیر ترکمانوں کے خیموں میں نیم برہنہ رہچکا تھا۔ فاقوں کی مصیبت برداشت کرچکا تھا۔ اور جانتا تھا۔ کہ ترکمانوں کی نفیس سے نفیس نعمت گھوڑے کا گوشت ہے۔ چنانچہ جس وقت آزاد ہوا تو مارے خوشی کے رو پڑا۔ اُس شخص کو چونکہ وسط ایشیا کا تجربہ تھا۔ اس لیئے مجھہ سے بڑی ہمدردی سے پیش آیا۔

ان ایام میں چند ترکمان استر آباد میں آئے ہوئے تھے۔ وہ میرا نام سنکر میرے پاس آئے اور مجھے کہنے لگے کہ فاتحہ پڑھ کر ہم پر دم کرو۔ آپکے دم کی گومش تپہ میں بڑی دھوم ہے۔ آپنے مایوسوں کو اچھا کر دیا تھا۔ لوگ دعائیں مانگتے ہیں کہ تم کسی طرح پھر وہاں آؤ۔ اگرچہ میں یورپ کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ یہ لوگ بلا تامل میرے روبرو دم کرانے آئے۔ یہ آخری جھاڑ پھونک تھی۔ جو میں نے ان ترکمانوں پر کی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اگر میں مقدس صورت بنا کر ان خانہ بدوشوں میں جا رہوں تو امید ہے کہ ضرور اُنپر حاوی ہو جاؤں بعض باہمت اشخاص اسی طرح کرتے ہیں۔ لوگوں سے کم ملتے ہیں اور اپنا زہد و تقوی گوشہ نشینی اور عزلت کی آڑ میں مشہور کرکے لوگوں کا دل تسخیر کر لیتے ہیں۔

جب موسم بہار کا آغاز ہوا تو میں طہران سے براہ تبریز۔ ارض روم و طرابزون بحیرہ اسود کیجانب روانہ ہوا۔ اُس وقت میری مالی حالت اچھی تھی سواری کا جانور بھی بہت عمدہ تھا۔ اور میں نہایت خوش و خرم اور بشاش تھا کوہ پاٹک کی چوٹی پر کھڑے ہوکر بحر اسود کی طرف دیکھا یہ وہی ساحل تھا۔ جہاں سے دو سال پہلے میں عجیب قسم کی بیدلی اور نا اُمیدی میں گیا تھا۔

اُس وقت وہی لائیڈ کمپنی کا لنگرگاہ اور پھریرہ جو دو سال پہلے لہرا کر مجھے الوداع کہہ رہا تھا اب ہوا میں لہرا کر مجھے خوش آمدید کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا ان منظروں کو دیکھکر میرے دل میں جو جو خیالات یکلخت پیدا ہوئے اُنکا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

ساحل پر پہنچنا اور جہاز میں سوار ہونا بمنزلہ یوروپ میں پہنچ جانے کے تھا۔ لائیڈ کے جہاز میں سب سامان یوروپین تھا۔ اور سب طرح کی آسایش میسر تھی اور یہی معلوم ہوتا تھا کہ گویا میں یوروپ میں پہنچ گیا ہوں۔

دو روز مینے طرابزون میں صرف کیے اور یہاں وہ تمام سامان جو میں نے ایشیائی سفر کے لئے بہم پہنچایا تھا۔ اور جس کی اب کچھ ضرورت نہ تھی بیچ ڈالا صرف چند چیزیں بطور یادگار سفر کے رکھ لیں اور ماہ مئی کے وسط میں میں یوروپ کو روانہ ہوا۔

فصل سی ام

گھر کی طرف

میں تبریز سے طرابزون میں اِس طرح گیا تھا جیسے فاتح مظفر و منصور اپنے مُلک کو واپس آتا ہے - اور جب میں سرحد ٹرکی میں داخل ہوا تو جو یورپین یہاں مجھے ملا اُس نے تسلیم کیا کہ واقعی تم کو اِس سفر میں بڑی تکلیف ہوئی ہے اسکے جب میں وسط ایشیا سے واپس آیا تو قسطنطنیہ اور **باسفورس** پہلے سے زیادہ مجھے خوبصورت معلوم ہوئے - اب چونکہ میں ایرانیوں اور تورانیوں کو دیکھ آیا تھا - اب مجھے ترک بالکل مُہذب معلوم ہوتے تھے - بلکہ خط و خال کے لحاظ سے بھی وہ زیادہ تر اہل یوروپ سے مشابہ معلوم ہوتے تھے - سب سے پہلے میں اسٹریا کے عالم سفیر کونٹ پروکیش آسٹن سے جو اب مرچکا ہے ملا - یہ ترکوں کے دارالخلافہ میں مجھ سے ہمیشہ بہت مہربانی کیا کرتا تھا - اب بھی مجھ سے نہایت مروت سے پیش آیا - جب میں اُس کے روبرو گیا تو پہلے اُس نے مجھے ہرگز نہ پہچانا اور جب میں نے جرمنی زبان میں اُس سے گفتگو شروع کی تو یہ نیک نہاد پیر مرد چشم پر آب ہوگیا - اور مجھے کہنے لگا " خدا کے لیئے ویمبری بتاؤ تجھے کیا ہوا یہ تو نے کیا کیا؟" جب میں نے اپنی تمام سرگذشت اُسکو سُنائی تو وہ متعجب ہوا - اور مجھے کہنے لگا کہ

میرے یہاں چند دن ٹھہرو۔ تاکہ تمہاری صحت درست ہو جائے۔ مگر مینے اُسکا شکریہ ادا کرکے اِس بات کو منظور نہ کیا۔ اِس بزرگ نے مجھے کئی باتیں سمجھائیں اور کہا کہ بہتر ہے کہ تم سیدھے لنڈن کو جاؤ۔ انگلستان میں وسط ایشیا کا جغرافیہ سیکھنے کا بہت شوق ہے۔ وہاں تمہاری بہت خاطر مدارات ہوگی۔ اور اگر تمہیں اِس بارہ میں کوئی کتاب لکھنی ہو تو بے سروپا دلیلیں تاریخی اور لغوی نوٹ درج کتاب نہ کرنا بلکہ مختصر اور پُرمعنی لکھنا۔

پھر مینے سلطان المعظم کے وزیر اعظم علی پاشا سے ملاقات کی اور اُسکو وسط ایشیا اور ایران کے لیئے ملکی معاملات سے آگاہ کیا۔ راہ میں مجھے کسی نے نہ پہچانا۔ اور وزیر اعظم نے بھی اِس لیئے پہچانا کہ میرا نام پیکر اُنکو اطلاع کیگئی تھی۔ وزیر اعظم نے میرے حال پر بڑی نوازش فرمائی۔ اور کہا کہ چندے یہاں ٹھہرو۔ لیکن مینے عرض کی کہ میں جلدی جاؤنگا۔ چنانچہ میں وزیر اعظم سے رخصت ہو کر بہت جلد بندرگاہ پر پہنچا۔ کیونکہ مینے آسٹرین لائیڈ کمپنی کے اُس جہاز میں سوار ہونا تھا جو قسطنطنیہ جانے کو تیار تھا۔ جب میں فندقلے کے قریب بندرگاہ پر پہنچا تو میرا دل بھر آیا۔ کیونکہ یہاں مینے اپنے اُس عزیز رفیق طریق تاتاری کو جو خیوا سے باسفورس تک میرے ہمراہ آیا تھا۔ رخصت کرنا تھا۔ اُسکو مجھ سے سچی محبت تھی۔ اور وہ درد دُکھ میں میرا شریک رہا تھا۔ میں بھی اُسکو حقیقی بھائی سمجھتا تھا میں نے اپنا تمام اسباب اور جو کچھ نقدی میرے پاس تھی۔ اُس کے حوالہ کردی صرف اِس قدر اپنے پاس رکھلی۔ جو بوڈاپسٹ تک میرے راستہ کے خرچ کے لیئے ضروری تھی۔ جب میں جہاز میں سوار ہونے لگا تو یہ شخص میرے ساتھ بغلگیر ہوا۔ اور رونے لگا۔ جب روتے روتے اُسکی طبیعت ذرا سنبھلی تو اُس نے کہا کہ رشید ہے میں تجھ سے جُدا نہیں ہوسکتا۔ بیشک کہ مکہ معظمہ کی زیارت بڑی شئے ہے

مگر میں اپنا وطن۔ اپنے عزیز اور زیارت مکہ معظمہ بھی تیرے لیئے چھوڑ دینے کو تیار ہوں۔ اور جہاں تو جائیگا وہیں تیرے ساتھ جاؤنگا۔ میں یہ گفتگو ایک وسط ایشیا کے طالبعلم کی زبان سے سنکر سخت حیران ہوا۔ اور اُسکو کہا کہ بھائی میں ایسے مُلک میں جاتا ہوں جہاں عیسائی رہتے ہیں سو وہاں جاکر تیرا واپس ہونا سخت دشوار ہو جائیگا۔ میں ناحق تجھے تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ یہ سنکر اُسکا رنگ زرد ہو گیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ بولا کہ خواہ تم کہیں جاؤ۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ اچھے آدمی بُری جگہہ نہیں جاتے۔ میں تمہارے ساتھ ضرور جاؤنگا۔ اور تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑونگا۔ میں یہ سُن کر مجبور ہو گیا۔ جہاز کا گھنٹہ بجنے لگا۔ اب زیادہ بحث سے کچھ فائدہ نہ تھا۔ میں اپنا اسباب اور تاتاری رفیق کو ہمراہ لیکر جہاز پہ سوار ہوا۔ اور ہم باسفورس سے قسطنطنیہ کو روانہ ہوئے۔

یہ سفر مجھے ۱۸۶۴ء کے ماہ مئی میں جانب پسٹ پیش آیا جب میں سرحد ہنگری کی طرف روانہ ہوا۔ تو جو شخص راستے میں مجھے ملتا تھا وہ میری تعریف کرتا تھا۔ میرے اہل وطن میرے آنے کی خبر سُنکر بہت خوش ہوئے۔ اُنکی خوشی سے مجھے یہ ظاہر ہوا کہ یہہ لوگ اس پُرانی بات کو نہیں بھولے کہ اِنکے مورث اعلیٰ وسط ایشیا سے آئے تھے۔ بوڈا پیسٹ میں سب سے پہلے مینے بیرن جوزف روٹوس سے ملاقات کی جو ہماری اکیڈیمی کا وائس پریسیڈنٹ اور میرا مربی تھا۔ اور جس نے ابتدا میں مجھے بڑی مدد دی تھی۔ یہ شخص نہایت فاضل آدمی تھا۔ مگر اب اُسکی صحت اچھی نہ تھی۔ اُس نے ایک نہایت عمدہ کتاب "اُنیسویں صدی کے موجودہ خیالات" لکھی ہے۔ جو جابجا فلسفہ سے پُر ہے۔ یہ مجھے دیکھکر بہت خوش ہوا۔ مگر ساتھ ہی اس نے مجھے یہ بھی کہا کہ ابھی تمکو تھوڑی دقتیں اور اُٹھانی ہونگی۔ اُس نے مجھے صلاح دی کہ فوراً لنڈن کو

جاؤ۔ چونکہ تمہارے پاس اچھے اچھے خط ہیں وہاں تمہارا استقبال بڑی گرمجوشی سے ہوگا۔ طہران میں بھی سر چارلس ایلیسن اور مسٹر ٹامسن نے جو انگریزی سفیر متعینہ ایران تھے۔ مجھے یہی صلاح دی تھی۔ پس میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ جب کرایہ کا انتظام ہوگیا تو فوراً انگلستان کو جاؤنگا۔ اگرچہ پسٹ میں اخباروں میں میری بڑی تعریف ہوئی۔ اور مجھے دعوتیں دیگئیں۔ اور میرے لئے پارٹیاں ہوئیں۔ لیکن سفرخرچ کا بندوبست آسانی سے نہ ہوا۔ اس لئے مجھے اپنے عزیز تاتاری کو جس کا نام مُلّا اسحاق تھا یہیں چھوڑ جانا پڑا۔ افسوس کہ میں قلت روپیہ کے باعث اسکو لنڈن ساتھ نہ لیگیا ورنہ برلنگٹن ہوس میں رائل جاگرفیکل سوسائیٹی کے سامنے اُسکا پیش ہونا دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ ماہ مئی کے اخیر میں ہنگری سے سیدھا انگلستان کو روانہ ہوا ٭

فصل سی ویکم

انگلستان میں

دیکھئے چند ہفتوں میں کیسا انقلاب ہو گیا۔ میں وہی شخص تھا جو ابھی وسط ایشیا کے جنگلوں میں درویش بنا پھرتا تھا۔ اور اب دو ہفتوں کے بعد لندن یا بازل سے نکلکر وسط یوروپ میں ایک فاضل یوریپن بنکر داخل ہوا۔ اب میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اس انقلاب کا ابتدا میں مجھ پہ کیا اثر ہوا۔ یا تو میں بادیہ پیمائی اور سیر و سیاحت میں دن بسر کرتا تھا۔ یا گھروں کی چار دیواروں میں آگیا۔ اور یہ قید بے زنجیر مجھے کئی دن تک ناگوار معلوم ہوتی رہی۔ ایشیا میں میں ڈھیلے اور کھلے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ جنمیں آرام سے جہاں چاہتا تھا بیٹھ جاتا تھا۔ اور جس طرح چاہتا تھا لیٹ جاتا تھا۔ یوروپ کے کپڑے پہنکر میرا جسم شکنجہ میں کسا گیا۔ خصوصاً نک ٹائی (یہ ایک دھجی سی ہوتی ہے جو گردن میں لٹکا لیجاتی) مجھے سخت ناگوار تھی۔ کئی دن تک مجھے یوروپ کے کھانوں میں مزہ نہ آیا۔ کیونکہ سالہا سال سے میں ہاتھوں سے کھانا کھانیکا عادی ہو رہا تھا۔ اب پھر مجھے چھری کانٹا استعمال کرنا پڑا۔ جن کے استعمال کی عادت مجھے بالکل نہ رہی تھی۔ اِسلئے اکثر میں غلطی کرتا تھا۔ اور

اپنی غلطی پر مجھے خود ہنسی آ جاتی تھی۔ میں مثل اُن نیم وحشی لوگوں کے تھا جو افریقہ سے یا ایشیا سے آ کر پہلے پہل یورپ کی سوسائٹی میں داخل ہوتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ کس طرح انگلش سوسائٹی کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے اِن غلطیوں کو تحمل سے برداشت کیا۔ جب میں لنڈن میں آیا تو مینے اُن خطوط کے ذریعہ جنہیں اپنے ساتھ لایا تھا۔ ملاقاتیں شروع کیں۔ پہلے میں سر ہنری رالنسن سے ملا جو وسط ایشیا کے علمی اور ملکی معاملات میں اب تک بڑی بھاری سند سمجھے جاتے ہیں۔ یہ اندنوں برکلے سٹریٹ واقع برکلے سکوئر میں رہتے تھے۔ جب میں اُنکے مکان پر گیا یہ بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ اگرچہ میں انگریزی بول سکتا تھا۔ مگر زیادہ تکلف اور خیال کر کے مینے اُنسے فارسی زبان میں گفتگو کی۔ واقعی یہ نہایت صفائی کے ساتھ فارسی زبان میں اپنا مطلب کر سکتے ہیں۔ زیادہ تر ہماری گفتگو بخارا خیوا ہرات اور ترکستان کے معاملات پر ہوئی۔ اور اس فاضل شخص کی معلومات واقعی بڑی وسیع اور حیرت انگیز تھیں۔ ہرات کے محاصرہ کی نسبت جو امیر دوست محمد خان نے کیا تھا اور اس مہم کے متعلق جو امیر بخارا نے خدا یار خان کی پاس خاطر سے قوقندیوں کے مقابلہ میں فتح کی تھی۔ جب گفتگو ہوئی تو اُس فاضل شخص نے بہت دلچسپی ظاہر کی۔ پھر مینے یہ بھی ذکر کیا کہ مینے افواہ سُنا تھا کہ روسی زیر کمان چرنیاف آگے بڑھ رہے ہیں۔ سر ہنری کی گفتگو بجائے خود ایک جرح تھی اور جب میں ایک گھنٹہ برابر گفتگو کر کے اُنسے رخصت ہوا تو میرے دل نے گواہی دی کہ اِس ملاقات کا اثر اُنپر اچھا ہوا ہے۔

پھر میں سر راڈرک مرچیسن کے ہاں گیا۔ یہ رائل جوگرفیکل سوسائٹی کے پریسیڈنٹ تھے اور نمبر ۱۶ بلگریو سکوئر میں رہتے تھے۔ اِنکے مکان کی شان و شوکت دیکھکر مجھے معلوم ہوا کہ علمی مذاق کے لوگ بھی بہت متمول ہیں۔ یہ مجھسے اسطرح

پیش آئے۔ جیسے کوئی شخص حقیقی بھائی سے پیش آتا ہے۔ اُنکی اہلیت تو
مشہور ہے۔ مگر مجھ پر خاص نوازش فرمائی۔ اور افسوس کیا کہ میں اپنے
ساتھ نقشے نہیں لایا۔ میں نے اُنکو کہدیا کہ میرے پاس اُنگلی کے برابر
ایک ٹکڑا اپنسل کا تھا۔ وہ بھی میں چھپائے پھرتا تھا۔ اور اگر وہ لوگ
مجھے لکھتا دیکھ لیتے تو ضرور مار ڈالتے لیکن وہ میری اِن تکالیف کا اندازہ کرنے
سے قاصر تھے۔ کیونکہ اُنہوں نے زار روس کی سرپرستی میں یورال کا سفر
کیا تھا۔ اور اُس وقت اُنکو تمام سامان ساتھ لیجانے کا موقع ملا تھا۔ میرے
تنہا سفر کے خطرات کا اُنکو اندازہ نہیں تھا۔ اور میں نے جب اُنسے مذکورۂ بالا
عذر کیا تو اُنہیں باور نہیں آیا۔ میں نے اشارتاً ذکر کیا کہ روسی وسط ایشیا کی
طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ سنکر وہ مسکرائے۔ اور کہنے لگے "اِس بات کا تم اعتبار
نکرو۔ روسی بہت اچھے آدمی ہیں۔ اُنکا شہنشاہ بڑا روشن ضمیر اور نیک آدمی
ہے۔ یہ ہرگز خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ برطانیہ کلاں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے" روس
کے شہنشاہ کے روشن ضمیر ہونے میں کسکو کلام تھا۔ اِس بات کا ثبوت کہ وہ
علم و فضل کا قدردان ہے۔ اِس طرح پر ہوتا تھا کہ سر راڈرک کے مکان میں
کئی خوبصورت روسی برتن شہنشاہ کا عطیہ موجود تھے۔ اور اُنکی نگاہ میں بڑی قدر
تھی۔ لیکن یہ ذاتی امور تھے۔ چنانچہ جو واقعات بعد ازاں ظہور میں آئے ہیں۔
اُنسے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سر راڈرک کی ذاتی رائے وسط ایشیا کے ملکی
معاملات میں کہانتک سلیم تھی۔ بجز اِس ایک بات کے باقی باتوں میں اُنکا میرے
ساتھ ہر طرح اتفاق تھا۔ اُنہوں نے مجھے کہا کہ تم سوسائٹی کے روبرو لکچر دو۔ اور شام
کے وقت میری پرتکلف دعوت اپنے مکان میں کی۔ اُنکا سلوک اور مروت مجھے
کبھی نہیں بھولیگا۔

تیسرا شخص جس سے میں ملا وہ وائی کونٹ سٹرینگ فورڈ تھا۔ یہ شخص بڑا انشا پردازاور مشرقی زبانوں کا ماہر تھا۔ میرا یہ خیال تھا کہ یوروپ میں میں مشرقی زبانوں کے لئے سند سمجھا جاؤں گا۔ مگر اسکو دیکھکر مجھے معلوم ہوا کہ میرا خیال غلط تھا۔ یہ وہ مہذب اور ٹھیٹھ ترکی زبان بولتا تھا۔ کہ جسکے دس لفظوں میں چھ یا آٹھ لفظ عربی یا فارسی ہوتے تھے۔ اور اگر اس کا سرکا لباس وضع کا نہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ ضرور کوئی آفندی ہے۔ یہ وسط ایشیا کی زبانوں میں بخوبی ماہر تھا۔ اسنے ایسے ایسے شعرا کے نام لئے کہ جن سے میں ناآشنا تھا۔ اسنے مجھے نوائی کے اشعار سنائے۔ اور کئی الفاظ کے معنے بتائے کہ جنکی تلاش میں میں نے ڈکشنریاں چھان ماری تھیں۔ نہ صرف مشرقی زبانیں انہیں بخوبی آتی نہیں بلکہ یوروپ کی تمام زبانوں میں بھی کامل تھے۔ وہ ہنگری کی بولی ہی نہیں جانتے تھے بلکہ یوروپ کے بیسیوں یعنے خانہ بدوشوں تک کی بولیاں بھی جانتے تھے۔ واقعی وہ ہمہ تن ایک معمہ تھے۔ مجھے ان سے کمال درجہ کی محبت ہو گئی۔ یہ بھی مجھ پر بڑے مہربان ہو گئے۔ اور بلا رشک وحسد لارڈ سٹرینگ فورڈ نے میری ملاقات ہر ایک سے کرادی۔ اور لنڈن کی سوسائٹی میں انہیں کی بدولت مجھے رسوخ حاصل ہوا۔

منجملہ ان سفارشی خطوں کے جو میں طہران سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ ایک مسٹر (جواب سر ہنری ہیں) ہنری لیرڈ کے نام اور دوسرا سرجسٹن شیل کے نام تھا۔ جواب فوت ہو گئے ہیں۔ اور کسی زمانہ میں سفیر انگلستان متعینہ طہران ہے۔ سرہنری لیرڈ ان ایام میں فارن آفس یعنے محکمہ خارجیہ کے انڈرسکرٹری تھے۔ اب سے کچھ سال پیشتر یہ خود بھی ایشیا میں سیر کر آئے تھے اس لئے مجھے اس طرح ملے جیسے لشکری لشکری سے ملتا ہے۔ ان تمام دوستوں نے

میری بڑی مدد کی اور اس موسم میں جا بجا لندن میں میرا ہی چرچا ہونے لگا۔
اللہ کی شان ضرورت اور امداد نے ایک لنگڑے مسلمان فقیر کو جو اگرچہ
پیدائشی یورپین تھا۔ لیکن کبھی مغربی یوروپ میں اوس نے قدم نہ رکھا تھا
نہ اسکی تعلیم اور قابلیت ایسی تھیں کہ اسکو وہ درجہ حاصل ہوتا۔ آخر کار دارالخلافہ
انگلستان کا شیر ببر بنا دیا۔ اور وہ شخص جو کل مسلمانوں کی خیرات پر گذارہ
کرتا تھا۔ آج بڑے بڑے اُمرا کا مورد تحسین وآفرین ہوگیا۔

اب میں اُس غیر معمولی تغیر کا بیان کرتا ہوں جو اِس طرح سے میری
زندگی میں واقع ہوا۔ جب میں انگلستان میں آیا تو پہلے میرے علمی حلقوں
میں رسائی ہوئی۔ اور پھر دوستوں کی امداد سے میں پبلک کے روبرو پیش
ہوا۔ اور پہلا لکچر جو میں نے دیا وہ رائل جیوگریفیکل سوسائٹی کے روبرو تھا۔
اُس وقت تک لکچر نہ دینے کی ایک خاص وجہ تھی۔ لنڈن آنے کے چند روز بعد
مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے بعض دوست مجھسے اگر شبہ نہیں تو احتیاط
ضرور کرتے ہیں۔ میرے دوست دراصل مجھے پبلک کے روبرو پیش کرتے ہوئے
ہچکچاتے تھے۔ میں نے ایک دن جنرل کمیتھی سے جو لنڈن سوسائٹی کا ایک
رکن تھا۔ اور میرا ہم وطن تھا پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے تو اُس نے مجھے ہنسکر کہا کہ
بھائی اصل بات یہ ہے کہ تمہارے رنگ کو اور تمہاری فارسی عربی کی گفتگو سنکر
اِن لوگوں کو شک تھا۔ اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ دراصل تم مشرق کے رہنے والے
ہو۔ اور انگریزی سیکھکر اور چند خطوط حاصل کرکے انگریزی سوسائٹی میں دخل
چاہتے ہو۔ لیکن میں نے اُنکی تسلی کردی ہے۔ کہ انکا خیال غلط ہے اور تم ہنگری
کے بیت العلوم کے ممبر ہو۔ یہ سُنکر میں متحیر ہوا کہ مشرق میں لوگ مجھے مغربی
اور مغرب میں مجھے مشرقی سمجھتے ہیں۔ زبان میں بھی عجیب تاثیر ہے۔ غرض جب

یہ رکاوٹ دور ہو گئی۔ تو میںنے پہلے لیکچر کی تیاری کی اور انگریزی زبان میں مختصر حالات اپنے سفر کے تحریر کیئے۔ اِس مضمون پر میرے دوست مسٹر لارنس (لیفٹیننٹ) نے جو اِس سوسائیٹی کا فارن سکرٹری تھا نظر ثانی کر دی اتفاق سے جس دن میرا لکچر تھا۔ اُسی دن پارلیمنٹ میں ایک بڑا ضروری امر پیش تھا۔ کہ آیا ڈنمارک کو جرمنی کے مقابلہ میں انگلستان مدد دے یا نہ دے۔ اِسلیئے امید تھی کہ بہت کم آدمی میرا لکچر سُننے آوینگے۔ میںنے لیکچر کی شام کو سر راڈرک مرچیسن اور اُسکے متعدد دوستوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ سر راڈرک نے میری صحت کا جام پیا۔ میںنے اپنے میزبان کا شکریہ مسلمانوں کے طریقہ پر ادا کیا یعنی قرآن سے اعرابیوں کی طرح ایک سورۃ پڑھی۔ اور مسلمانوں کی طرح دعا دی جس سے حاضرین بہت خوش ہوئے۔ کھانا کھا کر ہم سیدھے برلنگٹن ہاوس میں پہنچے یہاں میں نے دیکھا کہ اُمید سے کہیں بڑھ کر لوگ آئے ہوئے ہیں اِس قدر اژدہام تین وجوہات سے ہوا۔ اول تو لوگ ایک یوروپ کے باشندے کو دیکھنا چاہتے تھے۔ جو باوجود مفلس اور قلاش ہونے کے ترکستان میں دشت نوردی کرتا رہا تھا۔ دوسری یہ وجہ تھی کہ ایک غیر ملک کے باشندے کو جسکو انگلستان میں آئے چند ہی دن ہوئے تھے اُسکی انگریزی بولنا سُننا چاہتے تھے۔ اور تیسری وجہ یہ تھی کہ حال میں انگلینڈ کے دو بہادر فرزند کانولی اور سٹاڈرٹ بخارا میں جان دیچکے تھے۔ اور نیز اب سے چند سال پیشتر ریورنڈ ڈاکٹر جالف ولف بخارا تک اپنے معرکہ آرا سفر کو طے کرکے واپس آئے اِس لیئے لوگ وہاں کے حالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ مختصر یہ کہ ایک مجمع کثیر جمع تھا۔ پریسیڈنٹ صاحب نے اپنی مذاق آمیز تقریر میں جو اُنکی ہنس مکھ صورت کے شایاں تھی افتتاح جلسہ کیا۔ آوٹ سکرٹری نے بلند آواز سے

میرا مضمون حاضرین کو سنایا۔ آخر میں پریسیڈنٹ نے مجھے کہا کہ تم اپنی زبانی بھی کچھ حالات سفر کے بیان کرو۔ اُس وقت میری وہ حالت تھی جو امیر بخارا کے روبرو تھی۔ وہاں ذرا سی لغزش پر جان کا خطرہ تھا۔ یہاں جان کا خطرہ تو نہ تھا۔ مگر ہنسی کا ڈر تھا۔ جو جان کے خطرہ سے کم نہ تھا۔ غرض میں نے اپنے آپکو سنبھالا۔ اور اپنی تمام قوت ناطقہ کو جمع کرکے حاضرین کے روبرو آکھڑا ہوا۔ پہلے چند فقرے کہنے میں دقت معلوم ہوئی۔ اور پھر فصاحت کا دریا بہنے لگا۔ کچھ نہ پوچھیے کہ اِس پون گھنٹہ میں میں نے شیکسپیئر اور ملٹن کے کسقدر فقرے جو مجھے یاد تھے استعمال کیے۔ میں نے اپنے سفر کا حال سمرقند سے آگے تک کا بیان کیا۔ اور انگریزی کی خوب ہی ٹانگ توڑی۔ مگر مہربان حاضرین نے میری تقریر کو بہت پسند کیا۔ اور کئی بار تالیاں بجائیں۔ آخر میں سر راڈرک نے مجھے کہا کہ اِن حاضرین کو اسلامی طرز پر دعائے خیر دو۔ غرض جو وقت میں نے عربی زبان میں قرآن کی سورۃ پڑھکر دعا دی تو تمام حاضرین کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ پڑ گئے۔ جب یہ سب کارروائی ہوچکی تو مبارکبادیوں کا تانتا لگ گیا۔ اور لوگ آگے بڑھ بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کرنے لگے۔ لارڈ سٹرینگفورڈ نے مجھے آگے بڑھ کر کہا کہ "درویش شاباش" یہ الفاظ تمام جہان کے راگوں سے بڑھکر دلکش تھے۔ مجھے تمام دنیا کی باتیں بھول جائیں مگر یہ الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجا کرینگے۔

اِس دن سے گویا میرے لنڈن کے کارناموں کی ابتدا ہوئی دوسرے دن کے اخبارات میں میری انگریزی دانی کی نسبت استہزاً لکھا ہوا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل زبان نہیں ہے۔ اِسکے علاوہ میری اِس قدر تعریف تھی کہ چند ہفتوں میں تمام برطانیہ کلاں میں

مشہور ہو گیا- مجھے ہر روز دعوتوں کے پیغام آنے لگے- بیس بیس تیس تیس خط ہر روز مجھے لکھنے پڑتے تھے- جن میں یا تو مجھے قبول دعوت سے انکار کرنا پڑتا تھا یا دعوت قبول کرنی پڑتی تھی- میں یا تو گریٹ پورٹلینڈ سٹریٹ میں یا اتھینئم کلب میں رہتا تھا- اور ہر وقت میرے دروازے پر بھیڑ لگی رہتی تھی- بڑے بڑے امرا سے لیکر معمولی حیثیت تک کے آدمی میرے دوستوں سے کارڈ لیکر مجھے ملنے آتے تھے- مجھ سے میری تصویر کی یا اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کی فرمائشیں ہوتی تھیں- میں اس قدر قدردانی دیکھکر مثل آئینہ حیران رہگیا- میں نے اتنی شہرت کے بار کو اول اول تو صبر اور طمانیت کے ساتھ اُٹھایا- لیکن اخیر میں لوگوں کے بکثرت آنے سے میں دق ہو گیا- وجہ اسکی یہ تھی کہ میں اپنا سفرنامہ لکھنے میں مشغول تھا- میں نے یہ سرگذشت کاغذوں کے پُرزوں پر پنسل سے لکھی ہوئی تھی- اور پنسل کا لکھا کئی جگہ سے مٹ گیا تھا- اس لیئے مجھے اسکے دوبارہ لکھنے میں بڑی محنت کرنی پڑتی تھی- اور لوگ میرا وقت ضایع کرتے تھے- مجھے اس کتاب کے لکھنے میں جس کا نام مینے وسط ایشیا کا سفر رکھا- بہت تکلیف ہوئی- شکر ہے کہ میرا ذہن اچھا تھا- ورنہ اس کتاب کا لکھا جانا محال تھا- پھر بھی میں مہینے بھر میں اس کتاب کے پروف کی تصحیح سے میں فارغ ہو گیا- جن لوگوں نے سالہا سال کھلے میدانوں میں سفر کیا ہے وہی اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایک کمرہ میں بیٹھکر جہاں کہ سوائے ایک قطعہ آسمان کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا اور ہر روز گھنٹوں وقت لکھنے میں صرف ہوتا تھا مجھ جیسے سیاح کو کیسی تکلیف ہوتی ہوگی-

لارڈ سٹرینگفورڈ کے زمانے سے مسٹر جان مرے کو مینے یہ کتاب

پچھنے کے لیئے دی۔ اُنہوں نے بھی مجھ سے بُرا سلوک نہ کیا اور پانسو پونڈ مجھے اِس کتاب کا معاوضہ دیئے۔ اِس رقم سے مینے اڑھائی سو پونڈ لنڈن میں ہی صرف کر دیئے۔ میری مالی حالت میں بہت کم تبدیلی ہوئی۔ ایشیا میں بھی میں درویش تھا۔ اور یوروپ میں بھی میں فقیر ہی رہا۔ لیکن اِس کتاب کی بدولت مجھے روپئے سے زیادہ اَور چیز بھی حاصل ہوئی۔ یعنے انگلستان کے باشندے میرے ممنون ہوئے۔ اور میری شہرت یوروپ اَور امریکہ کے براعظموں میں پھیل گئی۔

چند دوستوں کی فرمایش سے مینے مُدبّران مُلک کی خاطر اِس کتاب کے اخیر میں چند امور **انگلینڈ** اور **روس** کے مشرقی تعلقات کے متعلق بھی لکھ دیئے۔ میں نے چند امور بطرز اشارہ لکھے تھے۔ لیکن اِنسے بھی بہت دلچسپی ظاہر کیگئی۔

اِس مضمون کے ذریعہ سے میری ملاقات بڑے بڑے مُدبّران مُلک اور ہندوستان کے پنشن یافتہ مُلکی اور فوجی افسران سے ہوگئی۔ اور ایک موقعہ پر میں **لارڈ پامرسٹن** کیخدمت میں بھی شرف شرف اندوز ہوا۔ اُنسے ایک دعوت میں میری سرسری ملاقات سر رآڈرک **مرچیسن** کے مکان میں ہو چکی تھی۔ لیکن یہ ملاقات مجھے لارڈ موصوف کے مکان واقعہ پکاڈلی میں نصیب ہوئی۔ اور پرائیویٹ ملاقات تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر **لونگسٹون** سے ہنگام ملاقات لارڈ موصوف نے کہا تھا۔ کہ **تم نے افریقہ میں خوب سیر کی**۔ مجھ سے اُنہوں نے نہیں کہا تھا۔ بلکہ جس وقت ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے۔ کہ "بخارا اور سمرقند کی راہ میں تم نے عجیب مُہمات طے کیں۔ امیر دوست محمد کی نسبت

اور امیر بخارا کے غرور کی نسبت اور اس مقام میں جو آفات مجھے پیش آئیں اونکی نسبت جو کچھ مینے کہا وہ لارڈ موصوف نے بغور سُنا۔ اور جب روسیوں کا تاشقند کی طرف پیشقدمی کا ذکر آیا۔ تو لارڈ موصوف نے یا تو درحقیقت بے پرواہی ظاہر کی یا بہانہ کرکے بے پرواہ ہوگئے یعنی اپنی کتاب کا نقشہ کھولکر مقام چمکنت دکھایا۔ اور کہا کہ روسی اس وقت یہاں ہیں۔ لارڈ موصوف جب کبھی دیکھتے تھے کہ مین نے اُنکو روسی پیشقدمی کی طرف متوجہ کیا ہے تو جھٹ گفتگو کے مضمون کو بدل ڈالتے تھے۔ اور اِس قسم کے سوال کر دیتے تھے "اچھا تم نے کسطرح اِتنی مدت اپنے آپکو ظاہر نہ ہونے دیا؟ تم نے یہ طول طویل زحمت کس طرح اُٹھائی" وغیرہ وغیرہ جب میں نے لارڈ موصوف کو بار بار متوجہ کیا۔ تو اُنہوں نے بادل ناخواستہ چند فقرے وسط ایشیا کے متعلق کہے۔ اور یہ ظاہر کیا کہ انکو اِس معاملہ کی کچھ پرواہ نہیں۔ مگر مجھے یقین نہ آیا کہ واقعی وہ بے پرواہ ہیں اِسکے بعد جب ۱۸۶۸ء کے موسم سرما میں مجھے لارڈ کلیرنڈن سے ملنا ہوا تو میں اُنکو اُور مزاج کا انسان پایا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب روسی تاشقند لے چکے تھے اور پرنس گورچکاف کے مشہور نوٹ سے ہر شخص واقف ہو گیا تھا۔ اُس وقت انگریز خوابِ غفلت سے جاگے تھے۔ لارڈ کلیرنڈن نے تسلیم کیا کہ جو کچھ تم نے اُس کتاب کے اخیر باب میں لکھا ہے وہ بالکل درست ہے۔ لیکن آجکل جو اصول انگلستان میں مد نظر ہے وہ یہ ہے کہ "روس کی پالیسی وسط ایشیا میں وہی پالیسی ہے جو ہماری ہندوستان میں ہے جسطرح ہمیں مجبوراً جنوب سے شمال کی طرف بڑہنا پڑا ہے۔ روسیوں کو شمال سے جنوب کیطرف مجبوراً قدم اُٹھانا پڑتا ہے۔ روس اِن وحشی علاقوں میں تہذیب پہیلا رہا ہے اور اگر وہ بخارا بھی لے لے تو ہمیں پرواہ نہیں ہے"

فصلِ سی و دوم

پیرس میں

جب لنڈن کی دعوتیں کھاتے کھاتے میں تھک گیا تو میں نے اُس عالیشان گمروق کر دینے والی انگریزی مہمان نوازی سے مخلصی چاہنے کی کوشش کی اور میں پیرس میں فرنچ سوسائٹی کی سیر دیکھنے گیا۔ جب میں انگلستان میں تھا تو میرے ایک دوست نے بطور مذاق مجھ سے کہا تھا کہ تم اس موسم کے بہترین انگلینڈ کی سوسائٹی نے تمہارا خوب شکار کیا۔ جب میں فرانس میں جانے لگا تو کونٹ بیچ برگ نے جو آسٹریا کا وزیر خارجیہ تھا۔ مجھے ایک خط پرنس مسٹرنچ کے نام لکھدیا۔ جو دربار فرانس میں بڑا معزز شخص تھا۔ کونٹ راچی چوارٹ نے بھی جو فرانسیسی سفیر متعینہ طہران تھا اِسی مضمون کا ایک خط کونٹ دردن ڈی لاہوز کے نام دیا تھا جو وزیر محکمہ خارجہ تھے۔ اِن خطوط کے علاوہ میرے انگلستان کے دوستوں نے ایم گینیرو اور ایم ڈی تھایرز اور ایم۔ جولیئس مہل جیسے مشہور علمائے عصر کے نام بھی خطوط دئیے۔ یہ سب لوگ مجھ سے مہربانی سے پیش آئے گو پہلی ہی ملاقات میں مجھے ثابت ہو گیا کہ لنڈن میں مجھے اور نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور پیرس میں کچھ اور نگاہوں سے۔ انگلستان میں سیاح کو جس نے معلومات کو

نہیں تھے۔ گو میرا عقیدہ ہے کہ وہ تھی لیکن ثبوت نہیں ملتا۔ ترکمانوں کے ذکر کے بعد
ہم بلخ کے سالات پر گفتگو کرتے رہے۔ اور میں نے معلوم کیا کہ شاہنشاہ کو آرین
اور اہل روما کی قدیم کتابوں کا کما حقہٗ علم ہے۔ لیکن ایشیا کی سرزمین کے موجودہ
حالات سے وہ ناواقف تھے۔ اُنکو ایشیا کے بڑے بڑے شہروں اور دریاؤں
کے نام بہت کم یاد تھے اور وہ اثنائے گفتگو میں اپنی لاعلمی کے چھپانے کی
کوشش کرتے تھے۔ پھر جب وسط ایشیا میں انگریزوں اور روس کے تعلقات
کا ذکر آیا تو اول تو شہنشاہ نے اس معاملے میں اپنی دلچسپی ظاہر کرنے سے گریز
کی لیکن پھر غور سے میری بات کو سنا اور کہا کہ امید نہیں کہ جلد ہی انگلستان
اور روس میں اس جگہ مٹ بھیڑ ہو۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے ظاہر ہے کہ
ہندوستان میں انگریزوں کے پاؤں بہت اچھے جم گئے ہیں اور روس
کی ابھی ابتدا ہے۔ اس معاملہ میں اگرچہ نپولین نے پہلے بے پرواہی ظاہر کرنی
چاہی۔ مگر پھر اسکو غور سے سنا۔ اس گفتگو کے پیرائے میں اُنہوں نے مجھ سے کئی
سوال ایران اور ہرات کی بابت کئے۔ اور جب میں نے یہ عرض کیا کہ ایرانی اُنکے چچا
نپولین اول کو قومی شجاع اور رستم کی نسل سے سمجھتے ہیں اور فرانسیسیوں کے
اُسکو اپنا اہل وطن کہنے پر ہنستے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے میں شہنشاہ سے
نصف گھنٹے تک گفتگو کرتا رہا۔ افسوس ہے کہ مجھے وہ اس قدر عالیدماغ آدمی
ثابت نہ ہوئے۔ جسقدر وہ تمام دنیا میں مشہور تھے۔

چند روز بعد میں فرانس کے وزیر محکمہ خارجیہ کو ملا۔ اُس نے روس اور انگلستان
کے معاملہ میں بہت سی دلچسپی ظاہر کی۔ اور کہا کہ کیا سچ ہے کہ تم نے لارڈ پامرسٹن
کو اس بارہ میں چند نوٹ دیئے ہیں میں نے کہا ہرگز نہیں۔ اور نہ مجھے برٹش گورنمنٹ
نے ایسی درخواست کی ہے۔ بلکہ انگریزوں کے خیالات اس معاملہ میں میرے

خیالات سے مخالف ہیں۔

سرکاری طور پر صرف یہ دو ملاقاتیں ہوئیں پھر اپنے طور پر نپولین نے مجھے شاہی محل میں مدعو کیا۔ اور ایسے مقام پر بٹھایا جہاں اُسکے چچا کی قدآدم تصویر لگی ہوئی تھی۔ نپولین بار بار میری طرف دیکھتا تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا میں نے اِسمیں اور اُسکے چچا کی تصویر میں کچھ مطابقت اور مشابہت پائی ہے۔ واقعی یہ شخص بالکل نپولین اول سے مشابہ تھا۔ دونوں کے سر یکساں تھے۔ مگر یہ مشابہت نری ظاہری مشابہت تھی۔ درحقیقت دونوں میں بہت فرق تھا۔ یہ ملاقاتیں میرے مرغوب خاطر نہ تھیں۔ خصوصاً کئی لوگ جو مجھے ملنے آتے تھے وہ میری اور اپنی ملاقات کی غلط کیفیت اخباروں میں چھاپ دیتے تھے جنکی مجھے تکذیب کرنی پڑتی تھی۔ اِن رپورٹروں میں سے ایک نے ایک دفعہ یہ چھاپ دیا کہ لارڈ پامرسٹن نے مجھے مخفی طور پر تاتاریوں کی طرف بھیجا تھا۔ ایک مُصنّف نے جو اگر میں غلطی نہیں کرتا۔ تو ایک شہزادہ پولنڈ کا تھا۔ میرے متعلق ایک ناول لکھدیا۔ اُسمیں اُس نے ایک تاتاری شہزادی کو مجھ پر عاشق کر دیا جس سے میری شادی ہوگئی۔ اور اِس ذریعے سے میں وسطی ایشیا کے کسی مُلک کا تخت و تاج حاصل کر کے اِس لئے یورپ میں آیا کہ انگلینڈ اور فرانس میں رابطہ اتحاد پیدا کر کے روس کے برخلاف اُنکو اُبھاروں۔ میں یہ ناول پڑھکر خوب ہنسا پھر میں فرانس سے براہ جرمنی اپنے وطن کو روانہ ہوا۔ یہاں جاکر میرا ارادہ تھا کہ فیصلہ کرونگا کہ آئندہ مجھے وطن میں کچھ کاروبار کرنا چاہیئے یا پھر وسط ایشیا میں سیر و سیاحت کر لی چاہیئے۔

فصل سی و سوم

ہنگری میں

مجھ سے دوست اکثر پوچھتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے کہ ایشیا اور یورپ میں اس قدر جدوجہد کے بعد تم نے چپ چاپ ہنگری میں گوشہ عزلت اختیار کیا اور اس قدر غیر معمولی کوشش کے بعد بوڈاپسٹ کی یونیورسٹی میں علوم مشرقی کی پروفیسری پر قناعت کی۔ جب میں پہلی مرتبہ آسٹریا اور ہنگری کے شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنہوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارا ارادہ اس ملک میں رہنے کا ہے۔ اگر ہے تو میں تمہارے لیئے کیا کرسکتا ہوں۔ جب میں نے عرض کی کہ میں ہنگری کی یونیورسٹی کی پروفیسری چاہتا ہوں تو اُنہوں نے فرمایا کہ یہ علوم جب وائنا میں بہت کم پڑھے جاتے ہیں تو بوڈاپسٹ میں تم کو بہت سے شاگرد کہاں سے ملجاویں گے۔ میں نے عرض کی کہ اگر اور کوئی نہ پڑھیگا تو میں خود پڑھوں گا۔ جہاں پناہ میرا مطلب سمجھ گئے اور فرمانے لگے کہ جو تکلیفیں تم نے اُٹھائی ہیں اُنکا معاوضہ کچھہ ہونا چاہیئے۔ میں اس معاملہ میں غور کرونگا۔ دو تین ماہ نہیں گذرنے پائے تھے کہ میں ہنگری کی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا اور میری تنخواہ ایک سو پونڈ سالانہ ہوئی۔ مگر بہت جلد ہنگری کے وزیر رشتہ تعلیم نے میری تنخواہ دو سو پونڈ سالانہ کردی۔ یہ تنخواہ اور وہ آمدنی جو مجھے کتاب

کی فروخت سے ہوتی ہے۔ میرے اخراجات کے لیئے کافی ہے۔ بلکہ اتنی ہے کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں تو وہ کہنے لگے کہ پرلے درجہ کی نالایقی ہے۔ اور جو لڑکی اُس سے شادی کرے گی وہ قابل رحم ہوگی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ میں جلد بیوی اور گھر بار کو چھوڑ کر پھر وسط ایشیا کی جنگلوں میں دشت نوردی کرونگا۔ یہ لوگوں کا خیال خام تھا۔ نہ تو میں فطرتاً مہموں کی تلاش میں سرگردان ہونے کی خواہش رکھتا تھا۔ اور نہ وہ تحسین اور آفرین جو مجھے دنیا نے دی پھر مجھے سیر و سیاحت کے لیئے آمادہ کر سکتی تھی۔ جب میں یوروپ میں واپس آیا تو میری عمر ۳۲ سال کی تھی۔ اِس سفر سے کیقدر میری صحت خراب ہوگئی تھی۔ مگر ایک سال کے آرام کے بعد میں پھر چاق و چوبند ہوگیا۔ میں نے بیس سال پیٹ بھر کر آوارہ گردی کر لی تھی۔ اَب میری بھی خواہش اور دعا ہے کا اپنا مکان ہو اپنا سامان ہو اَور اپنا کتب خانہ ہو مجھے اِس بات کا ناز ہے کہ مینے اپنے سفر کا حال لکھا ہے جو گو چند ہی آدمیوں کو دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ مگر اسمیں بہت سی مفید باتیں ہیں۔ میں اَب اِس مثل کے ساتھ اپنی کتاب کو ختم کرتا ہوں"

"اِس کانٹوں والے راستے میں یعنے دنیا میں جو تکلیفیں مینے اُٹھائی ہیں اُنکا مجھے مطلق افسوس نہیں ہے۔ اور جب میری زندگی کا آفتاب غروب ہونے لگا یعنے ہنگام نزع ہوا تو میں یہی کہے جاؤں گا کہ گو میری زندگی کا دن گرم یعنے مصیبتوں سے پُر تھا لیکن بہت پُر لطف یعنی مفید تھا۔

تمام شد